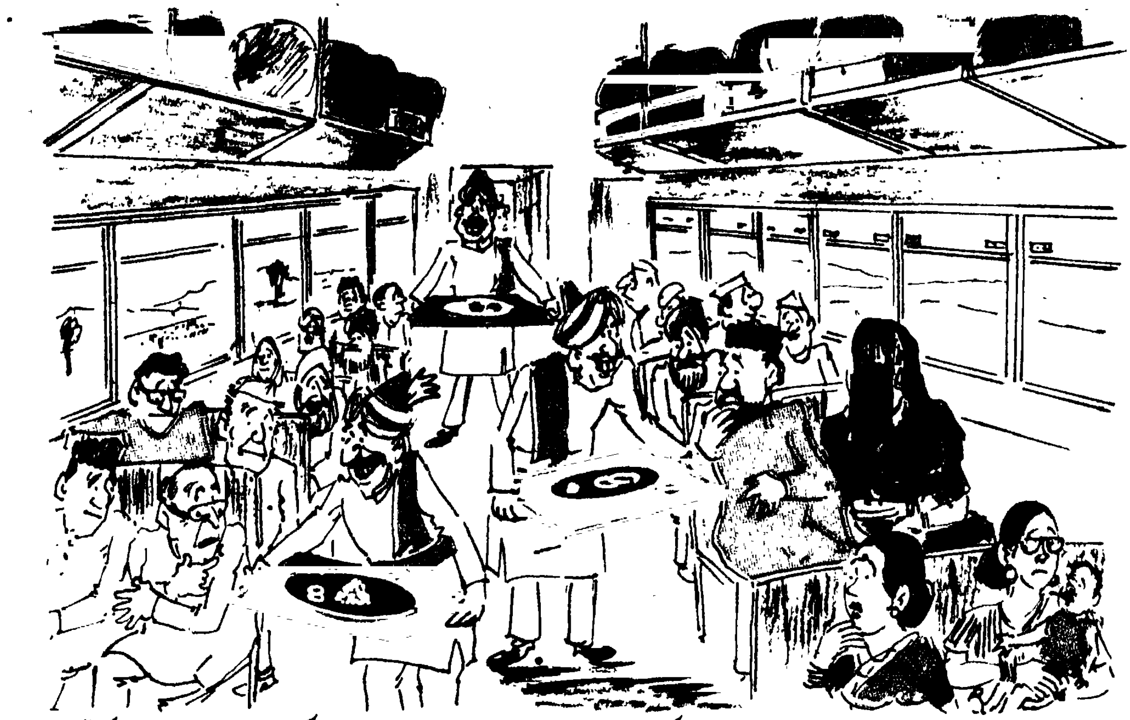


"ٹرینوں میں جنتا کھانا فراہم کیا جائے گا"

"ٹرینوں میں سیکنڈ کلاس کے مسافروں کو مزید سہولتیں فراہم کی جائیں گی" وزیر ریلوے ——— ایک سہولت یہ بھی ہو کہ سیکنڈ کلاس کے ڈبوں کو انجن کے بالکل پیچھے لگایا جائے تاکہ سیکنڈ کلاس کے مسافر منزلِ مقصود پر ذرا جلدی پہونچ سکیں۔

"ٹرینوں میں جنتا کھانا فراہم کیا جائے گا" ایک خبر ——— تاکہ آدمی کو سفر کی مشکلات کا اندازہ ہو سکے۔

"چارلی چیپلن کی نعش جس تابوت میں رکھی ہوئی تھی وہ تابوت غائب ہو گیا" ——— ایک خبر ——— چارلی چیپلن مرنے کے بعد بھی لوگوں کی "تفریحِ طبع" کا سامان فراہم کر رہے ہیں۔

"دہلی میونسپل کارپوریشن میں ایک درجن سے زیادہ چپراسی ایسے ہیں جو بی۔اے یا ایم۔اے کامیاب ہیں" ایک خبر ——— جبھی تو کارپوریشن کے چپراسی ہم جیسوں سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔

"ہریجنوں پر مظالم ملک کا پرانا مسئلہ ہے" مسٹر کرپوری ٹھاکر ——— جسے باقی اور برقرار رکھنا ہم سب کا مقدّس فرض ہے۔

"اندرا کانگریس سوشلزم اور سیکولرازم کے راستہ پر چل رہی ہے" ایک سرخی ——— سوشلزم اور سیکولرازم کے راستہ پر ہمارے ملک میں اتنی پارٹیاں چل رہی ہیں کہ اب یہ مسئلہ "سیاست" کا نہیں "ٹریفک" کا بن گیا ہے۔

"جنتا پارٹی اپنے انتخابی وعدوں کو پورا کرے گی" مسٹر چندر شیکھر ——— بشرطیکہ اُسے یہ وعدے یاد دلائے جائیں۔

"ادیبوں کی تحریروں پر پابندی عائد نہیں کی جانی چاہیے" ڈاکٹر پرتاپ چندر ——— کیونکہ پابندی عائد ہوتے ہی لوگ اُس ادیب کی تحریریں پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہمارے بہت سے ادیب اپنی تحریروں کی وجہ سے نہیں بلکہ پابندیوں کی وجہ سے مشہور ہوتے۔

"جنتا حکومت انگریزی کی مخالف نہیں ہے" سر چارلس ٹرفٹن
——— وہ تو صرف بیرونی زبانوں کی مخالف ہے جیسے اُردو۔

"پولیس والے عوام کے دوست ہیں" مسٹر مرارجی ڈیسائی
——— جبھی تو پولیس والوں کو دیکھتے ہی شرفا کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔

"اُردو صد فی صد ہندوستانی زبان ہے" ڈاکٹر چنا ریڈی ——— یہ اور بات ہے کہ اُردو کے تعلق سے اس قسم کا خیال رکھنے والوں کی تعداد ایک فی صد بھی نہیں ہے۔

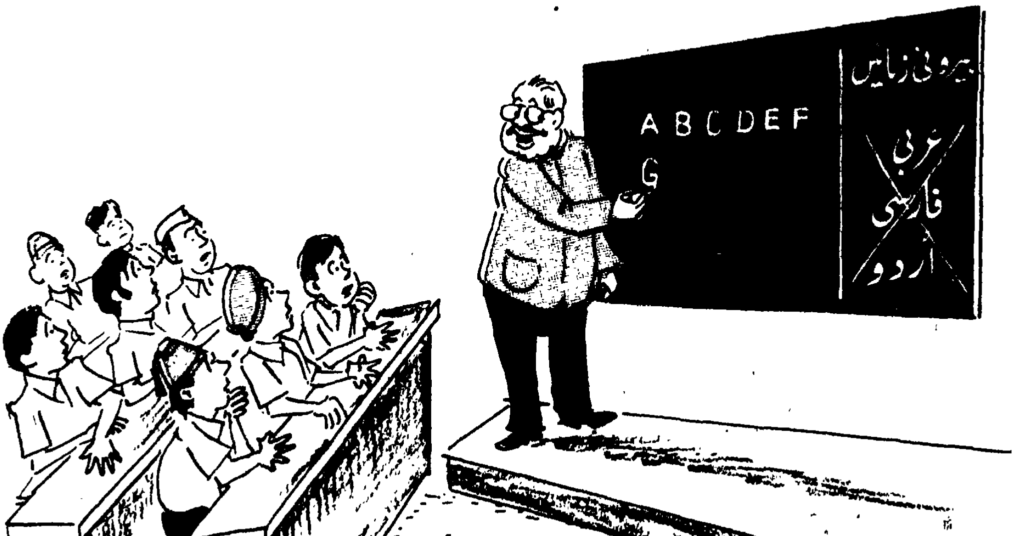
"مرکزی بجٹ سے گرانی میں مزید اضافہ ہوگا" ایک سُرخی
——— یہی تو کسی بجٹ کی خوبی ہوتی ہے۔

"مسٹر راج نارائن کی سرگرمیوں سے جنتا پارٹی کا وقار متاثر ہو رہا ہے" ایک بیان ——— اچھا تو اب جنتا پارٹی کے پاس بھی "وقار" آگیا ہے۔

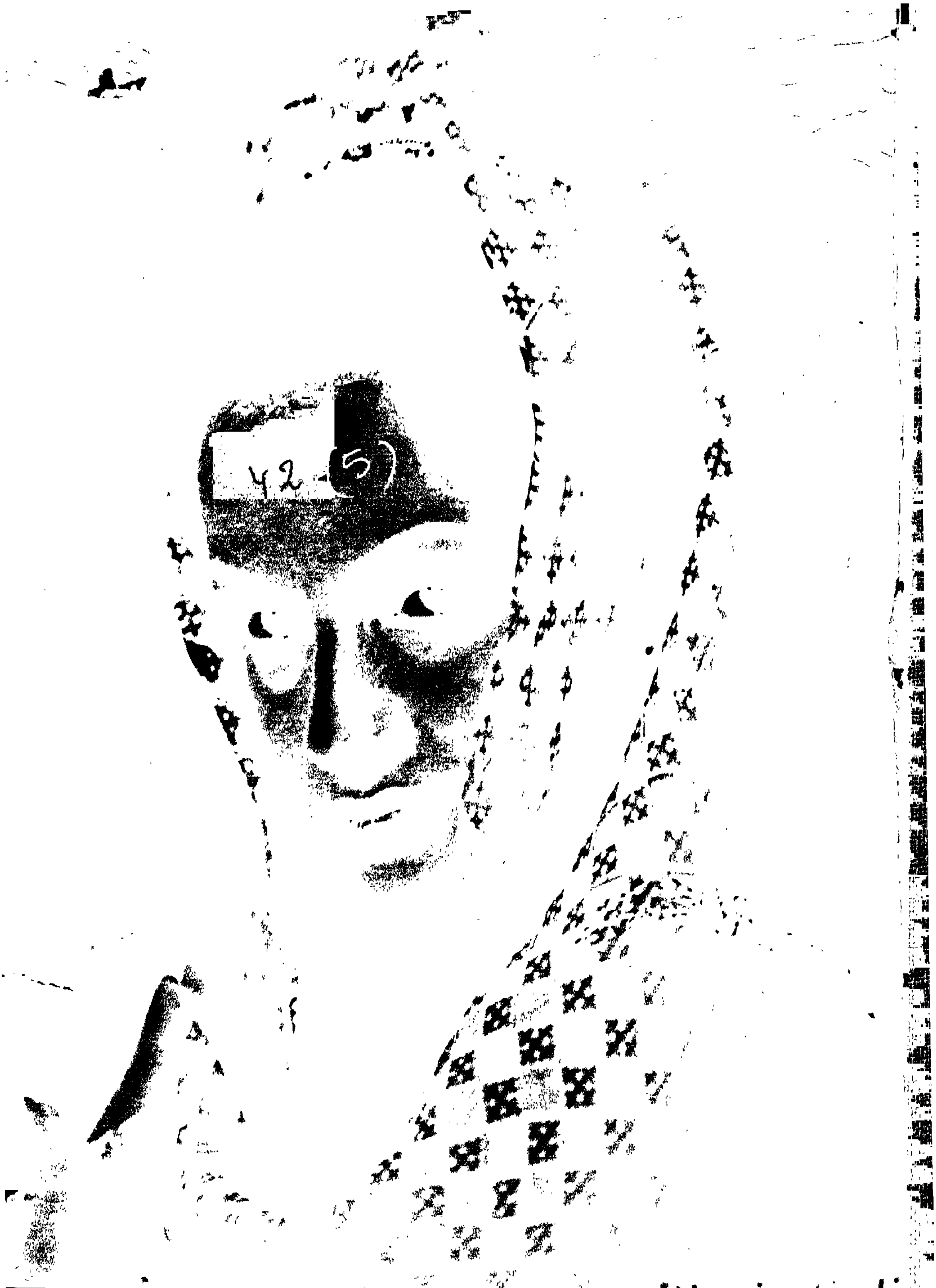
"نیا بجٹ جرأت مندانہ ہے" ایک بیان ——— جس میں بڑی جرأت کے ساتھ عام آدمی کو نظر انداز کیا گیا ہے۔

"جنوبی ہند میں جنتا پارٹی کی ناکامی کا ذمہ دار کون ہے" ——— ایک عنوان ——— رائے دہندگان۔ اتنی آسان سی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔

"سرکاری ملازمین کے گرانی الاؤنس میں اضافہ" ایک خبر۔
——— لہٰذا تاجر حضرات پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ اشیا کی گرانی میں اضافہ فرمائیں۔



"جنتا حکومت انگریزی کی مخالف نہیں ہے" ——— سر چارلس ٹرفٹن۔



Rs 3

Biswin Sadi



انداز میں شوخی بھی آنکھوں میں شرارت بھی
دیکھے جو تجھے، دل میں شرمائے قیامت بھی

مدیر: خوشتر گرامی

ایڈیٹر: رحمٰن نیر

مئی ۱۹۷۸ء

بیسویں صدی

نئی دہلی

فون آفس: ۷۱۶۳۷ ، ۲۷۵۹۲۷ ، ۲۷۲۰۸۹ ، ۲۷۰۵۲۹ ، رہائش: ۲۰۲۰۷۰



جلد ———— ۴۲ شمارہ ———— ۵

قیمت ———— تین روپے

غیر ممالک میں بذریعہ رجسٹرڈ ہوائی ڈاک

- ابوظہبی۔ افغانستان۔ دوبئی۔ مسقط۔ قطر۔ شارجہ ۔ ‎-/۱۲۰ روپے
- برما۔ ایران۔ عراق۔ سعودی عرب۔ اردن۔ کویت
- لبنان۔ لنکا۔ شام۔ شمالی و جنوبی یمن ۔ ‎-/۱۳۵ روپے
- ترکی۔ سوڈان۔ تنزانیہ۔ یوگنڈہ۔ افریقہ۔
- لیبیا۔ ملاوی۔ مصر ———— ‎-/۱۴۰ روپے
- انگلینڈ۔ جرمنی۔ چین۔ جاپان۔ ملائشیا۔ آسٹریا۔
- بلغاریہ۔ انڈونیشیا۔ ہانگ کانگ۔ ہالینڈ۔ چیکوسلواکیہ
- فرانس۔ سویڈن۔ سپین۔ مالٹا۔ ہنگری۔ ناروے
- پولینڈ۔ ڈنمارک۔ کینیڈا۔ امریکہ ‎-/۲۰۰ روپے
- تمام غیر ممالک میں رجسٹرڈ سمندری ڈاک سے سالانہ ‎-/۱۰۵ روپے

غیر ممالک سے زر سالانہ یا کتابوں کی قیمت بذریعہ بینک ڈرافٹ اس پتہ پر بھیجیں :-

بیسویں صدی ایکسپورٹرس۔ دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

سالانہ قیمت مع خاص نمبر ہندوستان میں ———— تینتیس روپے

غیر ممالک میں ہوائی ڈاک سے ———— چھ پونڈ

خط وکتابت اور ترسیل زر کا پتہ

بیسویں صدی

پوسٹ بکس ۷۰۱۳

دریا گنج ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

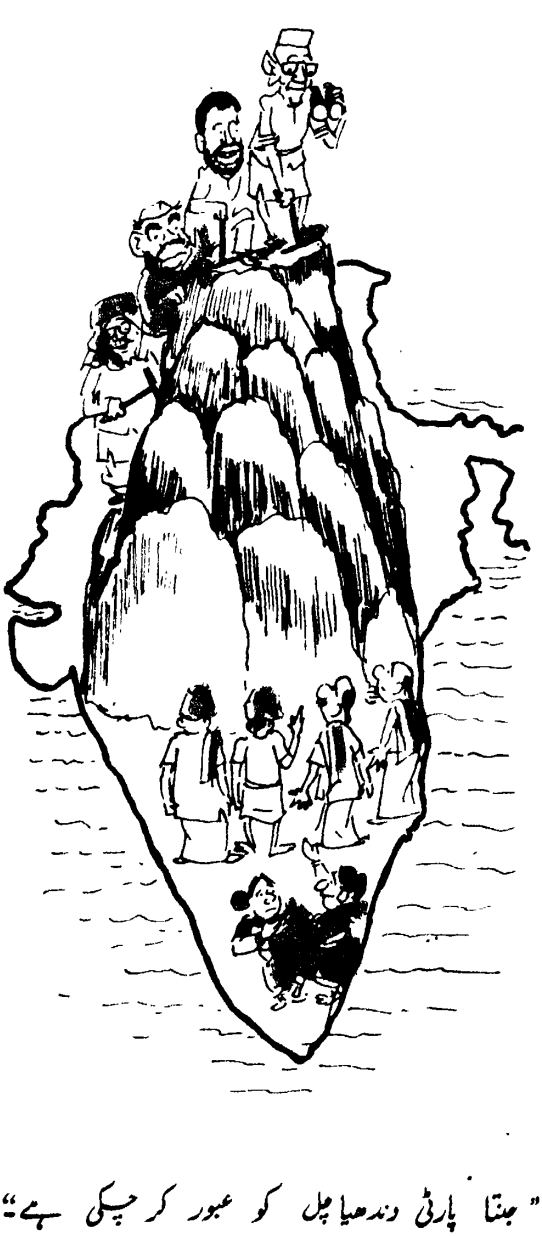
پاکستانی اہلِ قلم سے گزارش

ہند اور پاک کی مملکتوں میں خوش گوار تعلقات کے جس نئے دور کا آغاز ہو رہا ہے اس کا تقاضہ ہے کہ دونوں ملکوں میں ثقافتی میل جول فروغ پائے۔ اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ آپ اپنی گراں بہا نگارشات "بیسویں صدی" کو عنایت فرمائیں "بیسویں صدی" ہندوستان کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ادبی رسالہ ہے اور آپ کے احساسات کو کروڑوں اُردو داں عوام تک پہنچانے کا مؤثر ترین ذریعہ ——— مجھے اُمید ہے کہ آپ میری اس دوستانہ گزارش پر لبیک کہیں گے اور "بیسویں صدی" کو اپنی تخلیقات سے نوازیں گے ——— ایڈیٹر

"بیسویں صدی" میں اشاعت کے لیے اپنی تخلیقات پاکستان میں "بیسویں صدی" کے اعزازی نمائندے جناب مقبول احمد دہلوی کو بھیجیں تاکہ آپ کی تخلیقات بروقت اور باسانی ہم تک پہنچ سکیں۔ اُن کا پتہ یہ ہے:

مقبول احمد دہلوی ۱۲/۱۰ انسبت روڈ۔ لاہور ،   فون : ۵۶۳۳۲

تیر و نشتر



"جنتا پارٹی وندھیاچل کو عبور کر چکی ہے"

"دہلی میں اگلی مردم شماری تک کوئی بھی جاہل اور ان پڑھ آدمی نہیں رہے گا" کیدار ناتھ ساہنی ——— کیا سارے جاہل اگلی مردم شماری تک مر جائیں گے۔

"حکومت کی نئی برآمدی پالیسی زیرِ ترتیب ہے" مسٹر عارف بیگ، وزیرِ تجارت ——— اچھا تو اب اپنی برآمدی پالیسی یہیں بن رہی ہے۔ کسی زمانے میں اپنی برآمدی پالیسی بھی "درآمد" کی جاتی تھی۔

"مدھیہ پردیش میں مارچ سے نومبر ۱۹۷۷ء کے عرصہ میں ۱۰۵ ہریجنوں کا قتل کیا گیا" ایک عنوان ——— گویا ہریجنوں کے قتل کی سنچری بن گئی۔

"جنتا پارٹی وندھیاچل کو عبور کر چکی ہے" ایک خبر ——— جنتا پارٹی اب کام کم کر رہی ہے اور "کوہ پیمائی" زیادہ کر رہی ہے۔

"جنتا پارٹی سرمایہ داروں کی ہمت افزائی کر رہی ہے" ——— مسز اندرا گاندھی ——— سرمایہ دار تو ہر پارٹی سے اپنی ہمت افزائی کروانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

"لکھنؤ یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے انتخابات پرامن رہے" ایک خبر ——— نوجوانو! آخر تمھاری شجاعت اور دلیری کو کیا ہوگیا۔ ؏ حیف شاہیں رائیتہ پینے لگا۔

"اتر پردیش کے وزیر فینانس نے تاجروں کو وارننگ دی ہے" ایک خبر ——— اس وارننگ کا نمبر کونسا ہے۔



"ٹرینوں میں جنتا کھانا فراہم کیا جائے گا"

"ٹرینوں میں سیکنڈ کلاس کے مسافروں کو مزید سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔" وزیر ریلوے ——— ایک سہولت یہ بھی ہو کہ سیکنڈ کلاس کے ڈبوں کو انجن کے بالکل پیچھے لگایا جائے تاکہ سیکنڈ کلاس کے مسافر منزلِ مقصود پر ذرا جلدی پہونچ سکیں۔

"ٹرینوں میں جنتا کھانا فراہم کیا جائے گا" ایک خبر ——— تاکہ آدمی کو سفر کی مشکلات کا اندازہ ہو سکے۔

"چارلی چیپلن کی نعش جس تابوت میں رکھی ہوئی تھی وہ تابوت غائب ہو گیا" ——— ایک خبر ——— چارلی چیپلن مرنے کے بعد بھی لوگوں کی "تفریحِ طبع" کا سامان فراہم کر رہے ہیں۔

"دہلی میونسپل کارپوریشن میں ایک درجن سے زیادہ چپراسی ایسے ہیں جو بی اے یا ایم اے کامیاب ہیں" ایک خبر ——— جبھی تو کارپوریشن کے چپراسی ہم جیسوں سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔

"ہریجنوں پر مظالم ملک کا پرانا مسئلہ ہے۔" مسٹر کرپوری ٹھاکر ——— جسے باقی اور برقرار رکھنا ہم سب کا مقدس فرض ہے۔

"اندرا کانگریس سوشلزم اور سیکولرازم کے راستہ پر چل رہی ہے" ایک سرخی ——— سوشلزم اور سیکولرازم کے راستہ پر ہمارے ملک میں اتنی پارٹیاں چل رہی ہیں کہ اب یہ مسئلہ "سیاست" کا نہیں "ٹریفک" کا بن گیا ہے۔

"جنتا پارٹی اپنے انتخابی وعدوں کو پورا کرے گی" مسٹر چندر شیکھر ——— بشرطیکہ اُسے یہ وعدے یاد دلائے جائیں۔

"ادیبوں کی تحریروں پر پابندی عائد نہیں کی جانی چاہیے" ڈاکٹر پرتاپ چندر ——— کیونکہ پابندی عائد ہوتے ہی لوگ اُس ادیب کی تحریریں پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہمارے بہت سے ادیب اپنی تحریروں کی وجہ سے نہیں بلکہ پابندیوں کی وجہ سے مشہور ہوتے۔

"جنتا حکومت انگریزی کی مخالف نہیں ہے" سر چارلس ٹرفٹن
——— وہ تو صرف بیرونی زبانوں کی مخالف ہے جیسے ———
اُردو۔

"پولیس والے عوام کے دوست ہیں" مسٹر مرارجی ڈیسائی
——— جبھی تو پولیس والوں کو دیکھتے ہی شرفا کے ہاتھ پاؤں
پھول جاتے ہیں۔

"اُردو صد فی صد ہندوستانی زبان ہے" ڈاکٹر
چنّا ریڈی ——— یہ اور بات ہے کہ اُردو کے تعلق سے اس
قسم کا خیال رکھنے والوں کی تعداد ایک فی صد بھی نہیں ہے۔

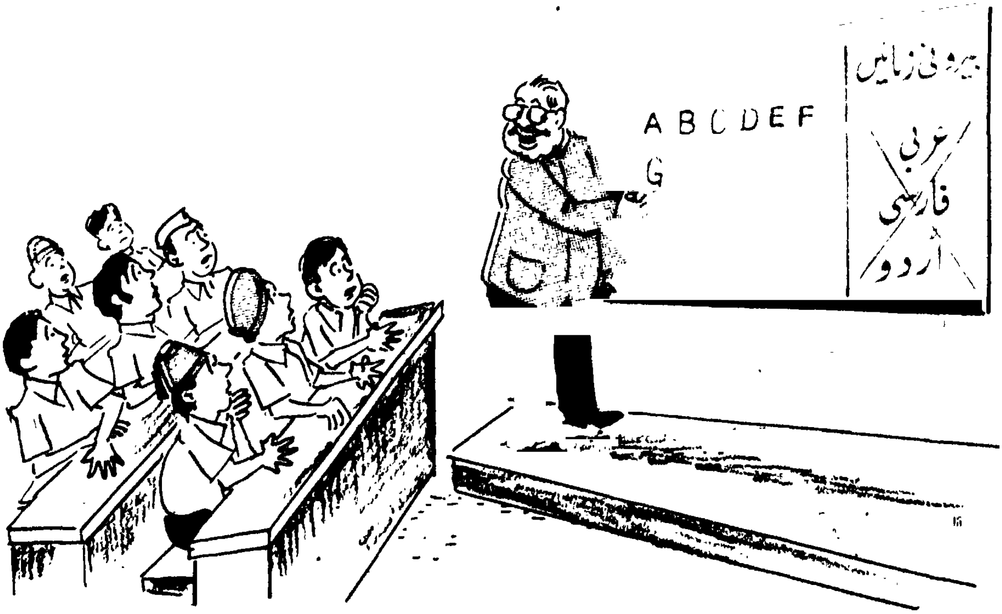
"مرکزی بجٹ سے گرانی میں مزید اضافہ ہوگا" ایک سُرخی
——— یہی تو کسی بجٹ کی خوبی ہوتی ہے۔

"مسٹر راج نارائن کی سرگرمیوں سے جنتا پارٹی کا وقار متاثر
ہو رہا ہے" ایک بیان ——— اچھا تو اب جنتا پارٹی کے پاس بھی
"وقار" آگیا ہے۔

"نیا بجٹ جرأت مندانہ ہے" ایک بیان ——— جس میں بڑی
جرأت کے ساتھ عام آدمی کو نظر انداز کیا گیا ہے۔

"جنوبی ہند میں جنتا پارٹی کی ناکامی کا ذمّہ دار کون ہے" ———
ایک عنوان ——— رائے دہندگان۔ اتنی آسان سی بات
کسی کی سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔

"سرکاری ملازمین کے گرانی الاؤنس میں اضافہ" ایک خبر۔
——— لہٰذا تاجر حضرات پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ اشیا کی
گرانی میں اضافہ فرمائیں۔



"جنتا حکومت انگریزی کی مخالف نہیں ہے" ——— سر چارلس ٹرفٹن۔



"جنتا حکومت اشیاء کے دام کم کرائے گی" ——— مسٹر مرارجی ڈیسائی

"مصر اور امریکہ کے بڑھتے ہوئے تعلقات سے اسرائیل تشویش میں مبتلا ہے۔" ایک خبر ——— امریکہ کا کام ہی یہ ہے کہ باری باری سے سارے ممالک کو "تشویش" میں مبتلا کیا جائے۔

"جنتا حکومت اشیا کے دام کم کرائے گی۔" مسٹر مرارجی ڈیسائی ——— ہمیں تو یوں لگ رہا ہے جیسے جنتا پارٹی کے سوائے کسی چیز کا دام کم نہیں ہو رہا ہے۔

"گیارہ ماہ کی مختصر مدت میں جنتا حکومت نے بہت کچھ کیا ہے۔" ایک بیان ——— جیسے چیزوں کے دام میں اضافہ اور امن وامان کی صورتِ حال میں ابتری وغیرہ۔

"غنڈہ گردی کو فوراً ختم کیا جائے۔" ایک مطالبہ ——— بھائی صاحب! ذرا آہستہ بولیے۔ کسی غنڈے نے سن لیا تو مشکل ہو جائے گی۔

"اُردو کو اُتر پردیش میں دوسری سرکاری زبان نہیں بنا جا سکتا۔" مسٹر چرن سنگھ ——— لہٰذا اُردو والے اب خاموش رہیں اور بقیہ زندگی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔

"عوام سے زبردستی چندہ وصول کیا گیا۔" ایک عنوان ——— چندہ تو زبردستی ہی وصول کیا جاتا ہے۔ بھلا آج تک کسی نے خوشی خوشی چندہ دیا ہے؟

"پاکستان کے سابق صدر یحییٰ خاں بلیوں کے قدر دان ہیں اور اُنھوں نے کتنی بلیاں پال رکھی ہیں۔" ایک خبر ——— خدا کرے اُن کی بلیاں "عملی سیاست" سے دور رہیں۔

"ملک میں نیا معاشی نظام قائم کیا جائے گا۔" ایک عنوان ——— اور اِس نئے معاشی نظام میں غریبوں کے لیے تھوڑی سی گنجائش نکالی جائے تو مناسب ہے۔

"اسسٹنٹ انجینیر رشوت لیتے ہوئے گرفتار" ایک خبر ——— وہ ناتجربہ کار ہوگا۔

"مرکزی وزیر تعلیم ڈاکٹر پرتاپ چندر اردو سیکھ رہے ہیں" خبر ——— کاش کہ کوئی اس اطلاع کو مسٹر راج نارائن تک پہنچا دے۔

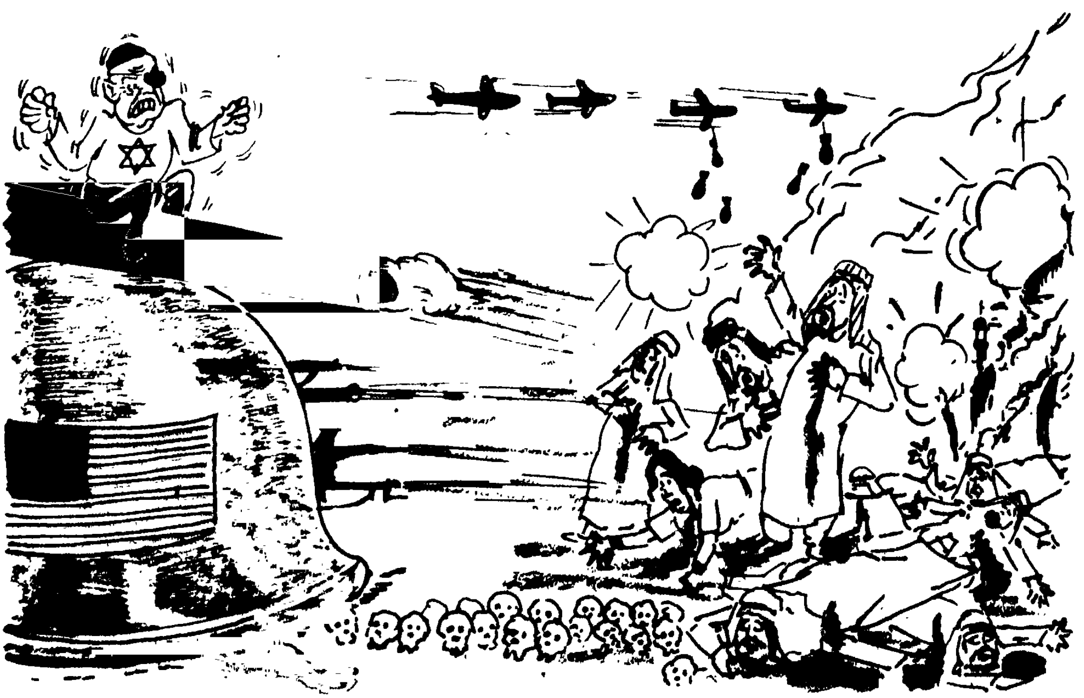
"جنتا حکومت کا پہلا بجٹ کمزور بجٹ ہے" ایک تبصرہ۔ اس کا مقصد عام آدمی کو کمزور بنانا ہے۔

"جنتا حکومت کی خارجی حکمتِ عملی کامیاب ہے"۔ مسٹر پالکھی والا ——— کاش کہ اس کی داخلی حکمتِ عملی بھی کامیاب ہوتی۔

"دونوں کانگریس پارٹیوں میں اتحاد کے لیے کوشش کی جائیگی"۔ نائیک، سابق چیف منسٹر مہاراشٹر ——— اور اُس وقت تک کوشش کی جاتی رہے گی جب تک کہ کانگریس پارٹیوں کی تعداد متعین نہ ہو جائے۔

"امریکی ٹینکوں اور امریکی طیاروں کے بموں نے مسٹر سادات کی تحریک امن کو ملیامیٹ کر دیا"۔ یاسر عرفات ——— امریکہ کے اپنے "پولیس مین" اسرائیل کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ۔

●●



"امریکی ٹینکوں اور امریکی طیاروں کے بموں نے مسٹر سادات کی تحریک امن کو ملیامیٹ کر دیا"۔ یاسر عرفات



"جنتا حکومت اشیاء کے دام کم کرائے گی" ——— مسٹر مرارجی ڈیسائی

"مصر اور امریکہ کے بڑھتے ہوئے تعلقات سے اسرائیل تشویش میں مبتلا ہے۔" ایک خبر ——— امریکہ کا کام ہی یہ ہے کہ باری باری سے سارے ممالک کو "تشویش" میں مبتلا کیا جائے۔

"جنتا حکومت اشیا کے دام کم کرائے گی۔" مسٹر مرارجی ڈیسائی ——— ہمیں تو یوں لگ رہا ہے جیسے جنتا پارٹی کے سوائے کسی چیز کا دام کم نہیں ہو رہا ہے۔

"گیارہ ماہ کی مختصر مدت میں جنتا حکومت نے بہت کچھ کیا ہے۔" ایک بیان ——— جیسے چیزوں کے دام میں اضافہ اور امن و امان کی صورتِ حال میں ابتری وغیرہ۔

"غنڈہ گردی کو فوراً ختم کیا جائے۔" ایک مطالبہ ——— بھائی صاحب! ذرا آہستہ بولیے۔ کسی غنڈے نے سن لیا تو مشکل ہو جائے گی۔

"اردو کو اتر پردیش میں دوسری سرکاری زبان نہیں بنا جا سکتا۔" مسٹر چرن سنگھ ——— لہٰذا اردو والے اب خاموش رہیں اور بقیہ زندگی ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔

"عوام سے زبردستی چندہ وصول کیا گیا۔" ایک عنوان ——— چندہ تو زبردستی ہی وصول کیا جاتا ہے۔ بھلا آج تک کسی نے خوشی خوشی چندہ دیا ہے؟

"پاکستان کے سابق صدر یحییٰ خاں بلیوں کے قدر دان ہیں اور انھوں نے کتنی بلیاں پال رکھی ہیں۔" ایک خبر ——— خدا کرے ان کی بلیاں "عملی سیاست" سے دور رہیں۔

"ملک میں نیا معاشی نظام قائم کیا جائے گا۔" ایک عنوان ——— اور اس نئے معاشی نظام میں غریبوں کے لیے تھوڑی سی گنجائش نکالی جائے تو مناسب ہے۔

"اسسٹنٹ انجینئر رشوت لیتے ہوئے گرفتار"۔ ایک خبر ——
بچارہ ناتجربہ کار ہوگا۔

"مرکزی وزیر تعلیم ڈاکٹر پرتاپ چندر ارُدو سیکھ رہے ہیں"۔
ایک خبر —— کاش کہ کوئی اس اطلاع کو مسٹر راج نارائن تک
پہونچا دے۔

"جنتا حکومت کا پہلا بجٹ کمزور بجٹ ہے"۔ ایک تبصرہ۔
اس کا مقصد عام آدمی کو کمزور بنانا ہے۔

"جنتا حکومت کی خارجی حکمتِ عملی کامیاب ہے"۔ مسٹر پالکھی والا
—— کاش کہ اس کی داخلی حکمتِ عملی بھی کامیاب ہوتی۔

"دونوں کانگریس پارٹیوں میں اتحاد کے لیے کوشش کی جائیگی"۔
مسٹر نائیک، سابق چیف منسٹر مہاراشٹر —— اور اُس
وقت تک کوشش کی جائے گی جب تک کہ کانگریس پارٹیوں کی تعداد
متعین نہ ہو جائے۔

"امریکی ٹینکوں اور امریکی طیاروں کے بموں نے مسٹر سادات
کی تحریک امن کو ملیامیٹ کر دیا"۔ یاسر عرفات —— امریکہ کے اپنے
"پولیس مین" اسرائیل کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ۔

●●



"امریکی ٹینکوں اور امریکی طیاروں کے بموں نے مسٹر سادات کی تحریک امن کو ملیامیٹ کر دیا"—— یاسر عرفات

شریمتی اندرا گاندھی



چہرہ پر مسکراہٹ اور متانت کا خوشگوار امتزاج جس میں کبھی کبھی لطیف غصّے اور برہمی کے آثار بھی گھل مل جاتے ہیں۔ بریدہ کاکلوں میں زمانہ کی پریشاں حالی اور نیرنگیٔ دوراں کے سیاہ و سفید کا عکس، چتونوں میں بانکپن اور ابروؤں میں کھنچاؤ، رفتار میں گرمی، گفتار میں کبھی نرمی، کبھی برّشِ تیغِ جوہردار ——— یہ ہیں ———

شریمتی اندرا گاندھی

مزاج بچپن سے شاہانہ پایا، سیاست اور بغاوت کی گود میں پروان چڑھیں حکومت کے گہوارے میں جھولیں۔ اور موقع ملتے ہی خود مسندِ حکومت پر رونق افروز ہوگئیں۔ کہتے ہیں، عادت بُری بلا ہے۔ دس گیارہ سال تک دُنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہندوستان کی وزیرِاعظم رہیں اور اقتدار کی ایسی عادت پڑ گئی کہ جب اس نشے کو ان کے منہ سے چھڑایا جانے لگا جھلا اٹھیں

ع ——— چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

انھوں نے نشہ تیز کرنے کے لیے "جمہوریت، سیکولرزم اور سوشلزم کی خودساختہ کاک ٹیل" پی کر قانون کے سریلے ساز توڑے، جمہوریت پسندوں کے کان مروڑے اور ایمرجنسی کے ایسے تیر چھوڑے کہ جو سامنے آیا شکار ہوا ——— مگر ع

کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں

آخر الکشن کی ترشی سے ان کا نشہ ہرن ہوا ——— اب خیر سے پھر "عوام کے غم" کا دم بھرنے لگی ہیں اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت اور شہرت کے سائے کے پیچھے بھاگ رہی ہیں۔

روایت شکنی ان کا مزاج ہے اور خود پسندی ان کا شعار، کسی "امام" کے پیچھے ان کی "نمازِ سیاست" ادا نہیں ہوتی، چنانچہ اپنی "ڈیڑھ اینٹ کی مسجد" الگ بنالی ہے ——— اور روایت شکنی کی اس سے روشن مثال اور کیا ہوگی کہ ——— سورج ہمیشہ مغرب میں غروب ہوکر مشرق سے نکلتا ہے مگر شریمتی اندرا گاندھی ایسا سورج ہیں جو شمال میں غروب ہوکر جنوب سے طلوع ہونے کی کوشش کر رہا ہے ——— ع

آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

●●



میرے شب و روز

رفعت سروش

میں نگینہ (ضلع بجنور) میں ایک غریب سید گھرانے میں پیدا ہوا۔ سرکاری اندراجات میں تاریخ پیدائش ۲ جنوری ۱۹۲۶ء ہے۔ بچپن اور لڑکپن نگینہ اور موانہ (ضلع میرٹھ) میں گزرا۔ ان قصبوں کی زندگی میں جاگیردارانہ نظام کی ایسی گھٹن تھی کہ میرا ذہن بچپن سے ہی راہِ فرار تلاش کرنے لگا —— ذرا لکھنے پڑھنے کی طرف میلان ہوا تو بچپن کے نام سید شوکت علی سے بھی دامن چھڑا لیا اور مصوری اور شاعری کی خاموش وادیوں میں بھٹکنے لگا —— دوسری جنگِ عظیم کے دوران ۴۳ء میں دہلی آیا مگر اس وقت تک میں لاہور کے ادبی رسائل ہمایوں، ادبی دنیا اور نیرنگِ خیال میں چھپنے لگا تھا اس لیے دہلی اور اس کے بعد بمبئی کے ادبی حلقوں میں مجھے کبھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ کئی دفتروں کی خاک چھانتا ہوا ۴۵ء کے آخر میں آل انڈیا ریڈیو (بمبئی) کے دروازے پر پہنچا اور پھر اس آواز کی دنیا سے ایسا تعلق ہوا جو شاید مرتے دم تک نہ ٹوٹے۔ ۵۸ء تک بمبئی ریڈیو پر ہندی اردو ڈرامے پیش کیے، پھر دودھ بھارتی سے منسلک ہوا اور گذشتہ ۱۴ سال سے اردو مجلس کا پروڈیوسر ہوں۔ اسٹیج کے لیے بھی کئی بیلے اور اوپیرا لکھ چکا ہوں۔

ریڈیو اور ڈراموں سے وابستگی نے مجھے مختلف اصنافِ نظم و نثر میں اپنے قلم کو آزمانے کے مواقع فراہم کیے۔ اب تک ۶ شعری مجموعے چھپ چکے ہیں مگر محض میرے تساہل کی وجہ سے نثری ڈرامے، افسانے اور مضامین ہنوز طبع نہیں ہوئے —— میری کئی کتابوں پر انعامات مل چکے ہیں، میں سودیت یونین کی سیاحت بھی کر چکا ہوں اور ہندوستان کے بیشتر علاقوں کی سیر کی ہے —— لیکن یہ احساس اپنی جگہ قائم ہے قائم ہے کہ میرے شب و روز ایک زنجیر میں بندھے ہوئے ہیں اور فرصت اور آزادی کے وہ لمحات بھی میری دسترس سے دور ہیں۔ مجھے اس بات کا شدید احساس ہے کہ ابھی مجھے بہت کچھ لکھنا ہے —— اور شاید یہی تشنگی ہے جو فکر کو تازہ اور توانا رکھتی ہے۔

●●



◀ دفتر میں مصروفِ تحریر



▲ شریکِ حیات صبیحہ کے ساتھ



▲ سنہ ۱۹۷۰ء میں دہلی کے ایک مشاعرے میں اپنا کلام سُناتے ہوئے۔



سنہ ۱۹۷۳ء ہند سوویت ثقافتی تعلقات کے موضوع پر ماسکو میں منعقدہ سیمینار میں حصہ لیا اور سوویت یونین کے کئی شہروں کی سیر کی۔

تاجکستان میں فردوسی لائبریری کے سامنے ثقافتی وفد کے کچھ ممبران کے ساتھ۔



مجھے صدر جمہوریۂ ہند فخر الدین علی احمد (مرحوم) کے ہاتھوں "سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ" سے نوازا گیا۔



▲ ڈاکٹر عبدالعلیم مرحوم اور چند سوویت ادیبوں کے ساتھ سوویت کلچرل ہاؤس (نئی دہلی) میں ایک جلسے کی نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے۔



ماسکو کے "فرینڈشپ ہاؤس" میں اپنی نظم "وانگا اور گنگا" سناتے ہوئے، ساتھ ہیں تاشقند یونیورسٹی کے ڈاکٹر مرزروف جنھوں نے اس نظم کا ترجمہ روسی زبان میں کیا۔ ◄



ایک ریڈیائی مباحثہ میں میرے شریکِ گفتگو ہیں ڈاکٹر قمر رئیس، شمس الرحمٰن فاروقی اور ڈاکٹر خلیق انجم۔ ►



۴ دسمبر ۱۹۷۷ء کو اپنی بیٹی شبانہ کی شادی کے موقعہ پر اس کے دولھا سیّد ناصر نذیر اور گھر کے دوسرے افراد شاہینہ، صبیحہ، انصار اور نوید کے ساتھ۔ ◄



بزمِ شنکر و شاد دہلی کی طرف سے ہر سال کی طرح اس سال بھی ایک
عظیم الشان مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس میں ہندوستان کے مشاہیر شعرا اور شاعرات
کے علاوہ پاکستان سے جناب مجیب خیر آبادی جناب دلاور فگار اور محترمہ پروین
شاکر نے شرکت کی۔ یہاں اِس مشاعرے کی چند جھلکیاں پیش کی جا رہی ہیں۔
پاکستان سے آئی ہوئی مہمان شاعرہ محترمہ پروین شاکر نے تحت میں
پڑھا اور اپنے کلام سے ہزاروں سامعین کے دلوں کو مسخر کر لیا ◄

بارش ہوئی تو پھولوں کے تن چاک ہو گئے
موسم کے ہاتھ بھیگ کے سفّاک ہو گئے
بادل کو کیا خبر ہے کہ بارش کی چاہ میں
کتنے بلند و بالا شجر خاک ہو گئے
جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں
بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے
لہرا رہی ہے برف کی چادر ہٹا کے گھاس
سورج کی شہ پہ تنکے بھی بیباک ہو گئے
بستی میں جتنے آب گزیدہ تھے سب کے سب
دریا کے رُخ بدلتے ہی تیراک ہو گئے
جب بھی غریبِ شہر سے کچھ گفتگو ہوئی
لہجے ہوائے شام کے نمناک ہو گئے

★★



پاکستانی شاعر مجیب خیر آبادی اپنا کلام سُنا رہے ہیں ◄

قہر کو قہر کہو رحمتِ یزداں نہ کہو
گُل فروشوں کو گُلستاں کا نگہباں نہ کہو
ہم نوایانِ چمن طرزِ نوا ایک رہے
حالِ دل صورتِ اوراقِ پریشاں نہ کہو
یہ کہو رنگِ چمن کس کے لہُو سے نکھرا
کون ہے قابضِ تنظیمِ گلستاں نہ کہو
تم نے دیکھا ہی نہیں سیلِ بہاراں یارو!
چند کلیوں کے تبسّم کو گُلستاں نہ کہو



محترمہ حسنٰی سرور بنگلور سے آئی تھیں ان کا کلام بھی بہت پسند کیا گیا ◄

دامن جو پسارے ہوئے ہر شخص کھڑا ہے
کیا کوئی یہاں دل کا سکوں بانٹ رہا ہے
کیا جانیے کیا شہر کی راتوں نے کہا ہے
تا صبح ہر اک زخم دیا بن کے جلا ہے
ہے کس کے لیے سارا جہاں گوش بر آواز
ان اُونچی فصیلوں سے پرے کس کی صدا ہے
حیراں ہوں تجھے دیکھ کے تو ہے کہ میں ہوں
یہ کس نے مرے ہاتھوں میں آئینہ دیا ہے

★★



حیدر آباد کی ہر دلعزیز شاعرہ محترمہ عزیز النساء صبا غزل سرا ہیں ◄

پھر کوئی تازہ غزل اپنی سناؤں کیسے
آپ کو آپ کی تصویر دکھاؤں کیسے
لفظ مجبور ہیں اظہارِ حقیقت کے لیے
مجھ پہ جو کچھ بھی گزرتی ہے سناؤں کیسے
بار بار اُن کی نظر اُٹھتی ہے میری جانب
ان کی نظروں سے بھلا خود کو چھپاؤں کیسے

◄ مشاعرے میں جدید شعرا کی نمائندگی ندا فاضلی نے کی۔



زمین خاک، فلک راکھ چل سکو تو چلو
خود اپنے آپ سے باہر نکل سکو تو چلو

یہاں کسی کو کوئی راستہ نہیں دیتا
مجھے گرا کے اگر تم سنبھل سکو تو چلو

ہر اک سفر کو ہے محفوظ راستوں کی تلاش
حفاظتوں کی روایت بدل سکو تو چلو

یہی ہے زندگی کچھ خواب، چند اُمیدیں
انھیں کھلونوں سے تم بھی بہل سکو تو چلو

◄ غزل کو گیت بنا دینے والے شاعر بیکل اتساہی کی مترنم آواز محفل پر کیف بن کر چھا گئی۔



بیکل جی گاؤں کو لوٹ چلو اِس شہر کے لوگ ہٹیلے ہیں
ہے جوالا مکھی ہر ایک بدن پر من کے سبھی برفیلے ہیں

ہیں کرشن کھڑے شوکیسوں میں، بانسریاں بکیں فٹ پاتھوں پر
رادھا کے سجائے جوڑے میں جو پھول ہیں پتھریلے ہیں

کیا جانیے یہ کب سے بند کھڑے پردے کے پرے سُدھ بدھ بسرے
شیشے کی دکاں میں پتھر کے دروازے بڑے شرمیلے ہیں

امرت کے گھڑے کولھوں پہ دھرے پنگھٹ سے اُٹھے بل کھاتے ہوئے
پیاسوں کو یہی ڈس لیتے ہیں بادل یہ بڑے زہریلے ہیں





۱۸ فروری ۱۹۷۸ء کو اُردو سماج لکھنؤ کے زیرِ اہتمام اُردو کی زوال پذیر صنفِ سخن ریختی کے آثار و امکان کا جائزہ لینے کے لیے ایک سیمینار اور مشاعرۂ ریختی کا انعقاد ہوا۔

ڈاکٹر سلمان عباسی اور مس روتی نایاب نے ریختی گو شاعر سلیس لکھنوی کو کلام سُنانے سے پہلے انھیں دوپٹہ اڑھایا۔

●

چُولھے سے بیر سینے پرونے سے دشمنی
بھیّا بیاہ لائے ہیں گھر میں پڑھی لکھی
میں تو نقاب میں بھی یہ منظر نہ سہہ سکی
بے پردہ اس طرح سے وہ گھر سے نکل پڑی
حد ہو گئی چچی نے جو آواز دی اُسے
اِک تولیہ لپیٹے کمر سے وہ آ گئی
کیسا زمانہ آ گیا سُنتی ہو اے بُوا
ہم چوڑیاں پہنتے ہیں وہ ہاتھ میں گھڑی
کُرتے میں بھائی جان کے ڈھیلا تھا اک بٹن
جالی نہ ہتھ کٹی تھی مگر پھنس گئی سُوئی
کچّی شکر کی طرح سے بھیّا تو گھل گئے
دیکھی جو بھابھی جان کے ساتھ ایک پھلجھڑی

نسیم سحر نسیم فاروقی اپنا کلام سُناتے ہوتے۔

●

بش شرٹ پہنے دیکھا جو بل باٹ پر مجھے
سو فیصدی سمجھنے لگے لوگ نر مجھے
مرجھائی جا رہی ہوں میں فصلِ بہار میں
اللہ میرے لگ گئی کس کی نظر مجھے
کرنے لگا ہے جب سے پڑوسن سے بات چیت
کمبخت پھیر لیتا ہے منھ دیکھ کر مجھے
چوکر خرید لایا ہے روٹی کے واسطے
جیسے سمجھ رہا ہے موا جانور مجھے
برتاؤ دیکھ کے مُنّے کے باپ کا
لگنے لگا ہے مردوں کی صورت سے ڈر مجھے
جھاڑو پھرے کمائی پہ اس کی مری بہن
جس نے سکوں دیا نہ کوئی عمر بھر مجھے
چھونکا وہ مجھ کو لُوسکا سمجھتا ہے اِن دنوں
کہتا تھا پیار سے جو نسیمِ سحر مجھے



◀ مشاعرے میں جدید شعرا کی نمائندگی ندؔا فاضلی نے کی:۔

زمین خاک، فلک راکھ چل سکو تو چلو
خود اپنے آپ سے باہر نکل سکو تو چلو
یہاں کسی کو کوئی راستہ نہیں دیتا
مجھے گرا کے اگر تم سنبھل سکو تو چلو
ہر اک سفر کو ہے محفوظ راستوں کی تلاش
حفاظتوں کی روایت بدل سکو تو چلو
یہی ہے زندگی کچھ خواب، چند اُمیدیں
انھیں بہانوں سے تم بھی بہل سکو تو چلو



غزل کو گیت بنا دینے والے شاعر بیکلؔ اتساہی کی متّرنم آواز محفل پر کیف بن کر چھا گئی:۔ ◀

بیکل جی گاؤں کو لوٹ چلو اِس شہر کے لوگ ہٹیلے ہیں
ہے جوالا مکھی ہر ایک بدن پر من کے سبھی برفیلے ہیں
ہیں کرشن کھڑے شوکیسوں میں، بانسریاں بکیں فٹ پاتھوں پر
رادھا کے سجائے جوڑے میں جو پھول ہیں پتھریلے ہیں
کیا جانیے یہ کب سے بند کھڑے پردے کے پرے سُدھ بدھ بسرے
شیشے کی دکاں میں پتّھر کے دروازے بڑے شرمیلے ہیں
امرت کے گھڑے کولھوں پہ دھرے پنگھٹ سے اُٹھے بل کھاتے ہوئے
پیاسوں کو یہی ڈس لیتے ہیں بادل یہ بڑے زہریلے ہیں



فروری ۱۹۷۸ء کو اُردو سماج لکھنؤ کے زیرِ اہتمام اُردو کی زوال پذیر صنفِ سخن ریختی کے آثار و امکان کا جائزہ لینے کے لیے ایک سیمینار اور مشاعرۂ ریختی کا انعقاد ہوا۔

سلمان عبّاسی اور مس روحی نایاب نے ریختی گو شاعر سلیس لکھنوی
لام سُنانے سے پہلے انھیں دوپٹہ اڑھایا۔

●

چُولھے سے بیر سینے پرونے سے دشمنی
بھیّا بیاہ لائے ہیں گھر میں پڑھی لکھی
میں تو نقاب میں بھی یہ منظر نہ سہہ سکی
بے پردہ اس طرح سے وہ گھر سے نکل پڑی
حد ہوگئی چچی نے جو آواز دی اُسے
اِک تولیہ لپیٹے کمرے سے وہ آگئی
کیسا زمانہ آگیا سُنتی ہو اے بُوا
ہم چوڑیاں پہنتے ہیں وہ ہاتھ میں گھڑی
کُرتے میں بھائی جان کے ڈھیلا تھا اِک بٹن
جالی نہ ہتھ کٹی تھی مگر پھنس گئی سُوئی
کچّی شکر کی طرح سے بھیّا تو کھل گئے
دیکھی جو بھابھی جان کے ساتھ ایک پھلجھڑی

نسیم سحر نسیم فاروقی اپنا کلام سُناتے ہوئے۔

●

بش شرٹ پہنے دیکھا جو بل باٹ پر مجھے
سو فیصدی سمجھنے لگے لوگ نر مجھے
مرجھائی جا رہی ہوں میں فصلِ بہار میں
اللہ میرے لگ گئی کس کی نظر مجھے
کرنے لگا ہے جب سے پڑوسن سے بات چیت
کمبخت پھیر لیتا ہے منھ دیکھ کر مجھے
چوکر خرید لایا ہے روٹی کے واسطے
جیسے سمجھ رہا ہے موا جانور مجھے
برتاؤ دیکھ دیکھ کے مُنّے کے باپ کا
لگنے لگا ہے مردوں کی صورت سے ڈر مجھے
جھاڑو پھرے کمائی پہ اُس کی مری بہن
جس نے سکوں دیا نہ کوئی عمر بھر مجھے
جھونکا وہ مجھ کو لُو کا سمجھتا ہے اِن دنوں
کہتا تھا پیار سے جو نسیمِ سحر مجھے

ماضی کے جھروکے سے ——— بہادر شاہ ظفر

ابوالمظفر کنیت، سراج الدین محمد نام، بہادر شاہ لقب اور ظفر تخلص تھا۔ دلی کے آخری مغل تاجدار کی حیثیت سے دلی والوں کے دل میں ج بھی اُن کے لیے محبت اور عقیدت کا جذبہ زندہ ہے۔ ظفر ۱۸۳۷ء میں تخت نشین ہوئے تھے، یہ وہ زمانہ تھا جب اصل اقتدار انگریزوں کے ہاتھوں میں نتقل ہو چکا تھا اور بادشاہ کی حیثیت ایک وظیفہ یاب سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی لیکن بہادر شاہ ظفر ان تہذیبی روایات کی علامت تھے جو ہندوستان کے نگا جمنی معاشرے کی تشکیل کرتی تھیں۔ جنھیں یہ معاشرہ عزیز تھا، انھیں ان روایات سے بھی جذباتی لگاؤ تھا اور ان کے لیے بہادر شاہ ظفر بھی ایک بوب و محترم شخصیت تھے۔

بہادر شاہ ظفر شعر و شاعری کے علاوہ شہسواری اور تیغ زنی میں بھی بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ تصوف اور اس کے وسیلے سے موسیقی سے بھی نھیں شغف تھا۔ ابتدا میں اپنے کلام پر شاہ نصیر سے اصلاح لی، پھر ذوق کی شاگردی اختیار کر لی اور ذوق کے انتقال کے بعد غالب سے مشورہ کرنے لگے ھے۔ ان کے ہاں مشکل ردیف و قوافی کا استعمال شاہ نصیر کی یاد دلاتا ہے اور بیان کی سلاست اور صفائی میں وہ استاد ذوق کے بہت قریب ہیں لیکن سِ مضمون کے اعتبار سے ان کی شاعری اپنا ایک الگ رنگ رکھتی ہے جو حقیقت اور مجاز کے امتزاج سے بنا ہے اور شاعر کی اس بصیرت کی غمازی کرتا ہے جو سرور و انبساط کے غلبے میں بھی اسے حزن و یاس کی کیفیتوں سے آشنا کر سکتی ہے اور اس سے اس طرح کے شعر کہلواتی ہے۔

لگتا نہیں ہے دل مرا اُجڑے دیار میں ٭ کس کی بنی ہے عالمِ ناپائدار میں

کہتے ہیں، شاعری جزویست از پیغمبری — جس غزل کا یہ مطلع ہے اس کے مقطع میں ظفر نے ایک پیشگوئی کی تھی:۔

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے ٭ دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

کی یہ پیشگوئی سچ ثابت ہوئی۔ ۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی کی ناکامی کے بعد بہادر شاہ ظفر پر انگریزی عتاب نازل ہوا اور انھیں معزول کر کے رنگون میں ا وطن کر دیا گیا۔ وہیں ۱۸۶۳ء میں تنہائی اور کس مپرسی کی حالت میں اُن کا انتقال ہوا۔ ان کی زندگی میں ان کے بہت سے قصیدے لکھے گئے تھے لیکن ان کی موت سی نے مرثیہ نہیں کہا، غالب نے بھی نہیں، جو ان کے استاد بھی رہے تھے اور قصیدہ نگار بھی، اور اُس وقت تک بقیدِ حیات تھے۔

زلیں ——— بہادر شاہ ظفر

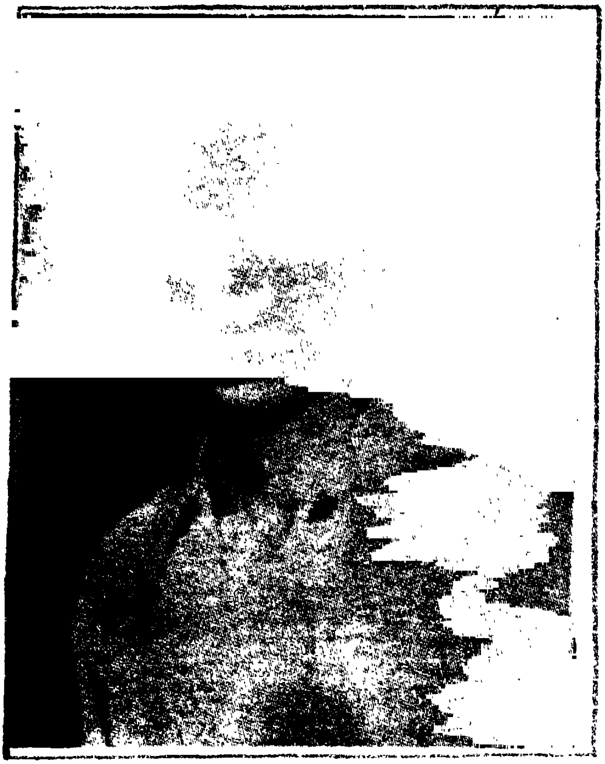
یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
اپنا دیوانہ بنایا مجھے ہوتا تو نے
کیوں خرد مند بنایا نہ بنایا ہوتا
خاکساری کے لیے گرچہ بنایا تھا مجھے
کاش سنگِ درِ جانانہ بنایا ہوتا
نشۂ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھ کو
عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا
روزِ معمورۂ دُنیا میں خرابی ہے ظفر
ایسی بستی سے تو ویرانہ بنایا ہوتا

جلایا آپ ہم نے ضبط کر کے آہِ سوزاں کو
جگر کو، سینہ کو، پہلو کو، دل کو، جسم کو، جاں کو
ہمیشہ کنجِ تنہائی میں ہم مونس سمجھتے ہیں
الم کو، یاس کو، حسرت کو، بیتابی کو، حرماں کو
جگہ کس کس کو دوں دل میں ترے ہاتھوں سے لے قاتل
کٹاری کو، چھری کو، بانک کو، خنجر کو، پیکاں کو
لڑا کر آنکھ اس سے ہم نے دشمن کر لیا اپنا
نگہ کو، ناز کو، انداز کو، ابرو کو، مژگاں کو
بنایا اے ظفر خالق نے کب انسان سے بہتر
ملک کو، دیو کو، جن کو، پری کو، حور و غلماں کو

بہادر شاہ ظفر



ظفرؔ آدمی اس کو نہ جانیے گا ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے ہوش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا



مخدوم محی الدین ـــــ یادوں میں بسا آدمی

(مخدوم کے ۷۰ویں یوم پیدائش پر)

مجتبیٰ حسین
۸۰/۲۹ مالویہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷

پچیس چھبیس برس اُدھر کی بات ہے۔ مخدوم محی الدین "انڈر گراؤنڈ" تھے اور میں مڈل اسکول کا طالب علم تھا۔ اُن دنوں مجھے اُتنی ہی انگریزی اور اُردو آتی تھی جتنی کہ آج آتی ہے۔ لہٰذا میں اپنے تئیں "انڈر گراؤنڈ" کا آسان ترجمہ "زیرِ زمین" کر کے گھنٹوں حیران رہا کرتا تھا کہ مخدوم بھائی آخر زیرِ زمین رہ کر کیا کرتے ہیں۔ مجھے تو وہ ٹیکے از معدنیات" قسم کی کوئی چیز لگتے تھے۔ بھلا ایک آدمی کو خواہ مخواہ "زیرِ زمین" جا کر رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ ترجمے کی یہ غلطی مجھ سے بچپن میں سرزد ہوئی تھی مگر بڑے ہوتے تو کہیں پڑھا کہ پاکستان کے ایک شاعر سے ترجمے کی یہ غلطی تو عین جوانی میں سرزد ہوئی تھی۔ جن دنوں "بنے بھائی" یعنی سجاد ظہیر پاکستان میں پارٹی کی سرگرمیوں کے سلسلہ میں روپوش تھے۔ تاجکستان کے مشہور شاعر مرزا ترسون زادہ پاکستان کے دورے پر آئے اور ایک پاکستانی شاعر سے فارسی میں پوچھا "سجاد ظہیر کجا است ؟"

پاکستانی شاعر نے بڑی روانی کے ساتھ فارسی میں ترکی بہ ترکی جواب دیا "سجاد ظہیر زیرِ زمین است" یہ سنتے ہی مرزا ترسون زادہ کی آنکھوں میں کم و بیش اسی روانی کے ساتھ آنسو آگئے۔ بولے "یہ کب ہوا ؟ ہمیں تو کچھ بھی پتہ نہ چلا۔ آخر اُنھیں کیا بیماری ہو گئی تھی ؟"

پاکستانی شاعر کو اچانک اپنی فارسی دانی کا احساس ہوا تو ہاتھوں اور بھنوؤں کے اشارے سے مابقی فارسی بولتے ہوئے مرزا ترسون زادہ پر "زیرِ زمین" اور "روپوش" ہونے کے نازک فرق کو واضح کیا۔ اسی طرح مخدوم بھی میرے لیے ایک عرصہ تک "زیرِ زمین" ہی رہے اور کسی نے میری غلط فہمی دور نہیں کی۔

پھر جب ہم نے شعور سنبھالنا شروع کیا تو احساس ہوا کہ مخدوم بڑی تیزی سے ہمارے شعور کا حصّہ بنتے جا رہے ہیں۔ پھر حصہ بنتے بنتے وہ کامل شعور ہی بن گئے۔ مخدوم سے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ میرے ایک دوست مخدوم کے مجموعہ کلام "سرخ سویرا" کو رحل پر رکھ کر نہ صرف پڑھا کرتے تھے بلکہ مطالعے کے دوران میں آگے اور پیچھے جھولتے بھی تھے۔ ہے کوئی شاعر جس کا کلام اس طرح پڑھا گیا ہو؟

صاحبو! وہ بھی کیا دن تھے۔ ہر صبح بستر سے، جاگتے ہی آسمان پر نظر جاتی تھی کہ کہیں "سرخ سویرا" تو نہیں آگیا۔ جی چاہتا اپنے ملک میں بھی ایک عدد "انقلاب روس" لے آئیں — انقلاب کے انتظار میں سگریٹیں پی پی کر کئی راتیں گزاریں۔ ہمارا سوشلزم وہی تھا جو مخدوم اور فیض کی شاعری، کرشن چندر کے افسانوں، سجاد ظہیر اور سردار جعفری کی تحریروں کے وسیلے سے ہم تک پہنچا تھا۔ گویا یہ خالصتاً "اردو سوشلزم" تھا۔ پھر ہم حیدرآبادیوں کے لیے مخدوم صرف شاعر اور دانشور نہیں تھے بلکہ بہت کچھ تھے۔ مخدوم کی زیر زمین رہنے کی عادت کی وجہ سے اُن کی شخصیت کے اطراف ایک عجیب سا سحر پیدا ہو گیا تھا۔ بیشمار لوگوں نے اُن کے بارے میں باتیں بھی کچھ ایسی ہی پھیلا رکھی تھیں کہ کبھی کبھی مخدوم ایک مافوق الفطرت شے دکھائی دیتے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ مخدوم بیک وقت چار مختلف مقامات پر موجود رہتے ہیں۔ اگر چار بجے ورنگل میں مزدوروں کے ایک خفیہ جلسے سے خطاب کر رہے ہیں تو ٹھیک اُسی وقت نلگنڈہ میں ایک زمیندار کی زمین بے زمین کسانوں میں بانٹ رہے ہیں، اور پھر ٹھیک اسی سمے حیدرآباد کے ایک محلہ میں اپنے ایک دوست کو اپنی تازہ نظم سنا رہے ہیں —— اور پھر اُسی وقت —— اب خیر جانے بھی دیجیے ایسی باتیں کہاں تک سنائی جائیں۔ مخدوم کے بارے میں اس قسم کے انکشافات کو سن کر ہمارے کمسن اور نوخیز خون کی جو حالت ہوتی ہوگی اُس کا اندازہ آپ خود بھی لگا سکتے ہیں۔ خون رگوں میں اُبلا پڑتا تھا جسے بعد میں مخدوم کے کلام کے ذریعے ہی ٹھنڈا کیا جاتا تھا۔ علاج بالمثل اِسی کو کہتے ہیں۔ اُس وقت تک مخدوم کو بہت دیکھا تھا حالانکہ اُن کے ہر جگہ (OMNI PRESENT) ہونے کی اتنی ساری افواہیں سن رکھی تھیں۔

پھر یوں ہوا کہ مخدوم جب قید سے رہا ہوئے تو ہمیں اطلاع ملی کہ وہ شاہ آباد میں مزدوروں کے ایک جلسے سے خطاب کرنے کے لیے آرہے ہیں۔ اُن دنوں میں گلبرگہ انٹرمیڈیٹ کالج میں پڑھتا تھا۔ جس شاعر کا کلام اپنے لیے وظیفہ تھا اور جس کی تصویر سدا دل کے آئینہ میں رکھی رہتی تھی اُس کے شاہ آباد آنے کی اطلاع ملی تو رگوں میں خون کچھ اس زور سے اُبلا کہ میں اور میرا وہ دوست جو "سرخ سویرا" کو رحل پر رکھ کر پڑھا کرتا تھا اسٹیشن کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ معلوم ہوا کہ شاہ آباد کی طرف جانے والا مدراس میل ابھی جا چکا ہے، انکوائری سے پوچھا کہ شاہ آباد کا یہاں سے کتنا فاصلہ ہے۔ جواب ملا "۲۵ کلومیٹر"۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے آج عشق، آتش نمرود میں کود پڑے گا اور ۲۵ کلومیٹر کا فاصلہ پیدل طے کرے گا۔ اپنے جنون کی کہاں تک تشہیر کی جائے۔ یہ ہماری زندگی کی پہلی اور آخری "لانگ مارچ" تھی۔ مگر شاہ آباد پہنچے تو معلوم ہوا کہ مخدوم آئے بھی اور چلے بھی گئے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ماتھے پیٹ کر چپ ہو رہے۔ مگر مخدوم مافوق الفطرت شے تو تھے ہی۔ انھیں غالباً کسی غیبی طاقت نے بتا دیا تھا کہ گلبرگہ میں دو دیوانے اُن سے ملنے کے لیے بیتاب ہیں، لہٰذا پندرہ دن بعد مخدوم گلبرگہ چلے آئے۔ مزدوروں کے کسی جلسے کو مخاطب کرنے۔ جلسے کے بعد کالج کے نوجوانوں نے اُنھیں گھیر لیا۔ مجھے یاد ہے وہ پورے چاند کی رات تھی۔ ایسا روشن چاند ہم نے زندگی میں پھر کبھی نہیں دیکھا۔ گلبرگہ کے مومن پورہ میں ایک بزرگ کے مزار کے سامنے ایک چبوترے پر مخدوم ہم نوجوانوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ آدھی رات بیت چکی تھی اور مخدوم ہم سب کو کلام سنا رہے تھے۔ "سرخ سویرا" تو ہمیں زبانی یاد تھا ہی لہٰذا ہم نے کہا "مخدوم بھائی اپنا کوئی غیر مطبوعہ کلام سنائیے"۔ بولے "میں غیر مطبوعہ کلام نہیں کہتا۔ ہمیشہ مطبوعہ کہتا ہوں"۔

پھر میں حیدرآباد آیا۔ مخدوم سے ان گنت ملاقاتیں ہوئیں۔ پھر یوں ہوا کہ کئی برس بعد ایک دن میں، پروفیسر حسن عسکری اور مخدوم حیدرآباد کے ویکا جی ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ مجھے مخدوم سے ملنے کا وہ پہلا ادھورا اشتیاق یاد آیا۔ میں نے مخدوم سے کہا "مخدوم بھائی! آپ کو پتہ نہیں کہ کئی برس پہلے آپ سے ملنے کے لیے میں اور میرے ایک ساتھی نے گلبرگہ سے شاہ آباد تک پیدل سفر کیا تھا"۔

یہ سنتے ہی نہایت رازداری کے انداز میں بولے "اچھا تو اب ملو۔ بتاؤ کیا کام تھا تمھیں مجھ سے؟۔ کوئی خاص بات تھی کیا؟"

مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ میں نے کہا "مخدوم بھائی! اب تو مجھے یاد نہیں رہا کہ میں اُس وقت آپ سے کیوں ملنا چاہتا تھا۔ زندگی کے سفر میں بہت سی باتیں، بہت سی خواہشیں اور بہت سے کام یونہی ادھورے ہو جاتے ہیں"۔ بولے "یاد کر کے بتانا۔ تمہارا حافظہ خاصہ

...ہوتا جا رہا ہے۔ اور ہاں آئندہ کبھی ہیدل
...ی غلطی نہ کرنا۔" یہ کہکر مخدوم نے زوردار قہقہہ
...ر مجھے آج تک پتہ نہیں چل سکا کہ مخدوم نے
...قہہ مجھ پر لگایا تھا یا اپنے آپ پر۔ بعض قہقہوں
...سیدے کا سراغ لگانا بہت دشوار ہوتا ہے)
...بات کو ختم کرکے مخدوم نے مجھ سے اور حسن
...لمری سے زوردار مصافحے کیے۔ اُن کی عادت
...ی کہ جب بھی کوئی چُبھتا ہوا فقرہ کہتے، جو وہ
...ر کہتے تھے اور مذاق کی کوئی بات کہتے، جو
اکثر کہتے تھے تو مخاطب سے مصافحہ ضرور
...یا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب بھی مخدوم
...برو ہوتے تو میں بائیں ہاتھ سے سگریٹ
...ا تھا اور دائیں ہاتھ کو مصافحے کے لیے
...یزرو رکھتا تھا۔ ایک بار مجھے اور مخدوم کو
...ادبی تقریب میں شرکت کے لیے بمبئی
...ا پڑ گیا۔ حیدرآباد کے اسٹیشن پر میں پہنچا تو میرے
...ے ہاتھ میں اٹیچی کیس تھا اور دوسرے میں
...لڈول۔ مخدوم نے مجھے دیکھتے ہی مصافحہ
...لا فقرا کہہ دیا اور میں نے اٹیچی کیس کو نیچے رکھ کر
...ن سے مصافحہ کیا۔ پھر اُنھوں نے تابڑ توڑ کئی بار
مصافحہ فقرے کہہ کر مجھ سے اٹیچی کیس کو نیچے رکھوایا
...ب اُن کے فقروں سے ایسا الرجک ہوا کہ ابھی وہ
...دھا فقرہ ہی کہتے تھے کہ میں اٹیچی کیس کو نیچے رکھ
...یتا تھا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر بولے "بیٹا!
...ب تو تم میرے ایسے فقروں پر بھی اٹیچی کیس نیچے
...رکھنے لگے ہو جن پر میں مصافحہ نہیں کرتا۔ تم خود
...ورزش کرنا چاہتے ہو تو کرو۔"

یہ کہہ کر مجھے اٹیچی کیس نیچے رکھنے کا حکم دیا۔
مصافحہ کیا اور بولے "خبردار جو اب کبھی اٹیچی کیس
نیچے رکھا۔" اور اس کے بعد پھر مصافحے کی منزل
آ گئی۔

مخدوم کی بذلہ سنجی اور شگفتہ مزاجی کے
بے شمار واقعات مجھے یاد ہیں۔ اپنا مذاق آپ اُڑانے
میں اُن کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ایک بار علی الصبح اورینٹ
ہوٹل میں پہنچ کر بیرے سے پوچھا "نہاری ہے؟"

بیرا بولا "نہیں ہے"۔

مخدوم نے پوچھا "آملیٹ ہے؟"

بیرا بولا "نہیں ہے"

مخدوم نے پوچھا "کھانے کے لیے کچھ
ہے؟"

بیرا بولا "اس وقت تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

اس پر مخدوم بولے "یہ ہوٹل ہے یا ہمارا
گھر کہ یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔"

اُن کی عادت تھی کہ جب بھی کوئی نئی غزل
کہتے تو اُسے سُنانے کے لیے دوڑ پڑتے تھے۔ اپنی
اس عادت سے متعلق خود ہی ایک لطیفہ سُنایا
کرتے تھے۔ ایک دن اُن سے غزل ہو گئی تو فوراً
اورینٹ ہوٹل چلے آئے کہ کوئی مائی کا لال مل جائے
تو اُسے غزل سنائیں۔ یہاں کوئی نہ ملا تو "صبا" کے
دفتر چلے گئے۔ وہاں بھی کوئی نہ ملا۔ تھک ہار کے
چائنیز بار میں چلے گئے۔ بار کے بیرے قاسم کو
بلا کر کہا "دو پیگ وہسکی لے آؤ"۔ قاسم وہسکی
لے آیا تو اُس سے بولے "بیٹھو اور وہسکی پیو۔"
قاسم شرماتا رہا مگر وہ مُصر رہے۔ اُس نے کھڑے
کھڑے وہسکی پی لی۔ پھر بولے "دو پیگ وہسکی
اور لے آؤ۔" دوسرے دور میں بھی اُنھوں نے
قاسم کو وہسکی پلائی۔ پھر تیسرا دور چلا۔ اس کے بعد
مخدوم نے قاسم سے کہا۔

"اچھا قاسم اب میرے سامنے بیٹھو۔
میں تمہیں اپنی تازہ غزل کے کچھ شعر سُنانا چاہتا
ہوں۔" یہ سُنتے ہی قاسم نے کہا "صاحب! آپ
بہت پی چکے ہیں۔ آپ کی حالت غیر ہو رہی
ہے۔ چلیے میں آپ کو گھر چھوڑ آؤں۔"

مخدوم کہا کرتے تھے کہ اپنی ہوشمندی کے
ہزار ثبوت پیش کرنے کے باوجود قاسم نے اُس
رات اُن کی غزل نہیں سنی یہ لطیفہ سُنا کر خود ہی ہنستے
تھے اور مخاطب سے زوردار مصافحہ کرتے تھے۔

یہ لطیفہ بھی مخدوم ہی سُنایا کرتے تھے جو
اُن کے دورِ روپوش سے متعلق ہے۔ کہتے ہیں کہ
ایک بار یہ اپنے ایک برہمن دوست کے گھر روپوش
ہو گئے۔ ان کا برہمن دوست بھی پارٹی کا ممبر تھا۔
اُن کے دوست نے اُن سے کہہ رکھا تھا کہ
"مخدوم بھائی میرے والد بڑے قدامت پرست
ہیں۔ اسی لیے اُن پر کبھی یہ ظاہر نہ کرنا کہ آپ
برہمن نہیں ہیں۔ اپنی برہمنیت کی لاج رکھنا۔"

ایک دن اُن کے دوست کے والد نے
مخدوم سے کہا "بھئی! تم لوگ کمیونسٹ پارٹی
میں ہو۔ تمہارے دھرم کا کوئی بھروسہ نہیں۔
کہیں تم گوشت تو نہیں کھاتے؟"

مخدوم نے جھٹ سے کہا "لاحول ولاقوۃ۔
یہ آپ نے کیسے سوچ لیا کہ میں گوشت کھاتا ہوں۔
نعوذ باللہ یہ تو مجھ پر سراسر تہمت ہے۔"

اس نان وجیٹیرین جملے کے بعد اُن کی
روپوشی کا کیا بنا اس کے بارے میں مخدوم کچھ نہیں
کہتے تھے۔ وہ جہاں خوش مذاقی اور شگفتہ مزاجی کا
پیکر تھے وہیں عقیدے کے معاملے میں بے حد
سنجیدہ ہو جاتے تھے۔ ہم نے اکثر دیکھا کہ وہ ہنستے
کھیلتے سیٹی بجاتے خوش خوش اورینٹ ہوٹل
آتے مگر ٹیبل پر بحث کے بعد جب جانے لگتے
تو مٹھیاں بھنچی ہوتی تھیں، منہ سے کف نکل رہا
ہوتا تھا اور آنکھوں سے شعلے برس رہے ہوتے
تھے۔ اس اعتبار سے مخدوم بہت احتیاط سے
برتنے کی چیز تھے۔ ذرا کوئی چوک گیا اور مخدوم
کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

اُن کے انتقال سے دو برس پہلے کی بات
ہے۔ حیدرآباد میں ایک عظیم الشان مشاعرہ برپا

پھر جب ہم نے شعور سنبھالنا شروع کیا تو احساس ہوا کہ مخدوم بڑی تیزی سے ہمارے شعور کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ پھر حصہ بنتے بنتے وہ مکمل شعور ہی بن گئے۔ مخدوم سے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ میرے ایک دوست مخدوم کے مجموعہ کلام "سرخ سویرا" کو رحل پر رکھ کر نہ صرف پڑھا کرتے تھے بلکہ مطالعے کے دوران میں آگے اور پیچھے جھولتے بھی تھے۔ ہے کوئی شاعر جس کا کلام اس طرح پڑھا گیا ہو؟

صاحبو! وہ بھی کیا دن تھے۔ ہر صبح بستر سے جاگتے ہی آسمان پر نظر جاتی تھی کہ کہیں "سرخ سویرا" تو نہیں آ گیا۔ جی چاہتا اپنے ملک میں بھی ایک عدد "انقلاب روس" لے آئیں ___ انقلاب کے انتظار میں سگریٹیں پی پی کر کئی راتیں گزاریں۔ ہمارا سوشلزم وہی تھا جو مخدوم اور فیض کی شاعری، کرشن چندر کے افسانوں، سجاد ظہیر اور سردار جعفری کی تحریروں کے وسیلے سے ہم تک پہنچا تھا۔ گویا یہ خالصتاً "اردو سوشلزم" تھا۔ مگر ہم حیدرآبادیوں کے لیے مخدوم صرف شاعر اور دانشور نہیں تھے بلکہ بہت کچھ تھے۔ مخدوم کی زیرِ زمین رہنے کی عادت کی وجہ سے اُن کی شخصیت کے اطراف ایک عجیب سا سحر پیدا ہو گیا تھا۔ یار لوگوں نے اُن کے بارے میں باتیں بھی کچھ ایسی ہی پھیلا رکھی تھیں کہ کبھی کبھی مخدوم ایک مافوق الفطرت شے دکھائی دیتے تھے، کہا جاتا تھا کہ مخدوم بیک وقت چار مختلف مقامات پر موجود رہتے ہیں۔ اگر چار بجے ورنگل میں مزدوروں کے ایک خفیہ جلسہ سے خطاب کر رہے ہیں تو ٹھیک اُسی وقت نلگنڈہ میں ایک زمیندار کی زمین بے زمین کسانوں میں بانٹ رہے ہیں، اور پھر ٹھیک اسی سمے حیدرآباد کے ایک محلہ میں اپنے ایک دوست کو اپنی تازہ نظم سنا رہے ہیں ___ اور پھر اُسی وقت ___ اب خیر جانے بھی دیجیے ایسی باتیں کہاں تک سنائی جائیں۔ مخدوم کے بارے میں اس قسم کے انکشافات کو سُن کر ہمارے کمسن اور نوخیز خون کی جو حالت ہوتی ہوگی اس کا اندازہ آپ خود بھی لگا سکتے ہیں، خون رگوں میں اُبلا پڑتا تھا جسے بعد میں مخدوم کے کلام کے ذریعے ہی ٹھنڈا کیا جاتا تھا۔ علاج بالمثل اسی کو کہتے ہیں۔ اُس وقت تک مخدوم کو بہت دیکھا تھا حالانکہ اُن کے ہر جگہ (OMNI PRESENT) ہونے کی اتنی ساری افواہیں سُن رکھی تھیں۔

پھر یوں ہوا کہ مخدوم جب قید سے رہا ہوئے تو ہمیں اطلاع ملی کہ وہ شاہ آباد میں مزدوروں کے ایک جلسے سے خطاب کرنے کے لیے آرہے ہیں۔ اُن دنوں میں گلبرگہ انٹرمیڈیٹ کالج میں پڑھتا تھا۔ جس شاعر کا کلام اپنے لیے وظیفہ تھا اور جس کی تصویر سدا دل کے آئینہ میں رکھی رہتی تھی اُس کے شاہ آباد آنے کی اطلاع ملی تو رگوں میں خون کچھ اس زور سے اُبلا کہ میں اور میرا وہ دوست جو "سرخ سویرا" کو رحل پر رکھ کر پڑھا کرتا تھا اسٹیشن کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ معلوم ہوا کہ شاہ آباد کی طرف جانے والا مدراس میل ابھی جا چکا ہے، انکوائری سے پوچھا کہ شاہ آباد کا یہاں سے کتنا فاصلہ ہے۔ جواب ملا "۲۵ کلومیٹر"۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے آج عشق، آتشِ نمرود میں کود پڑے گا اور ۲۵ کلومیٹر کا فاصلہ پیدل طے کرے گا۔ اپنے جنون کی کہاں تک تشہیر کی جائے۔ یہ ہماری زندگی کی پہلی اور آخری "لانگ مارچ" تھی۔ مگر شاہ آباد پہنچے تو معلوم ہوا کہ مخدوم آئے بھی اور چلے بھی گئے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ماتھے پیٹ کر چپ ہو رہے۔ مگر مخدوم مافوق الفطرت شے تو تھے ہی۔ انھیں غالباً کسی غیبی طاقت نے بتا دیا تھا کہ گلبرگہ میں دو رو میں اُن سے ملنے کے لیے بیتاب ہیں، لہٰذا پندرہ دن بعد مخدوم گلبرگہ چلے آئے۔ مزدوروں کے کسی جلسے کو مخاطب کرنے۔ جلسے کے بعد کالج کے نوجوانوں نے اُنھیں گھیر لیا۔ مجھے یاد ہے وہ پورے چاند کی رات تھی۔ ایسا روشن چاند ہم نے زندگی میں پھر کبھی نہیں دیکھا۔ گلبرگہ کے مومن پورہ میں ایک بزرگ کے مزار کے سامنے ایک چبوترے پر مخدوم ہم نوجوانوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ آدھی رات بیت چکی تھی اور مخدوم ہم سب کو کلام سُنا رہے تھے۔ "سرخ سویرا" تو ہمیں زبانی یاد تھا ہی لہٰذا ہم نے کہا "مخدوم بھائی اپنا کوئی غیر مطبوعہ کلام سنائیے"۔ بولے "میں غیر مطبوعہ کلام نہیں کہتا۔ ہمیشہ مطبوعہ کہتا ہوں"۔

پھر میں حیدرآباد آیا۔ مخدوم سے ان گنت ملاقاتیں ہوتیں۔ پھر یوں ہوا کہ کئی برس بعد ایک دن میں، پروفیسر حسن عسکری اور مخدوم حیدرآباد کے ویکاجی ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ مجھے مخدوم سے ملنے کا وہ پہلا ادھورا اشتیاق یاد آیا۔ میں نے مخدوم سے کہا "مخدوم بھائی! آپ کو پتہ نہیں کہ کئی برس پہلے آپ سے ملنے کے لیے میں اور میرے ایک ساتھی نے گلبرگہ سے شاہ آباد تک پیدل سفر کیا تھا"۔

یہ سنتے ہی نہایت رازداری کے انداز میں بولے "اچھا تو آپ ملو۔ بتاؤ کیا کام تھا تمھیں مجھ سے؟ کوئی خاص بات تھی کیا؟"

مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا "مخدوم بھائی! اب تو مجھے یاد نہیں رہا کہ میں اُس وقت آپ سے کیوں ملنا چاہتا تھا۔ زندگی کے سفر میں بہت سی باتیں، بہت سی خواہشیں اور بہت سے کام یونہی ادھورے ہو جاتے ہیں"۔

بولے "یاد کر کے بتانا۔ تمہارا حافظہ خاصا

کمزور ہوتا جارہا ہے۔ اور ہاں آئندہ کبھی پیدل چلنے کی غلطی نہ کرنا۔" یہ کہہ کر مخدوم نے زوردار قہقہہ لگایا (مجھے آج تک پتہ نہیں چل سکا کہ مخدوم نے یہ قہقہہ مجھ پر لگایا تھا یا اپنے آپ پر۔ بعض قہقہوں کے مبدے کا سراغ لگانا بہت دشوار ہوتا ہے)

اپنی بات کو ختم کرکے مخدوم نے مجھ سے اور حسن عسکری سے زوردار مصافحے کیے۔ اُن کی عادت تھی کہ جب بھی کوئی چبھتا ہوا فقرہ کہتے، جو وہ اکثر کہتے تھے اور مذاق کی کوئی بات کہتے، جو وہ اکثر کہتے تھے تو مخاطب سے مصافحہ ضرور کرلیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب بھی مخدوم روبرو ہوتے تو میں بائیں ہاتھ سے سگریٹ پیتا تھا اور دائیں ہاتھ کو مصافحے کے لیے ریزرو رکھتا تھا۔ ایک بار مجھے اور مخدوم کو ایک ادبی تقریب میں شرکت کے لیے بمبئی جانا پڑگیا۔ حیدرآباد کے اسٹیشن پر میں پہنچا تو میرے ایک ہاتھ میں اٹیچی کیس تھا اور دوسرے میں ہولڈال۔ مخدوم نے مجھے دیکھتے ہی مصافحہ والا فقرہ کہہ دیا اور میں نے اٹیچی کیس کو نیچے رکھ کر اُن سے مصافحہ کیا۔ پھر انھوں نے تابڑتوڑ کئی بار مصافحہ فقرے کہہ کر مجھ سے اٹیچی کیس کو نیچے رکھوایا میں اُن کے فقروں سے ایسا الرجک ہوا کہ ابھی وہ آدھا فقرہ ہی کہتے تھے کہ میں اٹیچی کیس کو نیچے رکھ دیتا تھا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر بولے "بیٹا! اب تو تم میرے ایسے فقروں پر بھی اٹیچی کیس نیچے رکھنے لگے ہو جن پر میں مصافحہ نہیں کرتا۔ تم خود ورزش کرنا چاہتے ہو تو کرو۔"

یہ کہہ کر مجھے اٹیچی کیس نیچے رکھنے کا حکم دیا۔ مصافحہ کیا اور بولے "خبردار جواب کبھی اٹیچی کیس نیچے رکھا۔" اور اس کے بعد پھر مصافحے کی منزل آگئی۔

مخدوم کی بذلہ سنجی اور شگفتہ مزاجی کے بے شمار واقعات مجھے یاد ہیں۔ اپنا مذاق آپ اُڑانے میں اُن کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ایک بار علی الصبح اورینٹ ہوٹل میں پہنچ کر بیرے سے پوچھا "نہاری ہے؟"

بیرا بولا "نہیں ہے۔"

مخدوم نے پوچھا "آملیٹ ہے؟"

بیرا بولا "نہیں ہے"

مخدوم نے پوچھا "کھانے کے لیے کچھ ہے؟"

بیرا بولا "اس وقت تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

اس پر مخدوم بولے "یہ ہوٹل ہے یا ہمارا گھر کہ یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔"

اُن کی عادت تھی کہ جب بھی کوئی نئی غزل کہتے تو اُسے سُنانے کے لیے دوڑ پڑتے تھے۔ اپنی اس عادت سے متعلق خود ہی ایک لطیفہ سُنایا کرتے تھے۔ ایک دن اُن سے غزل ہوگئی تو فوراً اورینٹ ہوٹل چلے آئے کہ کوئی مائی کا لال مل جائے تو اُسے غزل سنائیں۔ یہاں کوئی نہ ملا تو "صبا" کے دفتر چلے گئے۔ وہاں بھی کوئی نہ ملا۔ تھک ہار کے چائینز بار میں چلے گئے۔ بار کے بیرے قاسم کو بلا کر کہا "دو پیگ وہسکی لے آؤ"۔ قاسم وہسکی لے آیا تو اُس سے بولے "بیٹھو اور وہسکی پیو۔" قاسم شرماتا رہا مگر وہ مُصر رہے۔ اُس نے کھڑے کھڑے وہسکی پی لی۔ پھر بولے "دو پیگ وہسکی اور لے آؤ۔" دوسرے دور میں بھی انھوں نے قاسم کو وہسکی پلائی۔ پھر تیسرا دور چلا۔ اس کے بعد مخدوم نے قاسم سے کہا۔

"اچھا قاسم اب میرے سامنے بیٹھو۔ میں تمہیں اپنی تازہ غزل کے کچھ شعر سُنانا چاہتا ہوں۔" یہ سُنتے ہی قاسم نے کہا "صاحب! آپ بہت پی چکے ہیں۔ آپ کی حالت غیر ہورہی ہے۔ چلیے میں آپ کو گھر چھوڑ آؤں۔"

مخدوم کہا کرتے تھے کہ اپنی ہوشمندی کے ہزار ثبوت پیش کرنے کے باوجود قاسم نے اُس رات اُن کی غزل نہیں سنی یہ لطیفہ سُناکر خود ہی ہنستے تھے اور مخاطب سے زوردار مصافحہ کرتے تھے۔

یہ لطیفہ بھی مخدوم ہی سُنایا کرتے تھے جو اُن کے دورِ روپوشی سے متعلق ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک بار یہ اپنے ایک برہمن دوست کے گھر روپوش ہوگئے۔ ان کا برہمن دوست بھی پارٹی کا ممبر تھا۔ اُن کے دوست نے اُن سے کہہ رکھا تھا کہ "مخدوم بھائی میرے والد بڑے قدامت پرست ہیں۔ اسی لیے اُن پر کبھی یہ ظاہر نہ کرنا کہ آپ برہمن نہیں ہیں۔ اپنی برہمنیت کی لاج رکھنا۔"

ایک دن اُن کے دوست کے والد نے مخدوم سے کہا "بھئی تم لوگ کمیونسٹ پارٹی میں ہو۔ تمہارے دھرم کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کہیں تم گوشت تو نہیں کھاتے؟"

مخدوم نے جھٹ سے کہا "لاحول ولاقوة۔ یہ آپ نے کیسے سوچ لیا کہ میں گوشت کھاتا ہوں۔ نعوذ باللہ یہ تو مجھ پر سراسر تہمت ہے۔"

اس نان ویجیٹیرین جملے کے بعد اُن کی روپوشی کا کیا بنا اس کے بارے میں مخدوم کچھ نہیں کہتے تھے۔ وہ جہاں خوش مذاقی اور شگفتہ مزاجی کا پیکر تھے وہیں عقیدے کے معاملے میں بے حد سنجیدہ ہوجاتے تھے۔ ہم نے اکثر دیکھا کہ وہ ہنستے کھیلتے سیٹی بجاتے خوش خوش اورینٹ ہوٹل آتے مگر ٹیبل پر بحث کے بعد جب جانے لگتے تو مٹھیاں بھنچی ہوتی تھیں، منہ سے کف نکل رہا ہوتا تھا اور آنکھوں سے شعلے برس رہے ہوتے تھے۔ اس اعتبار سے مخدوم بہت احتیاط سے برتنے کی چیز تھے۔ ذرا کوئی چوک گیا اور مخدوم کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

اُن کے انتقال سے دو برس پہلے کی بات ہے۔ حیدرآباد میں ایک عظیم الشان مشاعرہ برپا



کچھ قوسِ قزح سے رنگت لی، کچھ نور چرایا تاروں سے
بجلی سے تڑپ کو مانگ لیا، کچھ کیف اڑایا بہاروں سے
پھولوں سے مہک، شاخوں سے لچک اور منڈووں سے ٹھنڈا سایہ
جنگل کی کنواری کلیوں نے دے ڈالا اپنا سرمایہ
بدمست جوانی سے چھینی کچھ بے فکری، کچھ الھڑ پن
پھر حسنِ جنوں پرور نے دی آشفتہ سری، دل کی دھڑکن
بکھری ہوئی رنگیں کرنوں کو آنکھوں سے چُن کر لاتا ہوں
فطرت کے پریشاں نغموں سے پھر اپنا گیت بناتا ہوں
فردوسِ خیالی میں بیٹھا اک بُت کو تراشا کرتا ہوں
پھر اپنے دل کی دھڑکن کو پتھر کے دل میں بھرتا ہوں

تھک کے رہ جاتے ہیں استدلال کے جس جا قدم
ٹوٹ جاتا ہے پہنچ کر جس جگہ منطق کا دم
خوابِ عقل و ہوش کی مجہول تعبیروں سے دُور
فلسفی کی "کس طرح" اور "کیوں" کی زنجیروں سے دُور
میرے رہنے کا جہانِ جاودانی اور ہے
دل کی دنیائے نہاں کی زندگانی اور ہے
خود تراشیدہ بُتِ ناز آفریں میرا وجود
میری ذاتِ پاک مسجودِ جہانِ ہست و بود
دوسرا کوئی نہیں رہتا جہاں رہتا ہوں میں
اپنے سیلابِ خودی میں آپ ہی بہتا ہوں میں
میرے سجدوں کے لیے ہی وقف ہے میری جبیں
میری اقلیمِ انا میں دوسرا کوئی نہیں

تھا۔ مخدوم ڈائس پر بیٹھے تھے اور ایک شاعرہ مائک پر کلام سُنا رہی تھیں۔ ڈائس کے نیچے ایک لحیم شحیم شخص نشہ میں دھت بیٹھا شاعرہ کو گھور رہا تھا۔ پھر اُس کے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ اُس نے اچانک شاعرہ کی طرف چھلانگ لگائی۔ مخدوم نے بھی چیتے کی سی پھُرتی کے ساتھ اُس شخص کی طرف چھلانگ لگائی۔ سیکنڈوں میں اُس شخص کو ڈائس سے نیچے گرایا اور اُس کے سینے پر سوار ہو گئے۔ میں کیسے بتاؤں کہ بیس پچیس برس بعد مخدوم کے اندر چھپے ہوئے انقلابی کو پھر ایک بار سرگرمِ عمل دیکھ کر کتنی خوشی ہوئی۔ لوگوں نے مخدوم کی اس ادا کی داد بھی اُسی طرح دی جس طرح اُن کے کلام پر دیا کرتے تھے۔

وہ چھوٹوں کے ساتھ بہت شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ حیدرآباد کے کتنے ہی ادیبوں اور شاعروں کی ذہنی تربیت انھوں نے کی۔ سلیمان اریب، عزیز قیسی، اقبال متین۔ وحید اختر۔ جیلانی بانو، انور معظم، آمنہ ابوالحسن، شاذ تمکنت۔ عاتق شاہ، عوض سعید اور مغنی تبسم یہ سب مخدوم سے متاثر تھے۔ وہ میری بھی ہر قدم پر ہمت افزائی کرتے تھے۔ چنانچہ مجھے "مسخرا" کہہ کر پکارتے تھے۔ اب اس سے زیادہ کوئی میری ہمت افزائی کرکے دکھا دے۔ اُردو کے مسخروں یعنی مزاح نگاروں کی پہلی کل ہند کانفرنس ہوئی تو اس کا افتتاح اُنھوں نے ہی فرمایا۔ میرے مضامین کے پہلے مجموعے کی رسمِ اجرا بھی اُنھوں نے ہی ازراہ تمسخر انجام دی تھی۔

ادیبوں سے وہ اُلجھتے بھی تھے۔ اس معاملے میں وحید اختر پر اُن کی بڑی نظرِ عنایت رہا کرتی تھی۔ کبھی کبھی دوستوں کو جان بوجھ کر چھیڑتے بھی تھے۔ ایک رات سلیمان اریب کے گھر پر حیدرآباد کے مشہور آرٹسٹ سعید بن محمد سے کہا "شاعری، مصوری سے کہیں زیادہ طاقتور میڈیم ہے۔"

سعید بن محمد نے برش بکف جواب دیا "مصوری اور شاعری کا کیا تقابل۔ شاعری میں تم جو چیز بیان نہیں کر سکتے ہم رنگوں اور فارم میں بیان کر دیتے ہیں۔ تم کہو تو میں ساری اُردو شاعری کو پینٹ کرکے رکھ دوں۔"

مخدوم بولے "ساری اُردو شاعری تو بہت بڑی بات ہے۔ تم اس معمولی مصرعے کو ہی پینٹ کرکے دکھا دو ؎

پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے"

سعید بن محمد بولے "یہ کونسی مشکل بات ہے۔ میں کینوس پر گلاب کی ایک پنکھڑی بنا دوں گا۔"

بولے "پنکھڑی گلاب کی تو پینٹ ہو گئی مگر "سی" کو کیسے پینٹ کرو گے؟"

سعید بن محمد بولے "سی" بھی بھلا کوئی پینٹ کرنے کی چیز ہے۔"

مخدوم بولے "مصرعے کی جان تو "سی" ہی ہے، سعید آج میں تمھیں جانے نہیں دوں گا جب تک تم "سی" کو پینٹ نہیں کرو گے۔"

یہ سُنتے ہی سعید بن محمد وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

مجھے اس وقت مخدوم کا وہ مضمون یاد آ رہا ہے جو اُنھوں نے حیدرآباد کے اُردو ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں بہ زبان انگریزی "السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا" میں لکھا تھا۔ مضمون کا چونکہ پہلے سے اعلان ہو چکا تھا اس لیے جس دن ویکلی کا شمارہ حیدرآباد پہنچا اُردو ادیبوں اور شاعروں نے دھڑا دھڑ اس کی کاپیاں خرید لیں۔ نیوز پیپر اسٹال والا سخت حیران کہ اُردو شاعروں کو آج کیا ہو گیا کہ انگریزی کا رسالہ خریدے چلے جا رہے ہیں۔ میں عابد روڈ سے گزر رہا تھا کہ حیدرآباد کے ایک بزرگ شاعر ویکلی کا شمارہ ہاتھ میں پکڑے میرے پاس



آئے اور کہنے لگے "بھئی! اس میں مخدوم کا مضمون کہاں ہے بتاؤ؟"

میں نے مخدوم کا مضمون نکال کر بتایا تو بولے "اچھا اب یہ بتاؤ کہ اس میں میرا نام کہاں ہے؟" پہلے تو میں بڑی دیر تک اپنا نام مضمون میں تلاش کرتا رہا۔ یہ نہ ملا تو شاعر موصوف کا نام تلاش کرنے لگا۔ حسب توقع یہ بھی وہاں موجود نہ تھا۔ مگر اسی بیچ مجھے ایک شرارت سوجھی۔ میں نے سلیمان اریب کے نام کے نیچے ایک لکیر کھینچتے ہوئے شاعر موصوف سے کہا "لیجیے قبلہ! یہ رہا آپ کا نام۔"

شاعر موصوف ویکلی کے شمارے کو سینے سے لگائے خوش خوش چلے گئے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد مخدوم انھیں مل گئے تو انھوں نے بڑی احسان مندی کے ساتھ مضمون میں اُن کا نام شامل رکھنے کا شکریہ ادا کیا۔

مخدوم نے کہا "قبلہ! آپ کو کس نے بتایا کہ آپ کا نام مضمون میں شامل ہے۔"

وہ بولے "ابھی ابھی مجتبیٰ نے مجھے بتایا ہے۔"

مخدوم بولے "مولانا! مجتبیٰ کو بھی اتنی ہی انگریزی آتی ہے جتنی کہ آپ کو آتی ہے۔ جائیے جائیے۔ آپ کا نام میں نے نہیں لکھا ہے۔"

اس مضمون کے بعد حیدرآباد کے کئی نوجوان ادیبوں کو مخدوم سے شکایت ہوگئی۔ ایک دن اورینٹ ہوٹل میں یہی مضمون زیرِ بحث تھا۔ مخدوم بولے بھئی! ادیب اور شاعر کو اپنے نام اور شہرت سے بے نیاز رہنا چاہیے۔ اُس کا نام یا کلام کہیں چھپے یا نہ چھپے اُسے تو بے تعلق رہنا چاہیے۔" اس کے بعد بحث ختم ہوگئی اور دوسرے مسائل زیرِ بحث آگئے۔ مگر اسی بیچ مجھے پھر ایک شرارت سوجھی، میں نے بالکل ہی بے نیاز ہو کر کہا "مخدوم بھائی! آپ کی ایک نظم دلی کے ایک رسالے کے تازہ شمارے میں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔"

پوچھا "کونسے رسالے میں؟"

میں نے کہا "مجھے نام تو یاد نہیں مگر عابد روڈ کے بس اسٹاپ والے بک اسٹال پر ابھی ابھی میں یہ رسالہ دیکھ کر آرہا ہوں۔"

مخدوم تھوڑی دیر تو انجان اور بے تعلق بنے رہے۔ پھر اچانک کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے جیسا کہ اُن کی عادت تھی۔ پھر بولے "اچھا اب چلتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئے۔

میرے ساتھ کچھ احباب بھی بیٹھے تھے۔ میں نے کہا "مخدوم بھائی یہاں سے سیدھے بک اسٹال پر جائیں گے۔ چلو ہم بھی چلیں۔"

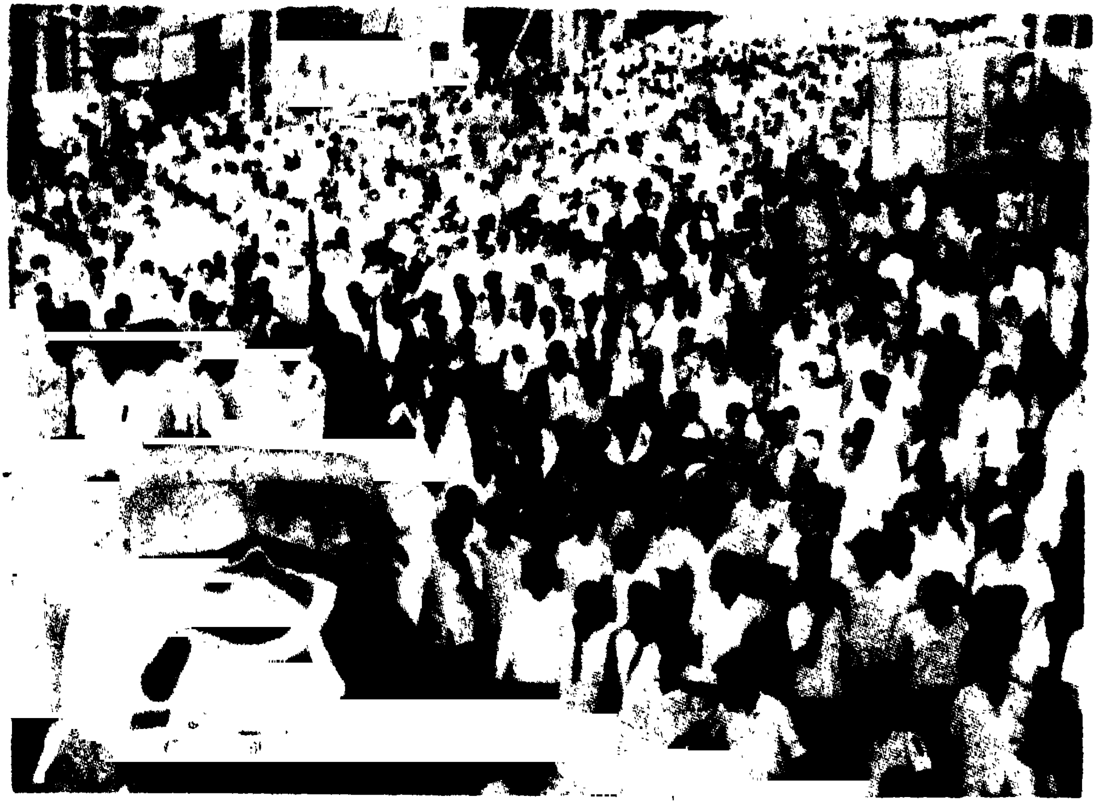
ہم لوگ بک اسٹال پر پہنچے تو مخدوم سچ مچ وہاں موجود تھے اور رسالوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ جونہی ہم پر اُن کی نظر پڑی۔ انھوں نے فلک شگاف قہقہہ لگایا اور بولے "کیوں بے مسخرے۔ ہم سے بدمعاشی کرتا ہے۔"

میں نے کہا "مخدوم بھائی میں تو صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ شاعر اپنے کلام سے کس حد تک بے نیاز رہ سکتا ہے۔"

مخدوم کو حیدرآباد سے بے پناہ پیار تھا جسے وہ ہمیشہ "وطنِ مالوف" کہا کرتے تھے۔ حیدرآباد مخدوم کے اندر تھا اور مخدوم حیدرآباد کے اندر۔ حیدرآباد کی گلی گلی میں اُن کے چرچے تھے۔ حیدرآبادیوں نے اُنھیں ٹوٹ کر چاہا بھی۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے تو اپنے گھر کا نام ہی "چنبیلی کا منڈوا" رکھ چھوڑا تھا جو مخدوم کی ایک مشہور نظم کا عنوان ہے۔ لوگ اپنے گھروں کے نام رکھتے ہیں ڈاکٹر گوڑ نے اپنے گھر کا عنوان رکھا تھا۔ اگرچہ اپنے گھر میں معنویت پیدا کرنے کے لیے چنبیلی کی بیل بھی لگا رکھی تھی مگر اب بھی اُن کے گھر میں "چنبیلی کا منڈوا" کم اور مخدوم کی نظم زیادہ نظر آتی ہے۔

اک چنبیلی کے منڈوے تلے
میکدے سے ذرا دور، اُس موڑ پر
دو بدن
پیار کی آگ میں جل گئے
پیار حرفِ وفا
پیار اُن کا خدا
پیار اُن کی چتا
دو بدن
اوس میں بھیگتے، چاندنی میں نہاتے ہوئے
جیسے دو تازہ رُو، تازہ دم پھول پچھلے پہر
ٹھنڈی ٹھنڈی سبک رَو، چمن کی ہوا
صرفِ ماتم ہوئی
کالی کالی لٹوں سے لپٹ، گرم رخسار پر
ایک پل کے لیے رُک گئی
ہم نے دیکھا انھیں
دن میں اور رات میں
نور و ظلمات میں
مسجدوں کے مناروں نے دیکھا انھیں
مندروں کے کواڑوں نے دیکھا انھیں
میکدے کی دراڑوں نے دیکھا انھیں
از ازل تا ابد
یہ بتا چارہ گر
تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے؟
کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے
اِک چنبیلی کے منڈوے تلے
میکدے سے ذرا دُور، اُس موڑ پر
دو بدن
پیار کی آگ میں جل گئے
چارہ گر!

(مخدوم)



حیات لے کے چلو، کائنات لے کے چلو — چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

مخدوم کے جنازے میں ہزاروں لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ ایسا جنازہ کسی شاعر اور وہ بھی اُردو شاعر کو بھلا کہاں نصیب ہوگا۔

وہ ڈسپلن کے بڑے پابند تھے۔ سارا دن پارٹی کا کام کرتے اور شام کو تھوڑا سا وقت دوستوں میں گزارتے تھے۔ جہاں احساس ہوا کہ وقت ضائع ہو رہا ہے جھٹ سے اُٹھ جاتے تھے اور محفل سے غائب۔ وہ دُنیا سے گئے بھی اسی طرح یعنی ایک دن جھٹ سے چلے گئے۔

آخری مرتبہ جب وہ دہلی جا رہے تھے تو مجھ سے روزنامہ "سیاست" کے دفتر پر ملے۔ میں نے پوچھا "مخدوم بھائی! واپسی کب ہوگی؟" بولے "یہی دو چار دن میں آجاؤں گا۔" وہ بات کے بڑے پکے تھے۔ لہٰذا حیدرآباد واپس آئے مگر کچھ اس شان کے ساتھ کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے کندھوں پر سوار تھے۔ سیاسی کامرانیوں کے بعد مخدوم کا ڈاکٹر گوڑ کے کندھے پر سوار ہونا یا مخدوم کے کندھے پر ڈاکٹر گوڑ کا سوار ہونا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ مگر اس بار وہ ڈاکٹر گوڑ کے کندھے پر سوار ہوئے تو نیچے نہیں اُترے ہمیشہ کے لیے سب کے دلوں میں ایک زخم بن کر اُتر گئے۔ مخدوم کے جنازے میں ہزاروں لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ ایسا جنازہ کسی شاعر اور وہ بھی اُردو شاعر کو بھلا کہاں نصیب ہوگا۔ اور یوں وہ پھر "زیرِ زمین" چلے گئے۔ مگر اس بار وہ "زیرِ زمین" جاتے ہوئے وہ اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لے گئے۔ اپنا سب کچھ دُنیا کو سونپ گئے۔ اپنی شاعری، اپنا عقیدہ، اپنی باتیں، اپنے لطیفے، اپنی یادیں۔ غرض سب کچھ۔

مخدوم کے بارے میں اب سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ مخدوم ایک انسان نہیں تھے۔ جیتا جاگتا سانس لیتا ہوا شہر تھے۔ اس شہر کی ہم نے برسوں سیر کی۔ ہم سب اسی شہر میں آباد تھے۔

مخدوم کے انتقال کے بعد پہلی بار احساس ہوا کہ "غریب الوطنی" کس کو کہتے ہیں۔ اس شہر میں کتنی سڑکیں تھیں، کتنی گلیاں تھیں، کتنے موڑ تھے اور یہ سب راستے انسانیت اور سچائی کی طرف جاتے تھے۔ ●●

دو غزلیں

رئیس امروہوی

مانک جی اسٹریٹ، گارڈن ایسٹ کراچی ۳ (پاکستان)

★

وقت تیغِ تیز ہے یوں ہی سہی
زندگی خوں ریز ہے یوں ہی سہی

ہم نشاط اندوز ہیں؟ ہوں گے ضرور!
مے نشاط انگیز ہے یوں ہی سہی

ناصحِ ناداں! کسی کا التفات
شہدِ زہر آمیز ہے یوں ہی سہی

موت ہے بے حاصلی پر مطمئن
کشتِ جاں زرخیز ہے یوں ہی سہی

دل ہے پہلے سے قیامت آفریں
غم قیامت خیز ہے یوں ہی سہی

کذب کیسا؟ حرفِ صدق آموز بھی
مصلحت آمیز ہے یوں ہی سہی

جانِ شیریں کے لیے فرہاد بھی
خسروِ پرویز ہے یوں ہی سہی

روح پر یلغارِ آگاہی رئیس
حملۂ چنگیز ہے یوں ہی سہی

اُن کا نطقِ دل آویز یاد آگیا
لہجۂ طنز آمیز یاد آگیا

ایک بجلی سی آنکھوں میں لہرا گئی
حُسنِ جذبات انگیز یاد آگیا

سر اٹھایا جو سرمستیِ شوق میں
قدِ بالا بلا خیز یاد آگیا

میں جو اِس حال میں مُسکرانے لگا
وہ تبسم دل آویز یاد آگیا

عالمِ لُطف میں مُسکراتے ہوئے
غمزۂ چشمِ خونریز یاد آگیا

غمزۂ چشمِ خونریز کے ساتھ ہی
عشوۂ مہر آمیز یاد آگیا

یار بے مہر اور مہرباں اس طرح؟
جیسے شیریں کو پرویز یاد آگیا

پھر رئیس ان کے نطقِ دل آویز کا
لہجۂ طنز آمیز یاد آگیا



اقبال صدی پبلیکیشنز کی پیشکش

اقبالؒ کی شخصیت، ان کی شاعری اور ان کے فلسفے پر پانچ فکرانگیز کتابیں

خطوطِ اقبالؒ

اپنے عہد کی اہم شخصیتوں کے نام علامہ اقبال کے ایک سو گیارہ خطوط جواب تک مدوّن ہوکر منظرِ عام پر نہیں آتے تھے۔ اقبال کی شخصیت کے ساتھ ساتھ اُن کے عہد کو سمجھنے کے لیے بھی یہ خطوط ایک بڑا وسیلہ ہیں۔ مرتب: رفیع الدین ہاشمی جن کے حواشی نے کتاب کی افادیت اور بڑھادی ہے۔

قیمت :- تیس روپے

اقبالؒ، ایک تجزیاتی مطالعہ

علامہ اقبالؒ کے نظامِ فکر کے مختلف اہم پہلوؤں کا تجزیہ۔ لکھنے والوں میں پرانے اور نئے کئی اہم نقادوں کے نام شامل ہیں۔ ہر نقاد نے کسی ایک پہلو پر قلم اٹھایا ہے اور اس کے تمام مضمرات سے عالمانہ بحث کی ہے۔

مرتب: سیّد معراج نیّر۔ قیمت: پندرہ روپے

سفرنامۂ اقبالؒ

علامہ اقبالؒ نے متعدد غیر ملکی سفر کیے تھے اور اس سیاحت نے ان کے فکر و فن پر جو اثرات مرتب کیے، اُن کی اہمیت کا اعتراف سبھی کو ہے۔ اس کتاب میں ان کے ہر سفر کی تفصیل کچھ ان کی اور کچھ ان کے قریبی دوستوں کی زبانی بیان ہوئی ہے۔ انتہائی معلومات آفرین اور انتہائی دلچسپ کتاب ـــــ مرتب: حق نواز۔

قیمت: پچیس روپے

قرآن اور اقبالؒ

علامہ اقبالؒ کے افکار کا بنیادی سرچشمہ قرآنی تعلیمات ہیں ـــ یہ کتاب اس خیال کی مدلّل توثیق کرتی ہے اور اقبالؒ کے خطوط، اُن کے خطبات اور ان کی شاعری میں جہاں جہاں قرآن مجید کے حوالے آئے ہیں وہ سب فاضل مرتب ابو محمد مصلح نے اس میں یکجا کردیے ہیں۔

قیمت: اٹھارہ روپے

اقبالؒ شخصیت اور شاعری

علامہ اقبالؒ کی حکیمانہ شخصیت اور شاعری پر علامہ اقبالؒ کے سب سے بڑے قدرشناس اردو کے عظیم ناقد پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مضامین کا مجموعہ جس کی قدر و قیمت کا اندازہ آپ اسے پڑھ کر ہی کر سکیں گے۔

قیمت: بارہ روپے

ہر کتاب ڈمائی سائز میں فوٹو آفسیٹ کے ذریعے سفید خوشنما کاغذ پر شائع کی گئی ہے۔

پانچ کتابوں کا مکمل سیٹ یا اپنی پسند کی کوئی بھی ایک کتاب منگائیے۔ خریداروں سے محصول ڈاک نہیں لیا جائیگا۔

بک سیلرز اور ایجنٹوں کو معقول کمیشن۔

تقسیم کار:- بیسویں صدی بک ڈپو، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اپنے مضبوط جبڑے میں پکڑ لیا۔ مہاراجہ چلایا۔ "پھول متی۔ گولی چلاؤ۔" مہارانی نے گولی چلائی مگر وہ گولی شیر کی بجائے مہاراجہ کو لگی۔ اور مہاراجہ وہیں شیر کے اوپر گر کر ڈھیر ہو گیا۔ یہ عمر میں پہلی بار تھا کہ مہارانی پھول متی کا نشانہ چوکا تھا ورنہ وہ تو ایسا نشانہ لگاتی تھی جو کبھی چوکتا نہیں تھا۔ تب جا کر مہارانی مچان پر سے نیچے اُتری مردہ مہاراجہ کی لاش پر گر پڑی اور لگی بین کرنے۔ بات یہ ہے کہ مہارانی بننے سے پہلے وہ ایک مشہور فلم سٹار تھی۔ جہاں ادھیڑ عمر کے مہاراجہ عشق کر بیٹھے تھے اور موتیوں کا نولکھا ہار پھول کماری کے گلے میں پہنا دیا تھا اور پھول کماری محل میں آکر مہارانی پھول متی بن گئی تھی اور اُس کا ایک فرضی شجرۂ نسب مہاراجہ کے جوتشی نے تیار کر دیا تھا جس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ بھی ایک راجہ کی بیٹی تھی جس کا سلسلہ سوریہ ونشی خاندان سے جا ملتا تھا۔ جب سے پھول متی نے فلمی دُنیا کو بھلا دیا تھا مگر میک اپ کے جتنے پینترے تھے وہ اُس کو آج بھی یاد تھے۔ بندوق چلانا اُس نے مہاراجہ سے محل میں آکر سیکھا تھا۔ مہاراجہ نے خود اُسے مشاق بندوقچی بنا دیا تھا۔ وہ اتنی مشاق ہو گئی تھی کہ اُڑتی چڑیا کو گرا سکتی تھی۔ اس لیے یہ ناممکن تھا کہ اُس کا نشانہ چوک گیا ہو۔ وہ وہیں لگا تھا جہاں وہ لگانا چاہتی تھی۔ یعنی شیر کو نہیں بلکہ مہاراجہ کو۔ شیر کو دوسری گولی مار کر اُس نے ہلاک کر دیا تھا۔ مگر کس کی ہمت تھی کہ کہہ سکے کہ مہارانی نے مہاراجہ کو مار ڈالا۔ کیونکہ اب مہاراجہ کے تخت و جائیداد کی وہی مالک تھی۔ اور ممکن ہے کہ واقعی گھبراہٹ میں مہارانی کا نشانہ چوک گیا ہو۔ کیونکہ اُس کے بین کرنے سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ سچ مچ اُسے مہاراجہ کی موت کا بہت افسوس ہے۔ اُن کو ایک ایکٹریس کے کمال کا کیا اندازہ تھا۔ •

پھول متی نے سنگھار پورا کیا۔ پھر خوشبودار سینٹ بغلوں میں اور کان کے پیچھے لگایا۔ پھر گھنٹی بجائی۔ فوراً ایک بوڑھا سیوک آیا اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا آگیا ہے، سرکار؟" گرنام سنگھ راجپوت نے دو مہاراجوں کو گود میں کھلایا تھا۔ اور اس تمام وقت میں اُس کی داڑھی سفید ہو گئی تھی۔

"ہمیں تمہارے جیسے وفادار اور مضبوط دل کے آٹھ آدمیوں کی ضرورت ہے۔" پھول متی نے جواب دیا۔

"جو آگیا ہو، سرکار۔" وفادار بوڑھے ملازم نے جواب دیا۔

اور تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا آٹھ ملازموں کو ساتھ لیے ہوئے۔

ایک تو مہارانی کا ملازم خاص تھا جو اُن کو وقت پر کھانا دیتا تھا۔ اور موٹر میں ڈرائیور کے پاس بیٹھ کر جاتا تھا۔ ہر کھانا اور شراب پہلے وہ چکھتا تھا۔ یہ اُس کا کام تھا۔ وہ بھی اصل راجپوت تھا۔ نام تھا سردار سنگھ۔

ایک ہٹے کٹے جسم کا مگر چھوٹے سے قد کا بوٹا سنگھ تھا جو مہارانی صاحبہ کا آبدار تھا۔ یعنی وقت بے وقت اُن کو پانی چاہیے تو فرج میں سے نکال کر دیتا تھا۔ ویسے بار کی چابیاں بھی اُس کے پاس رہتی تھیں اور شراب وہی پلاتا تھا۔ کوئی دعوت ہوتی تھی تو وہ مہارانی کی کرسی کے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑا رہتا تھا۔

ایک مہارانی کا خاص ڈرائیور جیکسن ٹامس تھا جو اُن کی امپالا چلاتا تھا جو مہارانی کی خاص گاڑی تھی اور جس پر وہ اس شان سے یونیفارم پہن کر بیٹھتا تھا کہ ڈرائیور نہیں اصل مالک ہی معلوم ہوتا تھا۔

مہارانی کے دو خاص نوکر تھے۔ ہمت سنگھ اور دلاور خاں۔ جو اُس کے باڈی گارڈ تھے۔ یہ پہلے مہاراجہ کے باڈی گارڈ ہوا کرتے تھے۔ اُن کے دیہانت کے بعد پھول متی کو ورثے میں ملے تھے۔ دونوں جیب میں پستول رکھتے تھے اور ذرا سا بھی کھٹکا ہو تو اُن کے پستول فوراً نکل آتے تھے۔ اُن کو کافی تنخواہ ملتی تھی۔ اور کہا جاتا تھا کہ جب تک وہ زندہ ہیں کوئی مہارانی کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔

مہارانی نے اُن سے کہا کہ اُن کے پستولوں کی آج ضرورت نہ ہو گی۔ وہ دونوں اپنے پستول مہارانی کے پاس رکھوا دیں۔

کسی قدر ہچکچاہٹ سے اُنھوں نے اپنے پستول مہارانی کی تحویل میں دے دیے۔ اور مہارانی نے نہایت اطمینان سے اُن کو اپنی لوہے کی سیف میں بند کر دیا۔

دو کہار تھے۔ رُلدو اور منگو۔ جو مہارانی کی پالکی اُٹھانے کے لیے مقرر تھے۔ یہ ذات کے اہیر تھے مگر پہلوان تھے اور چار چار من وزن اُٹھانے کے قابل تھے۔ صرف ایک بار اُن کی پالکی استعمال ہوئی تھی جب کہ پھول متی کی شادی مہاراجہ صاحب سے ہوئی تھی۔ لیکن اُن کو حکم تھا کہ اپنے آپ کو تیار رکھیں نہ جانے کس وقت مہارانی صاحبہ کو اُن کی خدمات کی ضرورت پڑ جائے۔ اس لیے اُن کا کام کھانا پینا اور اپنی پالکی کی دیکھ بھال تھا۔

آٹھواں آدمی دُبلا پتلا اور سوکھا تھا۔ کسی طرح بوجھ اُٹھانے کے قابل نہیں تھا۔ مگر اُس کو ساتھ رکھنا ضروری تھا کیونکہ وہ مہارانی کا راج جوتشی تھا۔ جس کی رائے کے بغیر مہارانی کوئی کام نہیں کرتی تھی۔

سب سے پہلے وہ نزار آدمی ہی بولا۔
"مہارانی جی! یہ سمے کسی گمبھیر کاریہ کے لیے اشبھ

آنکھیں

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب
آنکھ کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا
—— غالب

ہوتا ہے رازِ عشق و محبت انہیں سے فاش
آنکھیں زباں نہیں ہیں مگر بے زباں نہیں
—— اصغر گونڈوی

دل میں کیا کیا ہوس دید بڑھائی نہ گئی
روبرو اُن کے مگر آنکھ اٹھائی نہ گئی
—— حسرت موہانی

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا
جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں تھا
—— جگر مراد آبادی

آزاد تری آنکھیں، آنکھیں ہی نہیں ورنہ
آنکھیں ہوں تو قطرہ بھی دریا نظر آتا ہے
—— آزاد انصاری

مرسلہ: غلام قادر دلدار، اننت ناگ (کشمیر)

ہے۔ راہو اور کیتو دونوں کا ملن ہونے والا ہے جو کسی بھی راج کاریہ کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔"

مہارانی نے جواب دیا۔ "جوتشی جی یہ کاریہ تو آج ہی اسی وقت کرنا ہوگا۔ ورنہ ہمارے دشمن کل صبح ہم پر دھاوا بولنے والے ہیں۔ اگر ہم نے اپنے خزانے کو اس وقت کسی سورکشت جگہ نہ چھپایا تو کل وجے نگر کے سارے ہیرے جواہرات، سارا سونا چاندی جو پیڑھیوں سے راجے مہاراجوں نے اکٹھا کیا ہے اُس پر بھارتیہ سرکار قبضہ کرلے گی۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنی ساری دولت انکم ٹیکس والوں کو سنبھال دیں۔ ؟"

پھول متی راجوں مہاراجوں کی کٹھن بھاشا بولنے کی کوشش تو کرتی تھی لیکن پھر آخیر میں اُسے اپنی بمبئی کی فلمی دنیا کی سیدھی سادی زبان پر ہی اکتفا کرنا پڑتا تھا۔

اُس نے بڑے کڑے طریقے سے کہا۔

"چلو۔ اب یہ بکسے اٹھانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" یہ کہہ کر اُس نے بڑے ڈرامائی انداز میں (آخر وہ ایک ایکٹریس تھی!) ایک دروازہ کھولا جس کے پیچھے دس بارہ ٹرنک رکھے ہوتے تھے۔ ہر ٹرنک آہنی تھا اور اُس میں ایک بڑا تالا پڑا ہوا تھا۔ مہارانی نے چابیوں کا گچھا نکالا اور ایک صندوق کا تالا کھول کر اُس کا ڈھکنا کھول دیا تو سب کی آنکھیں ہیرے جواہرات سے چندھیا گئیں۔

"نہیں ہم بھارت سرکار کو اس سب پر قبضہ کرنے نہیں دیں گے۔"

مہارانی نے رانی جھانسی کی شان سے کہا کر جیسے مہارانی لکشمی بائی کہتی تھی۔ "ہم جھانسی پر انگریزوں کا قبضہ نہیں ہونے دیں گے۔" "ہم" اُس نے اس طرح کہا جیسے وہ لوگ آدمی اُس کے سیوک نہ ہوں بلکہ اس سازش میں اس کے برابر کے شریک ہوں! دوسرے لمحے میں لوہے کے صندوق کا پٹ بند ہو گیا اور اُس میں تالا لگا دیا گیا۔

دوسرا باب

۹ لاشیں

جب سب لوگ سامان اُٹھانے کو آگے بڑھے تو پالکی کے اہیروں کو یہ ٹرنک اُٹھانے میں دِقت نہ ہوئی۔ حکم ملتے ہی دو دو آدمیوں نے ایک ایک ٹرنک کو اُٹھا لیا۔ لیکن اس سب سامان کو کہاں لیجانا تھا۔ یہ اُن کو بھی نہیں معلوم تھا۔

مہارانی پھول متی نے حکم دیا۔ "اس سُرنگ سے چور دروازے کو جاؤ اور یہ سب صندوق ہماری ٹرک میں رکھ دو۔ اور خود اندر بیٹھ جاؤ۔ اور باقی احکام کے منتظر رہو۔"

ہانپتے کانپتے اتنے وزنی سامان کو اُٹھا کر سب لوگ لے چلے۔ دو پھیرے کرنے تھے۔ سُرنگ ایک گیراج میں جا کر نکلی جہاں وہ ٹرک کھڑی تھی جو شکار کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ اس لیے اُس میں چاروں طرف مضبوط آہنی جالی لگی ہوئی تھی۔ جب سامان اندر رکھ دیا گیا تو مہارانی کا حکم ملا۔ "اندر بیٹھ جاؤ تم بھی۔ یہ آخری حکم جیکسن کے لیے تھا۔" میں خود ڈرائیو کروں گی۔"

ڈرائیونگ سیٹ پر اکیلی پھول متی بیٹھی اور بیٹھنے سے پہلے ایک بجلی کا بٹن دبایا جس سے گیراج کا دروازہ آپ سے آپ اوپر اُٹھ گیا۔ یہ راستہ محل کے پیچھے نکلتا تھا۔ ٹرک باہر نکلتے ہی دروازہ آپ سے آپ بند ہو گیا۔ جیکسن کو اطمینان تھا کہ مہارانی بہت اچھی ڈرائیور ہے۔ چند ہی منٹ میں وہ اور اُن کی ٹرک سڑکوں پر ہوتی ہوئی شہر سے باہر نکل آئی۔ اور اب وہ ریگستان کی طرف پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھاگے جا رہے تھے۔

سڑک چھوڑ کر اب ٹرک ریگستان میں سے جا رہی تھی۔ کسی کی ہمت نہ تھی کہ مہارانی سے پوچھے ہم کہاں جا رہے ہیں۔ مگر بوڑھے جوتشی نے چاند اور ستاروں سے اندازہ لگا لیا کہ ٹرک اُتر پچھم کو جا رہی ہے۔ مگر اُس نے یہ کسی کو نہیں بتایا سب لوگ دم بخود بیٹھے رہے۔ اُن کے دل میں مہارانی کے لیے وفاداری کا ایک جذبہ ضرور تھا کہ وہ جانتے تھے کام خطرے کا ہے جوکھم کا ہے اور اس کام میں وہ مہارانی کے شریک ہیں۔ وہ پوری طرح سے متفق تھے کہ مہارانی کو اپنا خزانہ گورنمنٹ

ن انڈیا کے انکم ٹیکس افسروں کے حوالے نہیں
رنا چاہیے۔ کیوں کریں؟ سارے راجوں مہاراجوں
طرح اُن کے سیوک بھی گورنمنٹ کے خلاف
تھے، انکم ٹیکس کے خلاف تھے۔ خزانہ جمع کیا
اجوں مہاراجوں نے۔ یہ بھی کوئی انصاف تھا کہ
سے اُٹھا کر انکم ٹیکس والے لے جائیں (کیسے جمع
یا تھا اس کے بارے میں نہ اُنھوں نے کبھی سوچا
تھا نہ انھیں یہ جاننے کی کوئی خاص غرض تھی!)
زور اُسے چھپانے کے لیے ریگستان میں کوئی جگہ
مہارانی جی نے مقرر کی ہو گی جہاں اُسے چھپا دیا
جائے گا۔ شاید کوئی قلعہ ہو گا یا کوئی گڑھی ہو گی۔
یہ جو جگہ بھی ہو گی جلد اُنھیں معلوم ہو جائے گا۔
مہارانی تو ٹرک کو پاگلوں کی طرح چلا رہی تھی۔
دو میل ایک طرف کو جاتی تھی تو تین میل دوسری
طرف کو۔ اُس کے ٹائروں کے نشان ہوا میں اُڑتی
ہوئی ریت سے مٹتے چلے جا رہے تھے۔ اِسی
راستے سے واپس آنا مشکل ہو گا۔ مگر نا ممکن نہیں
تھا کیونکہ راج جوتشی کی نگاہیں ستاروں پر جمی
ہوئی تھیں اگر چہ اُس کو بھی مشکل پڑ رہی تھی۔
ستارے بھی ان چکر پھیریوں میں گم ہوتے
جا رہے تھے۔

آخر کار ایک جگہ پر رُک کر مہارانی
نے کہا: "مجھے لگتا ہے انکم ٹیکس والے پولیس
لے کر ہمارے پیچھے پیچھے چلے آ رہے ہیں۔ ہمیں بہت
ہوشیار ہونا چاہیے۔ کہیں وہ لوگ گولیاں نہ
چلا دیں۔ ممکن ہے کوئی زخمی ہو جائے۔" اس پر
بوڑھے راجپوت گُرنام سنگھ نے کہا: "آپ فکر
نہ کریں سرکار۔ اگر آپ اور آپ کے خزانے کی
رکھشا کے لیے ہماری جانیں بھی چلی جائیں تو
کوئی پرواہ نہیں۔"

"مجھے تم سے یہی اُمید تھی گُرنام!"
مہارانی نے کہا۔

"میں تم سب سے کہوں گی کہ کوئی آواز
نہ ہونی چاہیے۔ میں اب موٹر کی لائٹ بجھانے
والی ہوں کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ موٹر کی روشنیاں
بہت دور سے نظر آ جاتی ہیں۔" یہ کہہ کر اُس نے
اپنی ہیڈ لائٹس اور ٹیل لائٹ بجھا دی اور صرف
چاند ستاروں کی روشنی میں ٹرک دوڑانی شروع
کر دی۔ مگر ٹرک کے چلنے کا انداز وہی رہا۔

یہاں تک کہ جیکسن نے اپنی ریڈیم
والی چمکتی گھڑی میں دیکھا کہ رات کا ایک بج گیا
ہے۔ اُس نے اندازہ لگایا: "ہم چھ گھنٹے سے
چل رہے ہیں۔ کم سے کم ہم دو سو میل تو ضرور
آ گئے ہیں۔ مگر ان چک پھیریوں سے اصل میں
وجے نگر سے کتنا فاصلہ طے کیا ہے۔ یہ کوئی
نہیں کہہ سکتا تھا۔ پھر بھی سو میل دور تو ہو گئے
ہوں گے!"

لق و دق ریگستان کے بیچ میں دفعتاً
بریک لگنے کی کرخت آواز آئی اور ایک جھٹکے کے
ساتھ جس سے سوتے بھی جاگ پڑے دفعتاً انھیں
معلوم ہوا کہ ٹرک ٹھہر گئی ہے اور مہارانی صاحبہ
ریت کے سمندر میں کھڑی ہیں۔ اور اُن کے ہاتھ
میں سٹین گن ہے۔

"چلو جلدی کرو۔ وقت بہت کم ہے۔"
ٹرک کا دروازہ کھول کر وہ باہر آ گئے۔ ایسا لگا
جیسے جیل خانے کی قید سے چھُوٹے ہوئے قیدی
ہوں۔ بھاری بھاری بکسے انھوں نے جیسا بھی
ہوا اُٹھائے اور اُن کو باہر نکالا۔ ایک جگہ اُن کا
ڈھیر لگا دیا۔

اب مہارانی نے انھیں حکم دیا۔ چلو یہ
صندوق دفن کرنے کے لیے ایک گڈھا کھودنا شروع
کر دو اور یہ کہہ کر اُس نے اندر سے لوہے کے پھاوڑے نکالے
اور اُن کو اپنے سیوکوں کی طرف پھینکا۔
سیوک تو مہارانی کے اشارے پر جان
دینے کے لیے تیار تھے۔ پھاوڑے اُٹھا کر اُنھوں نے
ریت میں گڈھا کھودنا شروع کر دیا۔

کوئی ایک گھنٹہ لگا کافی گہرا گڈھا کھودنے
کے لیے۔

جب مہارانی گڈھے کی گہرائی سے مطمئن ہو گئی
تو اُس نے حکم دیا۔ بس کافی ہے۔ اب یہ صندوق
اس میں رکھوا دو اور اوپر سے ریت بھر دو۔

صندوق پھر اُٹھائے گئے اور اُن کو گڈھے
میں دفن کر دیا گیا اوپر سے ریت پھاوڑوں سے اُٹھا
اُٹھا کر ڈال دی گئی۔ چند منٹ میں خزانہ غائب
ہو گیا۔ اور اُس کی بجائے ایک قبر تیار ہو گئی خزانے کی۔

"نہیں نہیں یہ ٹیلہ نہیں چاہیے۔ شبہ ہو گا
کسی کو بالکل سپاٹ کر دو اسے۔"

نگاہیں

ساتھ اُن کے مری نگاہ گئی
جب نگہ تھک گئی تو آہ گئی
— داغؔ

بدل گئیں وہ نگاہیں یہ حادثہ تھا اخیر
پھر اس کے بعد کوئی انقلاب ہو نہ سکا
— سیمابؔ اکبرآبادی

ہیں دو عالم کی نگاہیں اس طرف
جس طرف اُن کی نگاہِ ناز ہے
— شفقؔ سیمابی

نگاہ چند قدم جا کے رہ گئی لیکن
خیال اُن کے تعاقب میں دور تک پہنچا
— مخمورؔ سعیدی

نگاہیں جا کے شکلِ یار تک کیا چیز لے آئیں
جسے دردِ محبت کر کے میں نے دل میں رکھا ہے
— خیالؔ

مرسلہ: کے۔ این اقبال، بنگلور ۴۲

آنکھیں

محرم ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب
آنکھ کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

—— غالب

ہوتا ہے رازِ عشق و محبت انھیں سے فاش
آنکھیں زباں نہیں ہیں مگر بے زباں نہیں

—— اصغر گونڈوی

دل میں کیا کیا ہوسِ دید بڑھائی نہ گئی
روبرو اُن کے مگر آنکھ اٹھائی نہ گئی

—— حسرت موہانی

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا
جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں تھا

—— جگر مراد آبادی

آزاد تری آنکھیں، آنکھیں ہی نہیں ورنہ
آنکھیں ہوں تو قطرہ بھی دریا نظر آتا ہے

—— آزاد انصاری

مرسلہ:- غلام قادر دلدار، اننت ناگ (کشمیر)

ہے۔ راہو اور کیتو دونوں کا ملن ہونے والا ہے جو کسی بھی راج کاریہ کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔"

مہارانی نے جواب دیا۔ "جوتشی جی یہ کاریہ تو آج ہی اسی وقت کرنا ہوگا۔ ورنہ ہمارے دشمن کل صبح ہم پر دھاوا بولنے والے ہیں۔ اگر ہم نے اپنے خزانے کو اس وقت کسی سورکشت جگہ نہ چھپایا تو کل وجے نگر کے سارے ہیرے جواہرات، سارا سونا چاندی جو پیڑھیوں سے راجے مہاراجوں نے اکٹھا کیا ہے اُس پر بھارتیہ سرکار قبضہ کر لے گی۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنی ساری دولت انکم ٹیکس والوں کو ہتھیا لینے دیں۔؟"

پھول متی راجوں مہاراجوں کی ٹھٹھن بھاشا بولنے کی کوشش تو کرتی تھی لیکن پھر اخیر میں اُسے اپنی بمبئی کی فلمی دنیا کی سیدھی سادی زبان پر ہی اکتفا کرنا پڑتا تھا۔

اُس نے بڑے کرڑے طریقے سے کہا۔

"چلو۔ اب یہ بکسے اٹھانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" یہ کہہ کر اُس نے بڑے ڈرامائی انداز میں (آخر وہ ایک ایکٹریس تھی!) ایک دروازہ کھولا جس کے پیچھے دس بارہ ٹرنک رکھے ہوئے تھے۔ ہر ٹرنک آہنی تھا اور اُس میں ایک بڑا تالا پڑا ہوا تھا۔ مہارانی نے چابیوں کا گچھا نکالا اور ایک صندوق کا تالا کھول کر اُس کا ڈھکنا کھول دیا تو سب کی آنکھیں ہیرے جواہرات سے چندھیا گئیں۔

"نہیں ہم بھارت سرکار کو اس سب پر قبضہ کرنے نہیں دیں گے۔"

مہارانی نے رانی جھانسی کی شان سے کہا کہ جیسے مہارانی لکشمی بائی کہتی تھی۔ "ہم جھانسی پر انگریزوں کا قبضہ نہیں ہونے دیں گے۔" "ہم" اُس نے اس طرح کہا جیسے وہ نو آدمی اُس کے سیوک نہ ہوں بلکہ اس سازش میں اس کے برابر کے شریک ہوں! دوسرے لمحے میں لوہے کے صندوق کا پٹ بند ہو گیا اور اُس میں تالا لگا دیا گیا۔

دوسرا باب

۹ لاشیں

جب سب لوگ سامان اُٹھانے کو آگے پہنچے تو پالکی کے اہیروں کو یہ ٹرنک اُٹھانے میں دقت نہ ہوئی۔ حکم ملتے ہی دو دو آدمیوں نے ایک ایک ٹرنک کو اُٹھا لیا۔ لیکن اس سب سامان کو کہاں لیجانا تھا۔ یہ اُن کو ابھی نہیں معلوم تھا۔

مہارانی پھول متی نے حکم دیا۔ "اس سُرنگ سے چور دروازے کو جاؤ اور یہ سب صندوق ہماری ٹرک میں رکھ دو۔ اور خود اندر بیٹھ جاؤ۔ اور باقی احکام کے منتظر رہو۔"

ہانپتے کانپتے اتنے وزنی سامان کو اُٹھا کر سب لوگ لے چلے۔ دو پھیرے کرنے تھے۔ سُرنگ ایک گیراج میں جا کر نکلی جہاں وہ ٹرک کھڑی تھی جو شکار کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ اس لیے اُس میں چاروں طرف مضبوط آہنی جالی لگی ہوئی تھی۔ جب سامان اندر رکھ دیا گیا تو مہارانی کا حکم ملا۔ "اندر بیٹھ جاؤ تم بھی!" یہ آخری حکم جیکسن کے لیے تھا۔ "میں خود ڈرائیو کروں گی۔"

ڈرائیونگ سیٹ پر اکیلی پھول متی بیٹھی اور بیٹھنے سے پہلے ایک بجلی کا بٹن دبایا جس سے گیراج کا دروازہ آپ سے آپ اوپر اُٹھ گیا۔ یہ راستہ محل کے پیچھے نکلتا تھا۔ ٹرک باہر نکلتے ہی دروازہ آپ سے آپ بند ہو گیا۔ جیکسن کو اطمینان تھا کہ مہارانی بہت اچھی ڈرائیور ہے۔ چند ہی منٹ میں وہ اور اُن کی ٹرک سڑکوں پر ہوتی ہوئی شہر سے باہر نکل آئی۔ اور اب وہ ریگستان کی طرف پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھاگے جا رہے تھے۔

سڑک چھوڑ کر اب ٹرک ریگستان میں سے جا رہی تھی۔ کسی کی ہمت نہ تھی کہ مہارانی سے پوچھے ہم کہاں جا رہے ہیں۔ مگر بوڑھے جوتشی نے چاند اور ستاروں سے اندازہ لگا لیا کہ ٹرک اُتر پچھم کو جا رہی ہے۔ مگر اُس نے یہ کسی کو نہیں بتایا سب لوگ دم بخود بیٹھے رہے۔ اُن کے دل میں مہارانی کے لیے وفاداری کا ایک جذبہ ضرور تھا کہ وہ جانتے تھے کام خطرے کا ہے جوکھم کا ہے اور اس کام میں وہ مہارانی کے شریک ہیں۔ وہ پوری طرح سے متفق تھے کہ مہارانی کو اپنا خزانہ گورنمنٹ

[...]ن انڈیا کے انکم ٹیکس افسروں کے حوالے نہیں [...]نا چاہیے۔ کیوں کریں؟ سارے راجوں مہاراجوں [...] طرح اُن کے سیوک بھی گورنمنٹ کے خلاف [...]ے، انکم ٹیکس کے خلاف تھے۔ خزانہ جمع کیا [...]جوں مہاراجوں نے۔ یہ بھی کوئی انصاف تھا کہ [...]ے اُٹھا کر انکم ٹیکس والے لے جائیں (کیسے جمع [...] تھا اس کے بارے میں نہ اُنہوں نے کبھی سوچا [...]ھا نہ انھیں یہ جاننے کی کوئی خاص غرض تھی!) [...]زور اُسے چھپانے کے لیے ریگستان میں کوئی جگہ [...]ہارانی جی نے مقرر کی ہوگی جہاں اُسے چھپا دیا [...]ئے گا۔ شاید کوئی قلعہ ہوگا یا کوئی گڑھی ہوگی۔ [...]ہر جو جگہ بھی ہوگی جلد اُنھیں معلوم ہو جائے گا۔ [...]ر مہارانی تو ٹرک کو پاگلوں کی طرح چلا رہی تھی۔ [...]و میل ایک طرف کو جاتی تھی تو تین میل دوسری [...]رف کو۔ اُس کے ٹائروں کے نشان ہوا میں اُڑتی ہوئی ریت سے مٹتے چلے جا رہے تھے۔ اِسی [...]استے سے واپس آنا مشکل ہوگا۔ مگر نا ممکن نہیں تھا کیونکہ راج جوتشی کی نگاہیں ستاروں پر جمی ہوئی تھیں اگرچہ اُس کو بھی مشکل پڑ رہی تھی۔ ستارے بھی ان چکر پھیریوں میں گُم ہوتے جا رہے تھے۔

آخر کار ایک جگہ پر رُک کر مہارانی نے کہا: "مجھے لگتا ہے انکم ٹیکس والے پولیس لے کر ہمارے پیچھے پیچھے چلے آ رہے ہیں۔ ہمیں بہت ہوشیار ہونا چاہیے۔ کہیں وہ لوگ گولیاں نہ چلا دیں۔ ممکن ہے کوئی زخمی ہو جائے۔" اس پر بوڑھے راجپوت گرنام سنگھ نے کہا: "آپ فکر نہ کریں سرکار۔ اگر آپ اور آپ کے خزانے کی رکھشا کے لیے ہماری جانیں بھی چلی جائیں تو کوئی پرواہ نہیں۔"

"مجھے تم سے یہی اُمید تھی گرنام!" مہارانی نے کہا۔

"میں تم سب سے کہوں گی کہ کوئی آواز نہ ہونی چاہیے۔ میں اب موٹر کی لائٹ بجھانے والی ہوں کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ موٹر کی روشنیاں بہت دور سے نظر آ جاتی ہیں۔" یہ کہہ کر اُس نے اپنی ہیڈ لائٹس اور ٹیل لائٹ بجھا دی اور صرف چاند ستاروں کی روشنی میں ٹرک دوڑانی شروع کر دی۔ مگر ٹرک کے چلنے کا انداز وہی رہا۔

یہاں تک کہ جیکسن نے اپنی ریڈیم والی چمکتی گھڑی میں دیکھا کہ رات کا ایک بج گیا ہے۔ اُس نے اندازہ لگایا: "ہم چھ گھنٹے سے چل رہے ہیں۔ کم سے کم ہم دو سو میل تو ضرور آ گئے ہیں۔ مگر ان چک پھیریوں سے اصل میں وجے نگر سے کتنا فاصلہ طے کیا ہے۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا۔ پھر بھی سو میل دور تو ہو گئے ہوں گے!"

لق و دق ریگستان کے بیچ میں دفعتاً بریک لگنے کی کرخت آواز آئی اور ایک جھٹکے کے ساتھ جس سے سوتے بھی جاگ پڑے دفعتاً انھیں معلوم ہوا کہ ٹرک ٹھہر گئی ہے اور مہارانی صاحبہ ریت کے سمندر میں کھڑی ہیں۔ اور اُن کے ہاتھ میں سٹین گن ہے۔

"چلو جلدی کرو۔ وقت بہت کم ہے۔" ٹرک کا دروازہ کھول کر وہ باہر آ گئے۔ ایسا لگتا جیسے جیل خانے کی قید سے چھوٹے ہوئے قیدی ہوں۔ بھاری بھاری بکسے انھوں نے جیسا بھی ہوا اُٹھائے اور اُن کو باہر نکالا۔ ایک جگہ اُن کا ڈھیر لگا دیا۔

اب مہارانی نے انھیں حکم دیا۔ چلو یہ صندوق دفن کرنے کے لیے ایک گڈھا کھودنا شروع کر دو اور یہ کہہ کر اُس نے اندر سے لوہے کے پھاوڑے نکالے اور اُن کو اپنے سیوکوں کی طرف پھینکا۔

سیوک تو مہارانی کے اشارے پر اپنی جان دینے کے لیے تیار تھے۔ پھاوڑے اُٹھا کر اُنھوں نے ریت میں گڈھا کھودنا شروع کر دیا۔

کوئی ایک گھنٹہ لگا کافی گہرا گڈھا کھودنے کے لیے۔

جب مہارانی گڈھے کی گہرائی سے مطمئن ہو گئی تو اُس نے حکم دیا۔ بس کافی ہے۔ اب یہ صندوق اس میں رکھو اور اوپر سے ریت بھر دو۔

صندوق پھر اُٹھائے گئے اور اُن کو گڈھے میں دفن کر دیا گیا اوپر سے ریت پھاوڑوں سے اُٹھا اُٹھا کر ڈال دی گئی۔ چند منٹ میں خزانہ غائب ہو گیا۔ اور اُس کی بجائے ایک قبر تیار ہو گئی خزانے کی۔

"نہیں نہیں یہ ٹیلہ نہیں چاہیے۔ شبہ ہوگا کسی کو بالکل سپاٹ کر دو اِسے۔"

نگاہیں

ساتھ اُن کے مری نگاہ گئی
جب نگہ تھک گئی تو آہ گئی
— داغ

بدل گئیں وہ نگاہیں یہ حادثہ تھا اخیر
پھر اس کے بعد کوئی انقلاب ہو نہ سکا
— سیماب اکبرآبادی

ہیں دو عالم کی نگاہیں اس طرف
جس طرف اُن کی نگاہِ ناز ہے
— شفق سیمابی

نگاہ چند قدم جا کے رہ گئی لیکن
خیال اُن کے تعاقب میں دور تک پہنچا
— مخمور سعیدی

نگاہیں جا کے شکلِ یار تک کیا چیز لے آئیں
جسے دردِ محبت کر کے میں نے دل میں رکھا ہے
— خیال

مرسلہ: کے۔ ین اقبال، بنگلور ۲۶

سیوکوں نے پھر اپنے پھاؤڑے سنبھالے اور زمین کو ہموار کر دیا۔

"شاباش۔ اب تم اُدھر کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ اور دیکھتے رہو کوئی دشمن کا آدمی نہ آنے پائے اِدھر!"

سب منہ موڑ کر کھڑے ہو گئے۔ ایک لائن میں۔

"آپ نشچنت رہیئے حضور....." گرنام سنگھ نے کہنا شروع کیا۔ اور جوتشی نے جو ستاروں کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔

"ستارے کہہ رہے ہیں حضور یہ بڑی اَشُبھ گھڑی ہے...."

اُن دونوں کے فقرے ادھورے ہی رہ گئے۔

ایک تڑاخوں کا سلسلہ شروع ہوا اور اس سے پہلے کہ وہ سوچ سکیں کیا ہو رہا ہے سٹین گن کی گولیاں کھاتے گئے اور گرتے گئے۔

جوتشی کو گولی سب سے اخیر میں لگی۔ اتنے میں وہ مر چکا تھا اور مہارانی کو سٹین گن سے گولیاں برساتے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"حضور۔ یہ کیا کر رہی ہیں....؟"

ہاتھ کا اشارہ مہارانی کی طرف بھی تھا اور جہاں وہ کھڑی تھی وہیں دبے ہوئے خزانے کی طرف بھی۔ ایک گولی اُسے بھی لگی اور وہ بھی ڈھیر ہو گیا۔

نو وفادار سیوک اب نو لاشوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔

گرنام سنگھ وفادار بوڑھا۔

سردار سنگھ (اب مہارانی کو کھانا چکھ کر کون دیا کرے گا؟)

بوٹا سنگھ۔ (مہارانی کا بار کون کھولے گا اور کون اُن کو شراب دیا کرے گا؟)

جیکسن ٹامس (مہارانی کی اماں اب خود اُسے ڈرائیو کرنا ہو گی)

ہمت سنگھ اور دلاور خاں (اب مہارانی کی حفاظت کون کرے گا؟)

رُلدو اور منگو۔ (اب مہارانی کی پالکی کون اُٹھائے گا؟)

اور نواں راج جوتشی۔ (اب مہارانی کو کون بتائے گا کہ کونسی گھڑی شُبھ ہے اور کونسی اشبھ ہے؟)

نو وفادار سیوک اب ریت پر مردہ پڑے تھے۔ سب کی کمر چھلنی ہو گئی تھی۔ اور اتنی جلدی یہ سب کام ہو گیا تھا کہ مرتے دم تک اُن کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ گولیاں کہاں سے آئی ہیں اور کس نے چلائی ہیں۔ اُن میں سے اکثر تو بھارت سرکار کو کوستے ہوئے اس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ اُن کو دُور دُور بھی یہ خیال نہیں تھا کہ یہ مہارانی نے اُن کی سیوا کا صلہ دیا ہے!

(اگلی قسط اگلے شمارے میں)

غزلیں

عرش صہبائی

۱۴۵- صہبائی اسٹریٹ، کچی چھاؤنی- جموں

اُن کی یادوں کی حسیں پرچھائیاں رہ جائیں گی
دِل کو ڈسنے کے لیے تنہائیاں رہ جائیں گی

ہم نہ ہوں گے پھر بھی بزم آرائیاں رہ جائیں گی
اپنی شہرت کے لیے رُسوائیاں رہ جائیں گی

ہم خلا کی وُسعتوں میں اِس طرح کھو جائیں گے
دُور تک بکھری ہُوئی تنہائیاں رہ جائیں گی

مِٹ نہ پائیں گے کسی صُورت بھی ماضی کے نقوش
دل کی دیواروں پہ کچھ پرچھائیاں رہ جائیں گی

ہم مُسافر ہیں نکل جائیں گے ہر بستی سے دُور
اور ہم کو ڈھونڈتی پُروائیاں رہ جائیں گی

پھُول سے خُوشبو کی صُورت ہم جُدا ہو جائیں گے
یہ بہاریں یہ چمن آرائیاں رہ جائیں گی

مثلِ نغمہ ہم فضا میں جذب ہو جائیں گے عرش
گنگناتی، گونجتی شہنائیاں رہ جائیں گی

اظہار اثر

۷-۵، ڈی- ڈی اے کالونی نیو رنجیت نگر، دہلی

خوں چھلکتا ہے جب آنکھوں سے ایاغوں کی طرح
جسم بھی سوچنے لگتے ہیں دماغوں کی طرح

ایک بے نام سی خواہش نے پجارن بن کر
عمر بھر ہم کو جلایا ہے چراغوں کی طرح

روزِ روشن میں ہمیں لوٹ رہے ہیں رہزن
چھپ گئے جانے کہاں لوگ سُراغوں کی طرح

اے خلا میری طرح تو بھی نہیں ہے خالی
کتنے سورج ترے سینے پہ ہیں داغوں کی طرح

دل کے زخموں کو اثر تم بھی سجا کر دیکھو
آتشِ گل سے دہکتے ہوئے باغوں کی طرح

عروج زیدی

گھیر سیف الدین خاں رامپور (یو-پی)

وہ خواب دیکھتا ہوں میں دن رات ان دنوں
سوہانِ روح ہیں مرے جذبات ان دنوں

اس باب میں نصیب محبت بھی ساتھ دے
ممکن تو ہے تلافیٔ مافات ان دنوں

پہرے لگے ہوئے ہیں درِ عرضِ حال پر
میں لب کشا ہوں یہ ہے بڑی بات ان دنوں

فرقِ حیات و موت کا چہرہ اُداس ہے
پیشِ نظر ہیں ایسے سوالات ان دنوں

اب دوستوں کی فرصتِ تنقید کیا ہوئی
کیوں بحث میں نہیں ہے مری ذات ان دنوں

میری جبیں ہے سنگِ درِ دوست ہے عروج
ٹکرا رہے ہیں ارض و سماوات ان دنوں

قومی بچتیں

آپ کو پیش کرتی ہیں

سود کی بڑی پرکشش شرحیں اور دیگر فوائد

یکم مارچ 1978ء سے نافذ العمل

- میعادی ڈیپازٹ:

5 سال	— 10	فیصد سالانہ
3 سال	— 8	فیصد سالانہ
2 سال	— 7.5	فیصد سالانہ
1 سال	— 7	فیصد سالانہ

- قومی ترقیاتی بانڈ — 13 فیصد سالانہ (مفرد)
- نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ — 10.25 فیصد سالانہ (چوتھا اور پانچواں اجراء)
- ریکرنگ ڈیپازٹ — 9.25 فیصد سالانہ

- 15 سالہ پبلک پراویڈنٹ فنڈ — 7.5 فیصد سالانہ (ٹیکس سے مستثنیٰ)
- 10 سالہ اجتماعی میعادی ڈیپازٹ — 6.25 فیصد سالانہ (ٹیکس سے مستثنیٰ)
- 7 سالہ نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ (دوسرا اور تیسرا اجراء) — 6 فیصد سالانہ (ٹیکس سے مستثنیٰ)

- سارا سود (ایک سال میں 3,000 روپے سے بھی زاید) ٹیکس سے کلیتۃً مستثنیٰ ہونے کے علاوہ، کھاتوں میں جمع رقموں پر آمدن ٹیکس میں تخفیف کی اجازت ہے نیز دولت ٹیکس (ڈیڑھ لاکھ روپے سے بھی زاید) میں چھوٹ ملتی ہے۔

- ڈاک گھر سیونگز بنک (چیک کی سہولت کے ساتھ) — 5 فیصد سالانہ (ٹیکس سے مستثنیٰ)

ایک اور کشش: چھ ماہ بعد کھاتہ داروں کو 20 لاکھ 50 ہزار روپے کے 11,116 انعامات دیئے جاتے ہیں۔

مزید معلومات کے لئے براہِ کرم ان سے رابطہ قایم کیجیے:-
کسی ڈاک گھر سے یا ہمارے منظور شدہ ایجنٹ سے (جو سرکاری رسید دے کر آپ سے رقم وصول کر کے آپ کی جانب سے ڈاک گھر میں جمع کروا سکتا ہے)

قومی بچت ادارہ

پوسٹ بکس نمبر 96 ناگپور

davp 77/629

ضی ـــ حال ـــ اور مستقبل

رضیہ سجاد ظہیر

وہ کوٹھری اب کوئی پچاس برس پہلے کی یاد ہوگئی لیکن وہ اس طرح اب بھی میری نگاہوں تلے گھومتی ہے جیسے چند ہی منٹ پہلے میں نے پردہ سیمیں پر اُسے دیکھا ہو۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ دُنیا میں اور ویسی کوٹھریاں ہوتی ہیں یا نہیں لیکن ہندوستان میں تو ہرگز نہیں کوئی گھر نام کی چیز ان کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی۔ یہ ہر شہر کی ہر بستی کے ہر گھر میں ہوتی ہیں، جس گھر میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ انھیں الگ جگہ دی جاسکے، وہاں وہ پلنگ کے نیچے بن جاتی ہیں یا چھت کی دیواروں میں آڑے بانس لگا کر ان میں ٹنگ جاتی ہیں، یا بکسوں میں بند ہوکر خود پلنگ کی جگہ استعمال ہونے لگتی ہیں۔ لیکن وہ نہ ہوں ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔

مجھے یاد ہے اُس کوٹھری میں ایک طرف ایک بڑا سا لکڑی کا بکس رکھا رہتا تھا جس کا ہرا روغن دُھندلا پڑ گیا تھا اور اُس روغن پر بنے بڑے بڑے لال لال طوطے بس اب دھبّوں کی طرح دکھائی دیتے تھے مگر کے زیادہ تر بکسوں میں تو تالے پڑے رہتے تھے، لیکن یہ بکس ہمیشہ بغیر تالے کے نظر آتا تھا کیونکہ اوّل تو اس میں ایسی بھاری چیزیں رہتی تھیں جن کے متعلق کبھی گمان نہ ہوسکتا تھا کہ کوئی انھیں چُرا کر اُٹھا لے جاسکتا ہے، جیسے امّاں کے جہیز کی پنج سیری لگن (جس میں پانچ سیر آٹا گُندھ سکے) اور بھرت کے بنے پلنگ کے پائے، بھاری بھاری بادیے اور لوٹے اور حُقّے جن کے متعدد حصے بکس میں کئی جگہوں پر رہتے تھے اور یا پھر ایسی چیزیں جن کے متعلق خیال تھا کہ بیکار ہو چکی ہیں لیکن داشتہ آید بکار کے مطابق پھینک دیے جانے کے بجائے سینت دی گئی تھیں۔ جیسے کوئی تھرماس جس کے اندر کا شیشہ ٹوٹ گیا ہے، جا بجا سے ٹوٹی اور گرہیں بندھی ادوائنوں کا ایک پلندہ جس میں سے کبھی کبھار نوکروں کا سفری بستر باندھنے یا آنگن یا دالان میں الگنی ٹانگنے کے لیے رسّی نکل آتی تھی، بدرنگ، پُرانی چوڑیوں کا ایک بڑا سا گچھا کیونکہ سہاگ کی نشانی ہونے کی وجہ سے چوڑیاں پھینکی تو جا نہیں سکتی تھیں، ہم لوگوں کے بچپن کے کھلونے جن کی کنجیاں غائب تھیں۔ انگاروں پر ڈبل روٹی کے توس سینکنے کی جالی، کیونکہ اب تو بجلی سے توس سینکے جاتے تھے، تین پھٹی بوریاں، ایک پُرانا، ساریوں کے کور جوڑ جوڑ کر سیا ہوا، میلا سا تھیلا، جس میں کچھ چھوٹے چھوٹے اسپرنگ، ہر سائز کی کیلیں اور پیچ اور کچھ ٹوٹے ہوئے بجلی کے پلگ چند آبی رنگوں سے رنگی، بدرنگ فریموں والی سینریاں جو ہم بچوں کو سالگرہوں کے موقعہ پر تحفہ میں ملی تھیں لیکن جنھیں اب دقیانوسی سمجھ کر کوئی اپنے کمرے میں نہ لگاتا تھا، کئی ایسے ڈھکن جن کی کیتلیاں ٹوٹ گئی تھیں اور کئی ایسی کیتلیاں جن کے ڈھکن ندارد تھے، کاغذ کے پھولوں کے بہت سے گچھے پُرانے خطوں کے بنڈل ـــــ اور دو لالٹینیں ـــــ ایک بڑی، ایک چھوٹی!

جواہر لال نہرو یونیورسٹی کیمپس
نیو مہرولی روڈ نئی دہلی

●

برادرم رحمٰن نیر صاحب ـــ!
آداب۔ "بیسویں صدی" کے لیے ایک کہانی بھیج رہی ہوں۔ اس کہانی کے میں نے دو عنوان رکھے ہیں۔ ۱۔ ماضی ۲۔ ماضی۔ حال اور مستقبل فیصلہ آپ لوگوں کی مرضی پر چھوڑا جاتا ہے۔ ان دونوں میں سے یا پھر کوئی تیسرا اچھا سا نام تجویز کرکے رکھ لیں۔

مخلص
رضیہ سجاد ظہیر

ہندوستان اور پاکستان کے سیاسی انقلابات کی تاریخی دستاویزات

سلامت علی مہدی کے شعلہ بار قلم سے نکلی ہوئی دو کتابیں

شاہ کمیشن

ایمرجنسی کے دوران زیادتیوں کی لامتناہی داستان،
لیڈروں اور ذمہ داروں کے بیانات مجرموں کے اقبال جرم
اور ایک دوسرے پر ذمہ داری ڈالنے کی دلچسپ حقیقت
پر مبنی کہانیاں ــــ شاہ کمیشن کے سامنے۔

قیمت: دس روپے

بھٹو کا مقدمہ

قتل کا مقدمہ جس میں پاکستان کے
سابق وزیر اعظم مسٹر ذوالفقار علی بھٹو
کو پھانسی کی سزا کا حکم سنا دیا گیا اس مقدمہ کی کارروائی
پر مبنی ایک تاریخی دستاویز۔

قیمت: پانچ روپے

۱۹ ماہ کے سیاہ دور کی خونچکاں داستانیں

ایمرجنسی کی قیامت

نامور سیاسی مبصر اور بیباک صحافی سلامت علی مہدی کے آتشیں
قلم سے نکلی ہوئی ایک تاریخی دستاویز جس میں "اندرا شاہی" کے دور
میں ہوئے سیاسی ہنگاموں اور مظالم کی روداد بیان کی گئی
ہے۔ اردو میں پہلی اور آخری کتاب۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن
ختم ہو چکا ہے۔ دوسرا ایڈیشن چھپ رہا ہے۔ فوراً طلب کریں۔

قیمت :- -/۵ روپے

سنجے گاندھی، ودیا چرن شکلا اور دھریندر برہمچاری
کی مبینہ رنگین مزاجی پر روشنی ڈالنے والی بیباک تحریر

ایمرجنسی کے

جنسی اسکینڈل

ایک ایسی کتاب جس میں ایمرجنسی کے
عیاش حکمرانوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔

قیمت صرف پانچ روپے

منگانے کا پتہ :- ہفت روزہ **عوام** ۱۸ انصاری روڈ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

سعدیؒ فرماتے ہیں کہ ایک شخص جو سرتاپا بدکاریوں میں ڈوبا ہوا تھا، گناہوں سے تائب ہو گیا اور اُوباشوں کی صحبت سے کنارہ کشی اختیار کر کے اہلِ حق کی مجلسوں میں بیٹھنے لگا یہاں تک کہ وہ اُن کے فیضِ صحبت سے نہایت اعلیٰ اخلاق اور کردار کا مالک بن گیا، لیکن اُس کی گزشتہ زندگی کے پیشِ نظر لوگ اس کو برا ہی کہتے تھے اور اُس کی نیکی اور تقویٰ کو ریاکاری سے تعبیر کرتے تھے۔ وہ بے چارہ لوگوں کے طعنوں سے تنگ آکر اپنے پیرِ طریقت کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ اِن لوگوں کی زبان درازی نے میرا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ اُنھوں نے فرمایا کہ اے بیٹے! اِس نعمت کا شکر کیسے ادا کر سکتا ہے کہ تو اُس سے بہتر ہے جیسا کہ وہ تجھے سمجھ رہے ہیں یعنی یہ کہ اگر فی الواقع تو نیک ہو اور لوگ تجھے برا کہیں، یہ بہتر ہے اِس سے کہ تو حقیقت میں برا ہو اور لوگ تجھے نیک کہیں۔ ●●

ویسے تو کسی زمانے میں گھر میں کئی لالٹینیں تھیں ـــــــ ایک سب سے اچھی والی چوڑی تتی، تیز روشنی والی جو ہم بچوں کے پڑھنے کے لیے تھی جو بڑی میز کے بیچوں بیچ کسی پُرانے اخبار کو چار تہہ کر کے اُس پر رکھ دی جاتی تھی اور ہم لوگ اُس کے چاروں طرف بیٹھ کر پڑھتے، پھر ایک امّی ابّا کے کمرے میں، ایک کھانے والے کمرے میں، جو باہر کسی کے آنے پر بیٹھک میں بھیج دی جاتی، اور ایک نسبتاً کم روشنی والی سارے گھر میں اِدھر اُدھر کسی نہ کسی کام سے گھومتے رہنے کے لیے۔ لیکن سب جگہ لالٹینیں ہونے کے باوجود باورچی خانے میں وہی ڈھبری جلتی تھی اور لطف کی بات یہ کہ سفید بھک بالوں والی، چندھی آنکھوں اور جھکی کمر والی بڑی بی کو کبھی یہ احساس بھی نہ ہوا کہ اُن کے لیے بھی باورچی خانے میں لالٹین چاہیے!

پھر لیمپ آگئے لیکن صرف دو عدد ـــــــ ایک ہم لوگوں کے پڑھنے کے لیے اور ایک مردانی بیٹھک میں، مرد مہمانوں کے آنے پر جلنے کے لیے۔ لیکن گھر میں گھومنے، زنانے دالان میں روشنی دینے اور کھانا یا دوسری چیزیں اِدھر سے اُدھر لے جانے کے لیے، دروازے پر پڑنے والی پکار سُننے کے لیے ایک دو لالٹینیں ہی رہیں ـــــــ اور اُن سے بھی کم روشنی والی ایک لالٹین باورچی خانے میں بھی پہنچ گئی کیونکہ اس درمیان وہ پھوس بڑی بی اللہ میاں کو پیاری ہو گئی تھیں اور اُن کی جگہ جو آئیں وہ تھیں تو بڑی بی ہی لیکن اتنی پھنجی ہوئی نہیں، اس لیے انھوں نے قانونی زبان میں "شوکاز" کا نوٹس دے دیا کہ انھیں بھی کیوں نہ لالٹین دی جائے چاہے وہ زیادہ تیز نہ ہو۔ اس لیے جہاں ڈھبری رہتی تھی وہاں ایک چندھی سی لالٹین آگئی۔

مجھے روشنی کے اس دَور کے ساتھ میراں دادا کی یاد آتی ہے جو میرے ابّا کے کالج میں بھشتی تھے اور کھانے کی چھٹی کے وقت لڑکوں کو پانی بھی پلاتے تھے، وہ روز کالج بند ہونے کے بعد اندھیرا ہونے سے کچھ پہلے ہی ہمارے گھر آجاتے تھے، بُوا یا کوئی نوکر لڑکا اندر سے سب لالٹینیں اور لیمپ لاکر اُن کے سامنے رکھ دیتا اور وہ پچھلے برآمدے میں ٹاٹ کے ایک ٹکڑے پر آلتی پالتی مار کے بیٹھ جاتے، اُن کے سامنے ایک ٹین کے ڈبے میں تھوڑا سا پانی، دو چار میلے چیتھڑے، ایک ذرا صاف سا جھاڑن اور ایک چھوٹی سی قینچی ہوتی تھی۔ ان سب کی مدد سے سب لالٹینوں کو صاف کرتے، لیمپوں وغیرہ کی چمنیاں پونچھتے، بھیگا کپڑا رگڑ کر سب کو چمکاتے، قینچی سے بتیاں تراشتے ـــــــ پھر سب کو ایک قطار سے رکھتے اور ماچس جلا کر ایک ایک کو روشن کرتے اور کہتے جاتے "گھر روشن، دل روشن، دُنیا روشن، سلام علیکم یا منکر نکیر" ـــــــ اُن کی یہ آواز سُن کر اندر سے کوئی نکلتا اور ساری لالٹینوں کے کنڈے کے کڑے ایک ہاتھ میں پکڑ کر، بڑھ کر اندر لے جاتا، پھر آکر دونوں لیمپ اُٹھاتا اور روشنی بکھیرتا اندر چلا جاتا۔

جب باورچی خانے میں سے ڈھبری اُٹھ گئی اور وہاں چندھی لالٹین رہنے لگی تب بھی نوکروں کی کوٹھریوں میں ڈھبری ہی جلتی رہی، صرف چوکیدار کے لیے ایک چندھی سی لالٹین تھی جسے وہ رات میں جلائے ہوئے ہاتھ میں لٹکائے، جھنجر جھنجر کرتا، لکڑی زمین پر پٹکتا گھومتا رہتا تھا۔ تاریخ اُسے نہیں ملا کرتا تھا۔

پھر بجلی آگئی ـــــــ لیکن اس میں بھی فرق تھا یعنی گھر کے دو ٹیبل لیمپوں میں ساٹھ واٹ کا بلب، بیٹھک، کھانے کے کمرے اور دونوں بیڈ روموں میں چالیس کے بلب اور نوکروں کی کوٹھریوں اور باورچی خانے میں پانچ نمبر کا ـــــــ غسل خانے یا راہداری میں بھی جب ہوتا ہے تو پانچ کا ورنہ موم بتی کا ایک ٹکڑا اور دیا سلائی ایک طاق میں رکھی رہتی تھی۔ بات یہ تھی کہ کہیں کا بلب خراب ہوتا تو فوراً غسل خانے یا راہداری کا نکال کے وہاں لگا دیا جاتا اور پھر مدتوں وہ اپنی اصلی جگہ نہ پہنچتا۔

لیکن جب کبھی بجلی غائب ہو جاتی تو پھر کوئی فرق نہ رہتا جیسا اندھیرا مردانی بیٹھک میں ہوتا، ویسا ہی باورچی خانے میں اور بالکل ویسا ہی مالکوں کے ڈرائنگ روم میں جیسا نوکروں کی کوٹھریوں میں، پھر نوکر اور بچے موم بتیوں کی تلاش میں دھڑ دھڑ اِدھر اُدھر دوڑنے اور ایک دوسرے سے ٹکرانے لگتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ جب چاروں

رف اندھیرا ہو تو کسی کو بھی ٹھیک ٹھیک راستہ
ہیں مل سکتا اور نہ کوئی وہ چیز ہاتھ آسکتی
ہے جو تلاش کی جا رہی ہو۔

اب تک تو جب کبھی بجلی کبھی کبھار یا تھوڑی
ر کے لیے جاتی تھی تو گھر میں رکھی موم بتیوں یا اِدھر
ھر پڑے موم بتی کے ٹکڑوں سے کام چل جاتا تھا
لن جب یہ ہونے لگا کہ روزانہ، اور کئی کئی گھنٹوں
ے لیے، اور سرکاری انتظامات کے تحت
لی غائب رہنے لگی، بجلی کے بلبوں نے آنکھیں بند
لیں اور پنکھوں نے پر سمیٹ لیے تو موم بتیاں
ت مہنگی پڑنے لگیں اور مہنگی تو مہنگی، ایک سرے
سے بازار ہی سے غائب ہونے لگیں ——— تو
ہ بعد بڑا، بے حد پرانا، بغیر تالے والا لکڑی کا
رے رنگ کا، بدرنگ بکس پھر ایک بار کھولا گیا

اور اس کی تہوں میں جو قسم قسم کی چیزیں بھری
ہوئی تھیں وہ نکل نکل کے پھیل گئیں اور اُن چیزوں
میں سے چُن چُن کے اُٹھائی گئیں تین چیزیں ———
ایک لیمپ، جو پورا تو صحیح سلامت اور کام
دینے کی حالت میں تھا لیکن اُس کی چمنی نہیں تھی
——— اور دو لالٹینیں ——— ایک بڑی،
ایک چھوٹی ———

اور پھر جلدی جلدی سب چیزیں پھر
سے اُس بکس میں رکھ کر اُس کا بھاری ڈھکنا ایک
جھٹکے کے ساتھ بند کر دیا گیا۔

سارا دن بازار میں ڈھونڈوائی ہونے
کے بعد، لیمپ کی ایک چمنی، ایک شیشے چینی کے برتنوں
کی دوکان میں کہیں ردّی سامان میں پڑی مل گئی۔
ایک لالٹین تو مکمل تھی ایک کی چمنی ذرا سی چٹکی
ہوئی تھی تو خیر کیا ہُوا۔ ان سب کو صاف
صاف کر کے لیمپ کو بڑی بیٹھک کے ایک طرف رکھ
دیا گیا۔ بڑی لالٹین اِدھر اُدھر کے کاموں میں
اور راہداری میں آنے جانے کے لیے اور
چھوٹی چمکی والی، جو ذرا چندھی بھی جلتی تھی وہ
باورچی خانے کے لیے۔

اب بجلی جانے سے پنکھے کی تکلیف تو
ضرور ہوتی ہے لیکن روشنی کی نہیں اور دو دو
تین تین گھنٹے جو بجلی نہیں آتی تو کوئی ایسی بات تو
نہیں مچتی جیسی شروع میں جب بجلی جاتی تھی تو مچا
کرتی تھی ——— اور میں اِس پوری صورتِ
حال کو سامنے رکھ کر اکثر یہ سوچتی ہوں کہ دُنیا کا
ہر مسئلہ کسی نہ کسی نئے ہی طریقے سے حل ہوتا
ہے لیکن ایسا بھی اکثر ضرور ہوتا ہے کہ اگر ماضی
کو ساتھ نہ لو تو مستقبل یا حال کی مشکلوں پر
روشنی نہیں پڑتی۔ ●●

غزلیں

ایم۔ اے۔ محسن بنارسی

صدر شعبۂ انگریزی۔ گورنمنٹ کالج، چوراچاندپور (منی پور)

●

اے شاکیٔ تغافل تجھکو خبر نہیں ہے
بیگانہ آئینہ سے آئینہ گر نہیں ہے

دل جس جگہ جھکا ہے ہم بھی وہیں جھکے ہیں
ہم اہلِ دل کا سجدہ پابندِ در نہیں ہے

کیوں تیرگیٔ غم سے مایوس ہیں لگا ہیں
ایسی بھی کوئی شب ہے جس کی سحر نہیں ہے

ہم سن کے کیا کریں گے اُس کی حکایتوں کو
جس محفلِ طرب میں اپنا گذر نہیں ہے

اِس درجہ حادثوں سے گذرا ہوں زندگی میں
اب حادثاتِ غم کا دل پر اثر نہیں ہے

اسرارِ زندگی کو اہلِ جنوں سے پوچھو
اہلِ خرد میں کوئی بالغ نظر نہیں ہے

حسنِ نظر سے محسنؔ دلکش ہے ہر نظارہ
کچھ بھی نہیں حسیں گر حسنِ نظر نہیں ہے

شکیل احمد عاصمؔ بریلوی

محلہ افغاناں، کرتپور، بجنور (یو۔پی)

●

جو دردِ محبت کی دوا مانگ رہے ہیں
وہ دن میں ستاروں کی ضیا مانگ رہے ہیں

اربابِ خرد تم رسن و دار سجاؤ!
ہم مجرمِ الفت ہیں سزا مانگ رہے ہیں

ماضی کے شب و روز پھر آجائیں پلٹ کر
اس دور کے انساں یہ دعا مانگ رہے ہیں

ہم خوگرِ آلام ہیں اے گردشِ دوراں
لا، تجھ سے غمِ ہوشربا مانگ رہے ہیں

جنت کی تمنا جنھیں ہو گی انھیں ہو گی
ہم تو ترے کوچے کی فضا مانگ رہے ہیں

امیر قزلباش

A-11 ۔ نظام الدین ایسٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۴

●

وہ آفتاب نہیں آفتاب جیسا تھا
یہیں کہیں کوئی چہرہ جناب جیسا تھا

اڑا کے لے گئی اُس کو ہوا۔ کدھر یارو
ابھی ابھی جو سروں پر سحاب جیسا تھا

یہ کون ہیں کہ جو سیراب ہو کے لوٹے ہیں
مرے لیے وہ سمندر سراب جیسا تھا

ہوئے ہم اپنے لیے اتنے اجنبی کہ ہمیں
ہمارے قرب کا لمحہ عذاب جیسا تھا

بچھڑ گیا کہ مرے ساتھ ہے خدا جانے
جو سایہ سایہ مرے ہم رکاب جیسا تھا

قریب آنہ سکا کوئی لمحۂ موجود
نظر میں دور تلک ایک خواب جیسا تھا

گزر رہے تھے یہ کن راستوں سے ہم کل شب
چراغ راہ گزر ماہتاب جیسا تھا

ترقی اردو بورڈ کی مطبوعات

۱- تعلیم اور اس کا سماجی پس منظر	ڈاکٹر سلامت اللہ	۱۰/۷۵
۲- سماج اور تعلیم	محمد عبدالقادر عمادی	۶/۸۰
۳- مغل ہندوستان کا طریق زراعت	ڈاکٹر عرفان حبیب / جمال محمد صدیقی	۲۴/۵۰
۴- رابنسن کروسو (بچوں کے لیے)	ڈینیل ڈیفو / م۔ ندیم	۳/۴۰
۵- کامرس	برائے ہائر سکنڈری	۴/۳۰
۶- یوروپ کے عظیم سیاسی مفکرین	ڈاکٹر ہاشم قدوائی	۱۵/۵۰
۷- اجرتیں	مارس ڈاب / عبدالرشید	۱۰/۵۰
۸- رنجیت سنگھ	این کے سنہا / کیلاش چندر چودھری	۹/۲۵
۹- ان سے ملیے (بچوں کے لیے)	منوہر ورما / طلعت عثمانی	۳/-
۱۰- ہندوستان کی خارجہ پالیسی کی بنیادیں	ڈاکٹر بمل پرساد / محمد محمود فیض	۱۲/۲۵
۱۱- ہندوستانی معیشت (نویں اور دسویں جماعتوں کے لیے)	برج کشور اور ایس کے بھٹناگر	۵/۳۰
۱۲- گھریلو سائنس (دوسرا ایڈیشن)	تاجور سامری	۳/۵۰
۱۳- سکونیات (برائے بی اے۔ بی۔ ایس سی)	آندھرا پردیش	۸/۲۵

ترقی اردو بورڈ کی دوسری اہم مطبوعات

۱- مفتاح التقویم	حبیب الرحمان خان صابری	۲۸/-
۲- کھاتہ نویسی و کھاتہ داری	کیو ایچ فاروقی	۱۲/-
۳- ارضیات کے بنیادی تصورات	ڈی اوبرو چیف / ڈاکٹر ماجد حسین	۲۲/-
۴- طبیعات کے بنیادی تصورات	آرتھر بیفر / احمد وکیل جعفری	۲۵/-
۵- ہند آریائی اور ہندی	ڈاکٹر ایس کے چٹرجی / ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی	۱۳/۵۰
۶- انیس کے مرثیے	مرتبہ صالحہ عابد حسین	۲۰/-
۷- زبان اور قواعد	رشید حسن خان	۱۷/-
۸- انسانی ارتقاء	ڈاکٹر ایم آر ساہنی / ڈاکٹر احسان اللہ	۱۳/۷۵
۹- فرہنگ آصفیہ (مکمل سیٹ) چار جلدیں		۱۵۰/-

کتابوں اور دوسری معلومات کے لیے مندرجہ ذیل پتہ پر لکھیں۔

بیورو فار پروموشن آف اردو ــــ وزارت تعلیم اور سماجی بہبود

ویسٹ بلاک ۸ آر۔ کے۔ پورم نئی دہلی-۲۲-۱۱۰۰

کلا مندر

رفعت سروش

S-8/N-551 آر۔ کے پورم
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۲

●

برادرم رحمٰن نیّر صاحب! آداب
یہ تو آپ کے علم میں ہے ہی کہ میں کبھی کبھی شعری فضا سے نکل کر افسانوی ماحول میں بھی پناہ لیتا ہوں، ایسے ہی ایک لمحہ کی تخلیق ایک کہانی —— کلا مندر —— آپ کی نذر کر رہا ہوں، بیسویں صدی کے صفحات میں اسے جگہ دے کر ممنون فرمائیے۔
آپ کا مخلص،
رفعت سروش

باہر دُھند چھائی ہوئی ہے۔ سڑک کی روشنیاں ٹھٹھری ہوئی ہیں۔ دُور سے کبھی کبھی کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آ جاتی ہے۔ یا کوئی موٹر تیز رفتار سے گزرتی ہے تو سناٹے کو درہم برہم کر دیتی ہے کمرے میں سکون ہے۔ بجلی کی روشنی میں نہایا ہوا کمرہ وقت کے گزرنے کے احساس سے بے نیاز اُسی حالت میں ہے جیسا کل رات تھا۔ جیسا پرسوں رات تھا۔ اور جیسا .... نہیں .... نہیں .... یہ کمرہ ہمیشہ سے ایسا نہ تھا۔ اِس کی دیواروں پر خوبصورت دوشیزاؤں کی تصویریں مُسکراتی رہتی تھیں۔ کونے کی میز پر ایک مجسمہ رکھا رہتا تھا۔ ایک نہایت حسین، جوان اور بے حد پُرکشش قد و خال کی عورت کا مجسمہ۔ مجسمہ ساز نے اُس عورت کے فطری حُسن کو چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اور شاید اِسی لیے وہ مجسمہ کمرے میں آنے جانے والوں کی نظروں کا مرکز بن جاتا تھا۔ میں اِس کمرے میں چند ماہ پہلے آیا تھا۔ ایک اجنبی کی طرح۔ کسی دوست کی تلاش میں۔ اتفاق کی بات تھی کہ جس کی مجھے تلاش تھی وہ تو اُس وقت نہ ملا تھا لیکن کمرے میں جو شخص موجود تھا اُس نے کچھ اِس انداز سے مجھ سے بات چیت کی کہ میں اُس اجنبی کا گرویدہ ہو گیا اور اُس سے باتیں کرتا رہا۔ جب رخصت ہوا تو شاید ہم دونوں دوست بن چکے تھے۔ اُس کا جو بھی خیال ہو میرا یہی تاثر تھا۔ اُس اتفاقیہ ملاقات کے بعد ہفتے میں دو تین بار اُس شخص سے ملنا میرا معمول ہو گیا۔ ہم گھنٹوں باتیں کرتے رہتے۔ وہ مجسمہ ساز تھا۔ میں اُس کے فن کے کمال کا معترف و مدّاح تھا۔ وہ مجھ سے باتیں بھی کرتا جاتا اور اپنا کام بھی کرتا رہتا۔ وہ دیکھتے دیکھتے بے جان پتھر کے پہلو سے ایسے پیکر تراش لیتا تھا جنھیں دیکھ کر زندگی کو رشک آئے۔ اُس کے بنائے ہوئے مجسّمے جیسے منہ بولتی تصویریں تھیں۔ وہ اپنے بنائے ہوئے مجسّموں کو پہروں دیکھتا رہتا۔ اِس انداز سے جیسے وہ اُن میں اپنے دل کی دھڑکنیں اور روح کی بیتابی تحلیل کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ مجھے اُس کی محویت اتنی پسند تھی کہ کبھی کبھی میں اُسے مجسمہ سمجھنے لگتا تھا۔ ہماری اتفاقیہ ملاقات گہری دوستی میں بدل جائیگی، اِس کا اندازہ پہلے اُسے تھا نہ مجھے۔ ورنہ شاید میں کنارہ کشی اختیار کر لیتا۔ یا مجھے کسی منزل پر یہی معلوم ہو جاتا کہ وہ مجسمہ ساز ایک پُراسرار شخصیت ہے تو بھی میں اُس سے دامن بچاتا۔ لیکن وہ تو ایک سیدھا سادہ انسان نظر آتا تھا۔ ہاں اُس کی شخصیت میں بلا کی کشش ضرور تھی۔

میں دوستی میں کسی کی ذاتی زندگی کو خواہ مخواہ کُریدنا پسند نہیں کرتا۔ اِس لیے ہم اِدھر اُدھر کی۔ فن اور ادب کی —— موسم اور سیاست کی۔ باتیں کیا کرتے تھے —— باتیں —— محض باتیں کرنے کے لیے۔ اصل مقصد باتیں کرنا نہ ہوتا تھا، ایک دوسرے کا قُرب حاصل کرنا ہوتا تھا۔ باتیں محض بہانا اور وسیلا تھیں۔ ایک دن میں کمرے میں داخل ہوا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ کونے کی میز والا مجسمہ قدِ آدم ہو گیا تھا




اب فیروزی رنگ کے
کیپسول پر سلوری دھاری
اور نام نورانی تیل
متوناتھ بھنجن کے ساتھ
ایل ٹی LT کا ٹریڈ مارک
دیکھکر خریدیں۔
नूरानी
NooraniTel
नूरानी तेल
FIROZE
نورانی تیل
درد چوٹ زخم کٹنے جلنے کی مشہور دوا
تیار کردہ:
انڈین کیمیکل کمپنی۔ متوناتھ بھنجن یو۔پی

یا ـــــ پھر میں نے دیکھا میز پر مجسمہ جیسا تھا ویسا ہی رکھا
تھا، اور وہ عورت بہ نفسِ نفیس کمرے میں موجود تھی!
اور نہایت بے تکلفی سے ایک تپائی پر بیٹھی تھی۔
میں نے ایک دو بار اپنی آنکھیں مسلیں۔ لیکن
دونوں چیزیں اپنی اپنی جگہ حقیقت تھیں ـــــ
عورت بھی اور اُس کا مجسمہ بھی۔ جی میں آیا دونوں
کو ایک ایک بار چھو کر دیکھوں ـــــ لیکن ـــــ
میں نے اپنی نظروں کو سمیٹ لیا۔ میرے قدموں
کی آہٹ پا کر وہ عورت چونکی، اُس نے مجھے
بغور دیکھا اور پوچھا ـــــ "آپ کو کس سے
ملنا ہے ـــــ؟" لیکن اُس کی بات کا جواب
دینے سے پہلے مجسمہ ساز اپنی پُراسرار آنکھیں مچمچاتا
ہوا کمرہ میں آیا اور بغیر کسی تامّل کے بولا ـــــ
"شوکت صاحب! اچھا ہوا اِس وقت آپ
آ گئے۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ آپ کو کیسے اطلاع
دوں۔ میری زندگی ایک تھکی ہوئی زندگی ہے۔
اور عمر کے اِس آخری موڑ پر آپ سے ملاقات ہوئی۔
مجھے اِس امر کا اعتراف ہے کہ آپ پہلے شخص ہیں
جس نے مجھ سے میری نجی زندگی کے بارے میں کچھ
اُلٹے سیدھے سوال نہیں کیے، اور خاص طور پر اِس
مجسمہ کو اپنے ذوقِ تجسس کا نشانہ نہیں بنایا۔
میں روز سوچتا تھا کہ آپ ایسا کوئی سوال کریں گے۔
لیکن آپ نے ہر ملاقات میں مجھے مایوس کیا۔
اتفاق سے آج جب میرے اِس شہکار کا حقیقی
پیکر میرے پاس آیا تو دل میں یہ خواہش جاگی کہ
آپ کو اِن سے ضرور ملاؤں ـــــ" اور یہ کہہ کر
مجسمہ ساز نے میرا تعارف اُس پیکرِ ناز و جمال سے
کرایا جس کے حُسن کی تعریف میں اپنی نظروں سے
کر چکا تھا ـــــ زبان سے نہیں۔

"یہ ہیں کلپنا! ـــــ اور یہ ہیں میرے
دوست شوکت ـــــ" تعارف رسمی تھا اور
میں نے بھی رسمی خوشی کا اظہار کیا۔ کمرے میں پھر
گہری خاموشی چھا گئی۔ کلپنا نے میری طرف اُچٹتی
سی نظر ڈالی تھی اور پھر تپائی پر اِس طرح بیٹھ گئی تھی
جیسے اُسے اپنا فوٹو، اسکیچ یا مجسمہ بنوانے سے دلچسپی ہے
باتوں سے نہیں۔ اُس خاموشی میں کمرے کی ساری
چیزیں ـــــ تصویریں ـــــ مجسمے ـــــ آئینے
دیواریں ـــــ سب چیزیں زبانِ خموشی سے بولتی نظر
آئیں۔ آخر مجسمہ ساز نے طلسمِ خاموشی کو توڑا۔
"شوکت صاحب! آپ نے کلپنا کے بارے میں کچھ
اور جاننے کی خواہش کیوں نہیں کی ـــــ؟" سوال
غیر ضروری سا تھا، اور اِس کا سیدھا جواب
دینا کچھ مشکل بھی تھا۔ لیکن میں ایک دم بول اُٹھا
"اِس لیے کہ کلپنا کی حقیقت تو مجھ پر پہلے ہی واضح
ہو چکی ہے۔ آج تو اِن کا صرف نام معلوم ہوا۔
جس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ـــــ" میرے
اس جواب پر کلپنا نے شکایت اور تجسس آمیز
نظروں سے مجھے دیکھا ـــــ میں نے بھی اُسے

غزل

توڑ بھی دے یہ رشتے ناطے سارے بندھن جھوٹے ہیں
جیون کی اس بگیا میں سب کاغذ کے گل بوٹے ہیں

حرص و ہوس کا پاگل بالک جو تن میں وشرام کرے
کتنے شہر اجاڑے اس نے کتنے لشکر لوٹے ہیں

اُن کانٹوں کی قدر و قیمت ہم دیوانوں سے پوچھو
جن کانٹوں پر چلتے چلتے پاؤں کے چھالے پھوٹے ہیں

جیون کے دن کالی راتیں ہنستے روتے کاٹی ہیں
مٹّی کے پنجرے سے تب پرانوں کے پنچھی چھوٹے ہیں

جن کی نزاکت دیکھ کے شاخِ گل بھی شرما جاتی تھی
آج ان کی یادوں سے دل میں کتنے خنجر ٹوٹے ہیں

اپنے سازِ نفس کے تارِ لرزاں کی آواز تو سُن
تو سچّا، تیرا من سچّا، باقی سارے جھوٹے ہیں

[illegible]

دیکھا۔ پھر کچھ سوچ کر میں نے ہی اپنی نظریں ہٹا لیں، کیونکہ مجسمہ ساز ہم دونوں کی نظروں کو دیکھ رہا تھا۔ کمرے کی خاموشی اور گہری ہوگئی۔ ہم سب اتنے ساکت تھے کہ ایک دوسرے کی دھڑکنوں کی آوازیں سُن رہے تھے۔ چند لمحوں کے بعد کلپنا اچانک کھڑی ہوگئی۔ اُس نے اپنے مجسّمے کو بغور دیکھا۔ پھر آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا۔ غالبًا اُسے اپنا چہرہ نسبتاً سپاٹ نظر آیا۔ وہ ایک دم مجسمہ ساز کی طرف مڑی —— آپ نے میرا مجسّمہ نہیں، میری روح کا مجسمہ بنایا ہے۔ آج میرا چہرہ اور خدوخال اُس کے سامنے ماند ہیں ——" یہ سُن کر مجسّمہ ساز کے چہرے پر فخر و ناز کے تاثّرات پیدا ہوئے۔ لیکن وہ بولا کچھ نہیں —— کلپنا پھر کہنے لگی —— "آج مجھے یہ مجسّمہ اپنا رقیب معلوم ہونے لگا ہے —— رقیب —— رقیب —— ! اور یہ آپ کی ستم ظریفی ہے آپ کی —— میں آپ کو پریشان حال اور مضطرب پاکر آپ کے قریب آئی تھی —— آپ کے فن سے عشق کرنے لگی تھی۔ لیکن آپ نے میری روح کو مجھ سے جُدا کر لیا۔ میری روح کو اِس پتھر میں قید کر لیا —— اور مجھے —— مجھے محض گوشت پوست کا پیکر بنا کر چھوڑ دیا —— لیکن —— لیکن میں اپنے رقیب کا وجود کیسے برداشت کروں ——" یہ کہکر کلپنا نے اپنے مجسّمے کو گرا دیا —— اور پاگلوں کی طرح خدوخال مسخ کر دیے۔ اور پھر اُس شکستہ مجسّمے سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مجسّمہ ساز بُت بنا کھڑا رہا —— اور میرا تو وہ حال تھا کہ کاٹو تو لہو نہ ہو بدن میں! میں دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہا تھا کہ یہ جو کچھ ہوا میری وجہ سے ہوا۔ لیکن مجھے بالکل توقّع نہ تھی کہ ایسا ہو جائیگا۔ میں جانتا تھا کہ عورت حسّاس ہوتی ہے، لیکن عورت اتنی سریع الاحساس ہو سکتی ہے۔ اِس کا اندازہ آج ہی ہوا، غالبًا وہ پہلے سے دل شکستہ تھی۔ مجسمہ ساز کی تعریف و تحسین نے اُس کے زخموں پر مرہم رکھ دیا تھا —— اور میری غیر متوقع بات سے اُس کے زخم پھر ہرے ہو گئے۔ وہ بلک بلک کر بچّوں کی طرح روتی رہی اور ہم دونوں حیرت و حسرت سے یہ منظر دیکھتے رہے —— آخر کلپنا اپنا جی ہلکا کر کے اُٹھی۔ اُس نے اپنا کھویا ہوا وقار اپنے چہرے پر واپس لانے کی ناکام کوشش کی، اور پھر یہ کہتی ہوئی تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی —— "اب میں آپ سے کبھی نہ ملوں گی! میری ساری تصویریں اور اسکیچ ضائع کر دیجئے —— بہت بہت شکریہ ——!" جاتے جاتے اُس نے مجھ پر جو شکایت آمیز نظر ڈالی وہ میرے دل میں گڑ کے رہ گئی۔

کلپنا کے چلے جانے کے بعد مجسّمہ ساز اپنی جگہ سے ہلا۔ اُس نے بڑے اہتمام سے کلپنا کی تصویریں اور اسکیچ وغیرہ اتارے۔ جیسے کوئی عبادت کر رہا ہو۔ سب چیزوں کو اکٹھا کیا اور یہ کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا —— "شوکت صاحب! میری ڈرامائی زندگی کا یہ آخری سین تھا۔ آپ کو کہیں میری لاش ملے تو اِن چیزوں کو میرے ساتھ ہی دفن کر دینا ——" میرے کچھ اور پوچھنے سے پہلے ہی وہ رات کی تنہائی میں گم ہو چکا تھا —— اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں اور کہاں جاؤں —— ؟

وہ رات میں نے اُسی کمرے میں جاگ کر کاٹی —— اور پھر دن کے ہنگاموں نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا —— اب یہ کمرہ اکثر بند رہتا ہے۔ لیکن جب میں گھبراتا ہوں۔ پریشان ہوتا ہوں تو اِس کمرے میں رات گزارنے چلا آتا ہوں، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے یہ کوئی معمولی کمرہ نہیں —— ایک عبادت گاہ ہے —— اور آج رات میں پھر سکون کی تلاش میں آیا ہوں اِس عبادت گاہ میں۔ کلا کے اِس مندر میں —— جہاں دو بھٹکتے جسم اپنی پُر سکون روحیں چھوڑ گئے ہیں۔

●●

غزلیں

محمد علی موج

آل انڈیا ریڈیو، رامپور (یو۔پی)

●

دلوں کو صید، نگاہوں کو تیر کہتا تھا
جو بات کہتا تھا، وہ بے نظیر کہتا تھا

اب اپنے گھر کے ہی آنگن میں قید ہے یارو
جو سارے شہر کو اپنا اسیر کہتا تھا

ضرور ہو گا رموزِ حیات سے واقف
وہ بادشاہ جو خود کو فقیر کہتا تھا

نہ جانے کیسے اندھیروں میں ہو گیا تحلیل
جو اپنے آپ کو روشن ضمیر کہتا تھا

وہ ذہن و دل سے ہے کس درجہ مفلسی کا شکار
جو خود کو شہر کا سب سے امیر کہتا تھا

فصیلِ شہر پہ ہم نے بٹھا دیا تھا جسے
ہمیں کو موج وہ 'بونا' حقیر کہتا تھا

طاہر تلہری

صدر بازار۔ تلہر (یو۔پی)

●

زخم سہے جائیے زخمِ وفا لے جائیے
آج اُس کے سامنے اُس کا دیا لے جائیے

اپنے پیچھے آنے والے کی دُعا لے جائیے
جس سے ٹھوکر کھائی وہ پتھر اٹھا لے جائیے

دوسروں کی راہ پر چلنے کے ہم قائل نہیں
آپ اپنے ساتھ اپنا نقشِ پا لے جائیے

میرے تن پر میرے زخموں کی قبا ہی خوب ہے
محترم یہ جُبّہ و دستار اٹھا لے جائیے

آرزو کو بھی ہوس کا نام دیدیتے ہیں لوگ
اُس کے آگے اب دلِ بے مدعا لے جائیے

جانے کیا تعبیر کی جاتے وہاں الفاظ کی
داستانِ شوق بے حرف و صدا لے جائیے

جراءتِ تقلید اے طاہر نہ کر بیٹھے کوئی
اپنے ہر نقشِ قدم پر خاک ڈالے جائیے

نافع رضوی

محلہ مفتی صاحب۔ فرخ آباد (یو۔پی)

●

حریمِ دل میں جب شمعِ محبت جگمگائے گی
تمھیں ہر گام پر رہ رہ کے میری یاد آئے گی

غمِ دل کے تقاضے تم کو جب مجبور کردیں گے
وفا کے میکدے میں پارسائی ڈگمگائے گی

پڑھو گی میری نظمیں رات کو جب اپنی خلوت میں
تمہاری کالی پلکوں پر نمی سی جھلملائے گی

کسی سے جب ٹہلتے وقت میرا تذکرہ ہوگا
قدم بھی لڑکھڑائیں گے زباں بھی لڑکھڑائے گی

تمہاری آنکھ اشک آلود ہوگی شدتِ غم سے
ہوا جس دم تمہارا ریشمی آنچل اڑائے گی

تمہاری مرمریں بانہوں کو ہوگی جستجو میری
تمہاری خوابگاہِ ناز بھی آنسو بہائے گی

ابھی تک صرف تم پھولوں کے گلدستوں سے کھیلی ہو
کبھی کانٹوں سے گزرو گی تو میری یاد آئے گی

دروازہ کھول دو!

سلطانہ مہر

وہ بمبئی میں گنجان آبادی والے علاقے ڈونگری میں ایک پانچ منزلہ بلڈنگ کے پہلے مالے کی چھوٹی کھولی میں اپنی ماں اور ایک بڑی بہن کے ساتھ رہتی تھی۔ باپ کا ابھی حال ہی میں انتقال ہوا تھا۔ اُس کا باپ ایک دکان پر منشی تھا اور سیٹھ کی دولت کے کھاتوں میں اُلٹ پھیر کا کام اُس کے سپرد تھا۔ اُس کے باپ کے مرنے کے بعد ماں نے سلائی کی مشین سنبھالی۔ وہ میٹرک تک تعلیم حاصل کر چکی تھی لیکن ابھی تک اُس کے خاندان میں عورت کے ملازمت کرنے کا رواج نہ تھا۔ اس لیے وہ گھر کا کام کاج کرتی اور سلائی میں ماں کا ہاتھ بٹاتی۔ اُس کی بڑی بہن کی منگنی ایک دُور کے رشتہ دار لڑکے سے ہو چکی تھی جو بمبئی میں کرافورڈ مارکیٹ کی ایک دکان پر ملازم تھا۔ ماں نے باپ کی زندگی ہی میں بڑی بہن کے لیے تھوڑا بہت جہیز جوڑ اتیار کر لیا تھا۔ شادی بھی ہونے والی تھی لیکن باپ کی موت کی وجہ سے اب شادی چند مہینوں کے لیے ملتوی ہو گئی تھی۔ اُس کے باپ کا چہلم ابھی دو ہفتے پہلے ہوا تھا۔

اُنہی دنوں پڑوس کی کھولی میں رہنے والی ہاجرہ خالہ کا ایک بھانجہ پاکستان سے آیا۔ دونوں گھروں کا آپس میں ملنا جُلنا تھا جب سلیمان نے مریم کو دیکھا تو یہیں شادی کرنے کا ارادہ ظاہر کر دیا۔ ہاجرہ خالہ نے مریم کی اماں سے ڈرتے ڈرتے رشتے کی بات کی، ابھی مرنے والے کا کفن بھی میلا نہ ہوا تھا لیکن مریم کی ماں نے شادی کے لیے ہاں کر دی۔ ہاجرہ خالہ کو حیرت بھی ہوئی لیکن وہ سمجھدار تھیں اور مریم کے گھر کے حالات سے بھی واقف تھیں۔ مریم کی ماں دُور اندیش تھی۔ یہ رشتہ اُسے غنیمت معلوم ہوا۔ پھر وہ ہاجرہ خالہ کی بہن کو بھی جانتی تھیں۔ چھوٹا سا خاندان تھا۔ ایک ماں اور بیٹا۔ کُل دو نفوس تھے۔ پھر پاکستان کون سا کوسوں دُور تھا۔ پڑوس کی بات جیسے اُن کی اور ہاجرہ خالہ کی کھولیاں ملی ہوئی تھیں۔ جب جی چاہے آئیں جائیں۔ سو انھوں نے مریم کو بڑی بہن کے جہیز کے جوڑے میں لپیٹ کر بیاہ دیا اور اپنی دعاؤں کے سائے میں رخصت کر دیا۔ یہ سوچکر کہ بڑی کی قسمت بڑی کے ساتھ۔

مریم پاکستان آگئی۔ اُس کا نیا گھر کراچی کے جوڑیا بازار کی ایک بلڈنگ کی دوسری منزل پر تھا۔ اِس کے سوا کچھ بھی تو فرق نہ تھا۔ وہاں ایک کھولی تھی اور یہاں دو کھولیوں کا ایک فلیٹ۔ باقی سب وہی تھا۔ ویسی ہی سڑکیں، وہی گلیاں اور اونچی عمارتیں جن میں سینکڑوں خاندان آباد تھے۔ گلیوں میں وہی چھوٹے چھوٹے بازار جہاں گوشت ترکاریوں سے لے کر پرانے کپڑوں اور ضروریاتِ زندگی کی دوسری چیزیں آسانی سے مل جایا کرتی تھیں۔ وہ جب کبھی بس میں بیٹھ کر بندر روڈ سے گزرتی تو سول اسپتال کو دیکھکر اُسے بمبئی کے محمد علی روڈ سے لے کر بھنڈی بازار اور جے جے اسپتال تک سب کچھ ایک جیسا معلوم ہوتا۔ اُس کا شوہر کراچی میں شیر شاہ کے

۱۸۸۔ پی آئی بی کالونی
کراچی ۵۔ (پاکستان)

●

محترمی رحمٰن نیر صاحب
آداب۔ آپ کا گرامی نامہ ملا۔ جواب میں کچھ تاخیر کے لیے معذرت خواں ہوں دو وجوہ تھیں۔
۱۔ ان دنوں میں علامہ اقبال پر مختلف دانشوروں کے مضامین پر مبنی ایک کتاب کی اشاعت میں مصروف ہوں۔
۲۔ ایک مجبوری ہمیشہ یہ رہی کہ افسانہ لکھنے کا موڈ نہ بنے تو خود بھی افسانہ لکھ کر مطمئن نہیں ہوتی۔ پھر "بیسویں صدی" جیسے جریدے کے لیے بہر حال میری کاوش حاضرِ خدمت ہے۔ آپ کے خلوص نے میرے قلم کو جلا بخشی۔ افسانہ "دروازہ کھول دو" آپ کی نذر ہے۔
گر قبول افتد ــــ والسلام
سلطانہ مہر

اشتراکیت

وہ اپنے گھر کا تمام ضروری سامان ایک ٹرک میں لدوا کر دوسرے شہر جا رہا تھا۔ کہ راستے میں لوگوں نے اسے روک لیا۔ ایک نے ٹرک کے مال و اسباب پر حریصانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا، "دیکھو یار کس مزے سے اتنا مال اکیلا اڑاتے چلا جا رہا تھا۔

اسباب کے مالک نے مسکرا کر کہا،

"جناب یہ مال میرا اپنا ہے"۔

دو تین آدمی ہنسے۔ "ہم سب جانتے ہیں"۔ ایک آدمی چلّایا! "لوٹ لو" یہ امیر آدمی ہے۔ ٹرک لے کر چوریاں کرتا ہے"۔

(سعادت حسن منٹو)

علاقے میں کاروں کے پرانے پرزوں کی ایک دکان میں ملازم تھا۔ اُس کی شادی کے دو سال بعد جب اُس کی ساس کا انتقال ہوا تو اُسے محسوس ہوا کہ اب وہ سچ مچ تنہا ہو گئی ہے۔ اُن لمحوں میں اُسے اپنی ماں بہت یاد آتی اور ڈونگری میں واقع اپنا گھر جیسے اُسے بلانے لگا۔ لیکن ابھی اُس کے معاشی حالات ایسے نہ تھے کہ وہ بمبئی جا سکتی۔ تنہائی سے تنگ آکر اُس نے پرائیوٹ انٹر کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اُس کے پڑوس کی دو لڑکیاں شہلا اور رخسانہ بی۔ اے کر رہی تھیں۔ اُس نے اُن کی مدد سے تیاری کی اور امتحان دے دیا۔

بمبئی سے اُس کی ماں کے خطوط آتے رہتے تھے۔ اُنھی خطوط کے ذریعے اُسے اپنی بڑی بہن کی شادی کا دعوت نامہ ملا۔ وہ بمبئی پہنچنے کے لیے تڑپتی رہی۔ پھر اس نے قسمیں دے دے کر ماں کو آنے کے لیے لکھا۔ اُس کی بوڑھی ماں بھی اپنی بیٹی کو دیکھنے کے لیے ترس رہی تھی۔ اُس نے کسی طرح دو سو روپے جوڑ توڑ کر پانی کے جہاز کا ٹکٹ لیا اور کراچی آگئی۔ لیکن ابھی ایک مہینہ بھی نہ گزرا تھا کہ دونوں طرف سے آنے جانے کے راستے بند ہو گئے۔ سرحدوں پر جنگ کے شعلے بھڑکنے لگے۔ اور بلیک آؤٹ کے اندھیروں نے بوڑھے دل کو ہولا دیا۔ وہ سہم کر رہ گئی۔

"اب وہ اپنے گھر کیسے جائے گی۔؟"

اِسی خوف کے دباؤ کے تحت ایک دن بیٹھے بیٹھے اُس کے ہاتھوں پیروں میں اینٹھن ہونے لگی اور مُنہ سے خرر خرر کی آوازیں آنے لگیں۔ اُس کا شوہر سلیمان دکان پر گیا تھا وہ پڑوسیوں کی مدد سے ماں کو ٹیکسی میں ڈال کر سِول اسپتال لے گئی۔ ڈاکٹروں نے بتایا اِسے دل کا دَورہ پڑا ہے۔ وہ بھاگی بھاگی ماں کو لے کر جناح اسپتال پہنچی۔ مریضہ کی حالت نازک تھی۔

اُس کے منہ پر آکسیجن رکھ دیا گیا۔ مریم ساری رات وارڈ کے باہر برآمدے میں ٹہلتی رہی۔ پھر وہ تھک کر بیٹھ گئی۔ نیند سے اُس کے پپوٹے بوجھل ہو رہے تھے۔ وہ سکڑی سمٹی بیٹھی تھی کہ اچانک چونک پڑی۔ اُس نے سر اٹھا کر دیکھا سفید دودھ سے اُجلے یونیفارم میں ملبوس ایک نرس اُس کے قریب سے گزر رہی تھی۔ تب اُسے محسوس ہوا جیسے وہ بمبئی کے جے جے اسپتال میں ہو۔ ایک بار اُس کی بہن کو ڈپتھیریا ہو گیا تھا اور وہ اسپتال میں داخل کر دی گئی تھی۔ ایسی ہی سُبک خرام سفید سفید یونیفارم پہنے نرسیں سفید لمبے لمبے کوٹ پہنے اور گلے میں اسٹیتھسکوپ لٹکائے مہربان چہروں والے ڈاکٹر سب کچھ تو ویسا ہی تھا۔ اور پھر وہ بمبئی کی پُرپیچ گلیوں میں کھو کر سو گئی۔

دو ہفتے اسپتال میں رہنے کے بعد اُس کی ماں کو نئی زندگی مل گئی تھی۔ لیکن اب وہ اپنی نئی زندگی کے دن گِن گِن کر اِس آس میں کاٹ رہی تھیں کہ کب راستے کھُلیں اور وہ اپنے گھر پہنچیں۔ اُن کی کوکھ کا ایک پھول سرحد کے اُس پار بھی تو تھا۔

جلد ہی نفرتوں کی دیواریں ڈھے گئیں۔

ماں پانی کے جہاز میں بیٹھی اور جب جہاز نے کنارا چھوڑا تو اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے دُھندلا گئیں اُس کے ہونٹ پھڑپھڑانے لگے۔

"اللہ میاں ...... اب کبھی ان دو پڑوسی ملکوں میں لڑائی نہ ہو۔ ورنہ میری بچّی ——— میری مریم ———"

وہ آگے سوچ نہ سکی۔ وہ آگے سوچنا بھی نہ چاہتی تھی۔ جو ہولناک دن اُس نے دیکھے تھے اب اُس کی تاریکیوں کا وہ تصوّر بھی کرنا نہ چاہتی تھی۔ وہ مُنہ ہی میں درود شریف پڑھنے لگی۔

مریم نے جب بی اے کر لیا تو اُسے ایک پرائیوٹ اسکول میں ملازمت مل گئی۔ ماں کے خط آتے رہتے تھے۔ ایک خط سے اُسے معلوم ہوا کہ اُس کے بہنوئی کا ایک پیر بس کے ایک حادثے میں کٹ گیا۔ اُس کی بہن اب بہت دکھی ہے۔ وہ بھی اب ماں کے ساتھ مشین چلاتی ہے اور لوگوں کے کپڑے سی کر بچّوں کا پیٹ پالتی ہے۔ تب مریم نے دُکھی دل سے سوچا وہ اپنی تنخواہ سے پیسے جمع کر کے بمبئی ضرور جائے گی اور اپنی بہن کے بچّوں کے لیے ڈھیر سارے کپڑے کھلونے اور مٹھائیاں دے کر اُنھیں نہال کر دے گی۔ اُس نے اپنا پاسپورٹ بھی بنوا لیا اور رقم بھی جمع کرنے کا انتظام کرنے لگی۔ اُنہی دنوں اُس کے میاں کو خلیج کی ایک ریاست میں اُس کے دوست کے ذریعے ملازمت مل گئی۔ اور وہ اپنے جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔

تب ایک رات مریم نے اُس کا موڈ اچھا

دیکھا کرتی۔

"شکر ہے۔۔۔ اگر ہم بھی یہاں چلی جاتیں اور تمہیں یہاں کا بھی نہ ملتا ــــــ"

"میں بمبئی جا کر کیا کروں گی مریم ــــ"

وہ کروٹ بدل کر بولی۔

"میرا تو بھی کام ہے کہ میں سال بھر میں اتنی ترقی کر لوں کہ لندن نکل جاؤں۔ پھر تمہیں بھی وہاں بلا لوں گا۔ بمبئی میں کیا رکھا ہے ــــ"

"ہاں واقعی وہاں کیا رکھا ہے ــــ"

وہ گھٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

"تمہارا تو وہاں کوئی بھی نہیں ــــ لیکن میری ماں ــــ میری بہن ــــ" وہ سسکنے لگی۔

"تو تو دل چھوٹا کیوں کرتی ہے مریم ــــ میں تجھے پیسے بھیجوں گا تو جا کر مل آنا ــــ" اور وہ اس چھوٹی سی تسلی سے خوش ہو کر تصور میں اپنی ماں کی آغوش میں پہنچ گئی۔

"کتنی خوبصورت ہوتی ہے تخیل کی یہ دنیا جہاں کوئی روک ٹوک، کوئی پابندی نہیں ــــ"

اُس نے سوچا۔ اور پھر اُس کا تصور شب و روز ایک نئی دنیا بساتا۔

سلیمان چلا گیا۔ اُس کے پاس رقم بھی خاصی جمع ہو گئی تھی لیکن اب ایک بار پھر کٹنے جانے کی راہیں مسدود ہو گئی تھیں۔ ایک بار پھر سرحدوں پر جنگ چھڑ گئی تھی۔ چند دنوں بعد جنگ کے بادل چھٹ گئے لیکن نفرتوں کے جو بیج بوئے جا چکے تھے اُن کی فصل سامنے آ گئی تھی۔ وہ اکثر بے چین ہو جاتی۔ ماں کی خیریت کے خطوط اسے اپنے شوہر کے توسط سے ملا کرتے اور جواب بھی کتنی سو ورس والا فاصلہ طے کر کے پہنچتا۔ پہلے اسی انتظار بیت جاتے۔ ایک خط سے اُسے معلوم ہوا کہ

اُس کی بہن بیوہ ہو گئی اور اپنے دو بچوں کو لے کر سسرال چلی گئی اور اب ماں اکیلی ہے ــــ اختلاج قلب کی مریض۔۔ اُس کی بوڑھی ماں جو اپنا سامان خود کرتی ہے۔ خود جا کر بازار سے سودا سلف لاتی ہے۔ کھانا پکاتی ہے اور یوں زندگی کا قرض ادا کر رہی ہے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"کاش! وہ اپنی ماں کا بیٹا ہوتی۔ بیٹی نہ ہوتی۔ بیٹی ہونا بھی کتنی بڑی لعنت ہے!"

پھر ایک دن اُس کے لیے بہار کا پیغام لایا۔ جیسے چمن کی جانب کھلنے والے بند دریچے اچانک کھل گئے ہوں۔ وہ سب کام چھوڑ کر بمبئی جانے کی تیاریاں کرنے لگی۔ اُس کے گھر میں کام کرنے والی بوڑھی مائی کو جب معلوم ہوا کہ وہ بمبئی جا رہی ہے تو وہ اُس کا دامن پکڑ کر بیٹھ گئی اور اپنی سندھی زبان میں بولی۔

"بے بیگم سائیں جی۔ منجو پکڑ لو کھت کھڑیں ویں ست لاے بیگم صاحب میرا ایک خط لے جا۔"

پھر اُس نے آنسوؤں کے درمیان سندھی زبان میں اُسے بتایا کہ اُس کی چھوٹی بہن کی سسرال بمبئی میں ہے۔ وہ لوگ برسوں سے سندھ میں رہتے ہیں۔ لیکن جب یہ زمین تقسیم ہوئی تو وہ اِدھر رہ گئی اور اُس کی بہن بمبئی میں۔ وہ کبھی سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ ملنا جلنا ایسا ناممکن ہو جائے گا کہ ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کو ترس جائیں گے۔ پھر اُس کے کہنے سے مریم نے اس کی بہن کے نام ایک خط لکھا اور مائی شیلاں کو پڑھ کر سُنایا وہ اپنی بہن کو یاد کر کر کے روتی جاتی تھی اور مریم کو دعائیں دینے کے ساتھ تاکید کرتی جاتی کہ وہ بمبئی جا کر اُس کی بہن کے پتے پر اس کا خط پوسٹ کر دے۔

خط تہہ کر کے اپنے بکس میں رکھتے ہوئے مریم بڑبڑائی۔

"مائی شیلاں میں تو سوچتی تھی کہ یہ مجھ جیسے لوگوں ہی کا مسئلہ ہے لیکن یہ تو تیرا بھی مسئلہ ہے۔ تو۔۔۔۔ جس نے اسی دھرتی سے جنم لیا۔ تو گویا ہم سب ایک ہی جہنم میں جل رہے ہیں۔۔۔۔ اِس جہنم میں جسے نفرت کے ہاتھوں اور ذہنوں نے جنم دیا ہے۔

جب مریم ہوائی جہاز میں بیٹھ گئی اور جہاز نے اُڑان لی تو اُسے محسوس ہوا جیسے وہ ایک دم ہلکی پھلکی ہو گئی ہے۔ جیسے مدتوں کی جمی گرد اُس کے وجود سے جھڑ گئی۔

"اور یہ بن باس آخر ختم ہوا ــــ" کتنے سال ہو گئے ــــ" وہ اُنگلیوں پر گننے لگی ــــ

"۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۶ء ــــ پورے چودہ سال!"

اُس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ سبھی مسافر مگن تھے ــــ پھر اُس نے اپنی گھڑی دیکھی ڈیڑھ گھنٹے کا سفر تھا لیکن یہ ڈیڑھ گھنٹہ اب کتنا طویل ہو گیا تھا۔ وہ پل پل گن رہی تھی۔ شام کے جھٹپٹے میں

منٹو

غم میں

اور گونیوں سے بالا کر دیا گیا۔ اس سے فارغ ہو کر گاڑی کے باقی مسافروں کی حلوے، دودھ اور پھلوں سے تواضع کی گئی۔ گاڑی چلنے سے پہلے تواضع کرنے والوں کے منتظم نے مسافروں کو مخاطب کر کے کہا "بھائیو اور بہنو! ہمیں گاڑی کی آمد کی اطلاع بہت دیر میں ملی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جس طرح چاہتے تھے۔ اس طرح آپ کی خدمت نہ کر سکے۔ (سعادت حسن منٹو)

جہاں اچھی آخر [illegible]
کے اثر [illegible] تھا
[illegible] کی ساری [illegible]
ہوا کہ [illegible] اس کی [illegible]
اُسے ہوش آ رہا ہے [illegible]
وہ کیسی [illegible] تھی [illegible]
[illegible] اس
[illegible] کیسی کیسی مشکلوں کا سامنا کیا لیکن
[illegible] سب مرحلوں کو اس نے طے کر لیا۔
سب سے بڑا مرحلہ تو انتظار کا ہوتا ہے۔ اس نے
بھی کتنا انتظار کیا تھا۔ اور آج ۔۔۔ آج وہ اپنی ماں
کی آغوش میں سمٹی ہوئی تھی۔ کتنا لذت بخش اور سکون
آفریں احساس ہے یہ!
وہ اپنے دل کو سنبھالتی اپنی ماں کی کھولی
تک پہنچ گئی۔ اسی دروازے سے تو وہ دلہن بن کر
نکلی تھی۔ وہ چند لمحوں کے لئے رک گئی۔ دروازہ بند
تھا۔ اس نے پھر [illegible]
اُس نے آہستہ سے [illegible]
[illegible]
ایک بوڑھا [illegible]
[illegible]
[illegible] اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہی۔
"میں مریم ہوں [illegible] کی بیٹی ۔۔۔"
"اچھا اچھا ۔۔۔ تم ہو مریم!" وہ چہرہ
اُس کے قریب کھسک آیا۔
"وہ اندر ہی ہو گی۔ سو رہی ہو گی۔
دوپہر میں تو تیری بات ہوئی تھی۔ وہ چارپائی میں آ کر
[illegible] گئی تھیں۔ تم [illegible] سے
کھٹکھٹانا ۔۔۔"
تب اس نے دروازہ اور بھی زور سے کھٹکھٹایا۔
اور پھر دھکا دیا۔ پرانی وضع کی چٹخنی ایک جھٹکے سے
گر گئی۔ دروازہ کھل گیا۔ وہ جھپٹ کر اندر داخل ہو گئی۔
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
چہرے کو دیکھا۔
[illegible]
ماں [illegible] اس وقت اس کے ملنے پر
پاؤں پھیلائے وہ موجود تھی۔ لیکن آج ۔۔۔ وہ ماں
اس نے کس عالم میں دم توڑا تھا کہ اس کی
نیم وا آنکھیں دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں
اور ادھ کھلے ہونٹ ۔۔۔ جیسے کہہ رہے ہوں ۔۔۔
"دروازہ کھول دو ۔۔۔ دروازہ کھول دو ۔۔۔
میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ میں ابھی مرنا نہیں
چاہتی۔ میں ابھی مرنا ۔۔۔ نہیں چاہتی۔"

●●

بے تکلف مہمان

جوہر سیوانی

ڈی اے۔ وی۔ ایم۔ پی اسکول ڈاکخانہ، ضلع سیوان (بہار)

بے تکلف جو ہے مہماں وہ ہے دشمن آپ کا
وہ تو آتے ہی نکالے گا پلیتھن آپ کا

آگیا تو پھر کبھی لے گا نہ وہ جانے کا نام
جیسے ہو میراث ہی اُس کی گھر آنگن آپ کا

جیسے دیمک دھیرے دھیرے چاٹ جاتی ہے درخت
ویسے ہی وہ صاف کر جائے گا راشن آپ کا

آپ کے بستر پہ سو جائے گا اطمینان سے
اور لگائے گا وہ مکھن کھا کے مکھن آپ کا

وضعداری آپ کو خاموش رکھے گی مگر
فکر سے پیلا پڑے گا روتے روشن آپ کا

ناشتے میں آپ تو کھائیں گے سوکھی روٹیاں
اور وہ کھایا کرے گا حلوہ سوہن آپ کا

اٹھتے ہی بستر سے پہلے اُس کو 'بڈ ٹی' چاہیے
پھر اُٹھا لے گا وہ بڑھ کر دانت منجن آپ کا

تیل، اسنو، پاؤڈر بھی آپ دینگے بعدِ غسل
اُوب جائے گا یہ نخرے دیکھ کر من آپ کا

بکس سے لے کر پہن لے گا وہ کپڑے آپ کے
اور منہ دیکھا کرے گا لے کے درپن آپ کا

آپ کی بیوی سے اکثر وہ کرے گا ہنس کے بات
قہقہوں سے روز ہی گونجے گا آنگن آپ کا

رشتہ داروں کے بھرے گا کان اس انداز سے
آپ سے ہو جائے گا بھائی بھی بدظن آپ کا

ہے جو نا شکرا تو اُس میں چھید بھی کر جائے گا
کھائے گا جس تھال میں کھانا مرغن آپ کا

رہتے رہتے رہ گیا دو تین ہفتے بھی اگر
آپ کے گھر کو بنا دے گا وہ مدفن آپ کا

نت نئی فرمائشیں اُس کی بنیں گی جاں کا روگ
یعنی کر ڈالے گا وہ جینا اجیرن آپ کا

آپ ہوتے جائیں گے کنگال پھنس کر جال میں
گھن کی صورت چاٹتا جائے گا وہ دھن آپ کا

دُم دبا کر بھاگ جائے گا وہ گھر سے بن کہے
مفلسی آجائے گی جب کرنے درشن آپ کا

جاتے جاتے ایک دھکا اور دیتا جائے گا
اینٹھ لے گا کچھ رقم مہمانِ پُرفن آپ کا

کچھ کتابیں، کچھ رسالے بھی اُڑا لے جائے گا
الغرض کچھ بھی نہ چھوڑے گا وہ رہزن آپ کا

دُور رہیئے ہر ایسے مطلبی مہمان سے
ورنہ جوہر نرک بن جائے گا جیون آپ کا

جہاں اپنی آخری [illegible] کے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کے لئے [illegible] آسیب کہہ رہا تھا۔

وہ ٹیکسی میں بیٹھی سوچ رہی تھی۔ راہ کیکتی کی خستہ دشواریوں سے … اُس نے کیسی کیسی مشکلوں کا سامنا کیا لیکن لطف سمیت سب مرحلوں کو اس نے طے کر لیا۔ سب سے بڑا مرحلہ تو انتظار کا ہوتا ہے۔ اس نے بھی کتنا انتظار کیا تھا۔ اور آج … آج وہ اپنی ماں کی آغوش میں پہنچ رہی تھی۔ کتنا لذت بخش اور سکون آفریں احساس ہے یہ!

وہ اپنے دل کو سنبھالے اپنی ماں کی کھولی تک پہنچ گئی۔ اسی دروازے سے تو وہ دُلہن بن کر نکلی تھی۔ وہ چند لمحوں کے لئے رُک گئی۔ دروازہ بند تھا۔ اُس نے پہلے [illegible]

اُس نے آہستہ سے کنڈی کھٹکھٹائی [illegible] دروازے سے اُس [illegible] کھولنے [illegible]

ایک چہرہ باہر نکلا۔ بوڑھی عورت کا چہرہ [illegible] … کی مرکھپ گئیں تھیں۔ لیکن وہ ریحانہ خلیق چہرہ تھا۔ وہ بے تابی سے اُس چہرے کی طرف بڑھی۔

"میں مریم ہوں سائرہ ماں کی بیٹی …"

"اچھا اچھا — تم ہو مریم!" وہ چہرہ اُس کے قریب کھسک آیا۔

"سائرہ بہن اندر ہی ہوں گی۔ سو رہی ہوں گی۔ وہ شہر میں تو میری بات ہوتی تھی۔ وہ پیالی میں آلو کی بھاجی بھی بھیجا کرتی تھیں۔ تم کُنڈی زور سے کھٹکھٹاؤ نا —"

تب اُس نے دروازہ اور بھی زور سے کھٹکھٹایا۔ اور پھر دھکا دیا۔ پُرانی وضع کی چٹخنی ایک جھٹکے سے گر گئی۔ دروازہ کھل گیا۔ وہ جھپٹ کر اندر داخل ہوگئی۔

اُس کی [illegible] [illegible] پھیل گئی تھی۔

[illegible] اُس [illegible]

"ماں!" اُس [illegible] چہرے کو دیکھا۔

اُس نے [illegible] ماں پہلی بار ماں کے دل کا احساس ہوا تھا۔ اُس وقت اُس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ لیکن آج … ماں نے اُس نے کس عالم میں دم توڑا تھا کہ اُس کی نیم وا آنکھیں دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں اور آدھ کھلے ہونٹ — جیسے کہہ رہے ہوں —

"دروازہ کھول دو! دروازہ کھول دو! میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔ میں ابھی مرنا — نہیں چاہتی"

●●

بے تکلف مہمان

جوہر سیوانی

ڈی اے۔ وی۔ ایم۔ پی اسکول، ڈاکخانہ، ضلع سیوان (بہار)

بے تکلف جو ہے مہماں وہ ہے دشمن آپ کا || وہ تو آتے ہی نکالے گا پلیتھن آپ کا

آگیا تو پھر کبھی لے گا نہ وہ جانے کا نام || جیسے ہو میراث ہی اُس کی گھر آنگن آپ کا

جیسے دیمک دھیرے دھیرے چاٹ جاتی ہے درخت || ویسے ہی وہ صاف کر جائے گا راشن آپ کا

آپ کے بستر پہ سو جائے گا اطمینان سے || اور لگائے گا وہ مکھن کھا کے مکھن آپ کا

وضعداری آپ کو خاموش رکھے گی مگر || فکر سے پیلا پڑے گا روئے روشن آپ کا

ناشتے میں آپ تو کھائیں گے سوکھی روٹیاں || اور وہ کھایا کرے گا حلوہ سوہن آپ کا

اٹھتے ہی بستر سے پہلے اُس کو 'بڈ ٹی' چاہیے || پھر اُٹھا لے گا وہ بڑھ کر دانت منجن آپ کا

تیل، اسنو، پاؤڈر بھی آپ دینگے بعدِ غسل || اُوب جائے گا یہ نخرے دیکھ کر من آپ کا

بکس سے لے کر پہن لے گا وہ کپڑے آپ کے || اور منہ دیکھا کرے گا لے کے درپن آپ کا

آپ کی بیوی سے اکثر وہ کرے گا ہنس کے بات || قہقہوں سے روز ہی گو نجے گا آنگن آپ کا

رشتہ داروں کے بھرے گا کان اس انداز سے || آپ سے ہو جائے گا بھائی بھی بدظن آپ کا

ہے جو نا شکرا تو اُس میں چھید بھی کر جائے گا || کھائے گا جس تھال میں کھانا مرغن آپ کا

رہتے رہتے رہ گیا دو تین ہفتے بھی اگر || آپ کے گھر کو بنا دے گا وہ مدفن آپ کا

نت نئی فرمائشیں اُس کی بنیں گی جان کا روگ || یعنی کر ڈالے گا وہ جینا اجیرن آپ کا

آپ ہوتے جائیں گے کنگال پھنس کر جال میں || گھن کی صورت چاٹتا جائے گا وہ دھن آپ کا

دُم دبا کر بھاگ جائے گا وہ گھر سے بن کہے || مفلسی آجائے گی جب کرنے درشن آپ کا

جاتے جاتے ایک دھکا اور دیتا جائے گا || اینٹھ لے گا کچھ رقم مہمانِ پُرفن آپ کا

کچھ کتابیں، کچھ رسالے بھی اُڑا لے جائے گا || الغرض کچھ بھی نہ چھوڑے گا وہ رہزن آپ کا

دُور رہیئے دُور ایسے مطلبی مہمان سے

ورنہ جوہرؔ نرک بن جائے گا جیون آپ کا

لٹیرے

ظفر احمد نظامی

شعبہ سیاسیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ
جامعہ نگر، نئی دلّی ۱۱۰۰۲۵

●

محترمی رحمٰن نیر صاحب!
سلام مسنون
آپ کا خط ملا۔ تعمیل میں نئی کہانی لٹیرے بھیج رہا ہوں۔ ڈاکوؤں کے موضوع پر بے شمار کہانیاں لکھی گئی ہیں لیکن یہ کہانی قدرے مختلف ہے۔ امید ہے کہ آپ کو "نور بیسویں صدی" کے قارئین کو پسند آئے گی۔
آپ کا:
ظفر احمد نظامی

سورج کو پہاڑیوں کے دامن میں پناہ گزیں ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی۔ سُرمئی فضاؤں میں لپٹی ہوئی شام کا دُھندلکا ماحول کو پُراسرار بنا رہا تھا۔ سناٹے کی حکمرانی تھی۔ دُور تک کسی انسانی وجود کا نشان نہ تھا۔ لیکن خاموشی کا سینہ چیرتی ہوئی بس کی آواز ناگن کی طرح رینگنے والی سڑک پر گونج رہی تھی۔ ڈرائیور ونڈ اسکرین سے باہر کا جائزہ لے رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ اسٹیئرنگ سے چمٹے ہوئے تھے اور پاؤں ایکسی لیٹر کے دباؤ کی طاقت کا اندازہ کرنے میں مصروف۔ اُس کی کوشش تھی کہ جس طرح ممکن ہو اس علاقہ کی حد سے باہر نکل جائے جہاں انسانی وجود عفریت کی شکل میں نمودار ہو کر موت کے سائے کی طرح منڈلانے لگتا تھا، لاقانونیت ہی قانون سے موسوم ہوتی تھی اور جہاں ظلم و جبر ہی عدل و انصاف سے تعبیر کیے جاتے تھے۔ وہاں نہ جان کا تحفظ تھا نہ مال کی سلامتی کی ضمانت۔ وہاں تو بندوق کی گولی ہی کسی سوال کی مانند باآواز بلند اُبھرتی اور آپ ہی اپنا جواب بن کر خاموش ہو جاتی ——

یہ سارا علاقہ اُن خوفناک انسانوں کی ملکیت تھا جو سماج سے بغاوت کرنے کے بعد باغی کا لقب اختیار کر لیتے تھے اور جنھیں ڈاکوؤں کے نام سے یاد کر کے مائیں اپنے بچوں کو ڈرایا کرتی تھیں۔ پہاڑیوں کا طویل سلسلہ ہی اُن کی پناہ گاہ تھا۔ یہاں کبھی پولیس اِن کا مقابلہ کرتی تو بندوقوں سے آگ اُبلنے لگتی، دونوں طرف کی جانیں تلف ہوتیں۔ پولیس افسر سمجھتے کہ وہ کامیاب رہے اور باغی خوش ہوتے کہ اُنھوں نے دشمنوں کو شکست دے دی۔ کچھ روز خاموشی رہتی لیکن پھر وہ اپنی سرگرمیوں سے آبادی کے لیے وبالِ جان بن جاتے۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ سورج چھپنے سے پہلے ہی اُس علاقہ سے گزر جاتے اور شام کی تنہائیوں اور رات کی تاریکیوں کو اس ویران بستی کے پوشیدہ مکینوں کے لیے چھوڑ جاتے۔

ڈرائیور تیز رفتاری سے بس کو اندھیرا ہونے سے پہلے ہی آبادی کی حد میں پہنچا دینا چاہتا تھا۔ بس میں بیٹھے ہوئے پچاس مسافر بھی فکرمند تھے۔ وہ بار بار پہلو بدلتے اور کھڑکی سے باہر جھانک کر فاصلہ کا اندازہ کرنے لگتے۔

"کتنے بج گئے؟" مولوی احمد دین نے پوچھا۔

"ساڑھے چھے!" پنڈت رام اوتار نے جواب دیا۔

"بہت دیر ہو گئی۔"

"ہاں، رات ہونے والی ہے!"

"ڈرائیور تو پوری کوشش کر رہا ہے۔"

"وہ بے چارہ بھی کیا کرے، مشین پرانی کا کیا بس، پہیہ ہی خراب ہو گیا تھا ورنہ اب تک تو کبھی کے پہنچ گئے ہوتے۔"

"ہاں بھیّا، کیا خبر تھی، ورنہ میں تو کبھی ادھر کا رُخ نہ کرتا۔"

بہادر شاہ ظفر کے دربار میں ذوق دہلوی بھی حاضر تھے کہ ایک مرشد زادے تشریف لائے اُنھوں نے آہستہ آہستہ بادشاہ سے کچھ کہا اور رخصت ہو گئے۔ حکیم احسن اللہ خاں بھی موجود تھے۔ انھوں نے عرض کیا کہ صاحبِ عالم! اِس قدر جلدی یہ آنا کیا تھا اور یہ تشریف لے جانا کیا تھا۔ صاحبِ عالم کی زبان سے نکلا کہ اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے۔ ظفر نے یہ سُن کر ذوق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ استاد! دیکھنا کیا صاف مصرعہ ہوا ہے۔ ذوق نے بے توقف مطلع عرض کر دیا ؎

لائی حیات آئی قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

"آنے کی یہاں بھی کیسے پڑی تھی مولوی صاحب کام نہ ہوتا تو میں بھی کاہے کو آتا۔"

"ویسے ہمارے پاس دھرا ہی کیا ہے پنڈت جی۔"

"جان تو ہے!"

"ہاں بھیا، جان ہے تو جہان ہے!"

"اور جان ہے تو ایمان ہے!"

"یوں کہو کہ ایمان ہے تو جان ہے!"

"چلو یوں ہی سہی۔"

"افسوس آج مغرب کی نماز قضا ہو گئی۔"

"اور میری سندھیا گئی۔"

"اللہ کی مرضی۔"

"ہاں بھائی، بھگوان کی اچھا ــــــ"

پنڈت جی نا تا ہی کہہ پائے تھے کہ اچانک فضا میں چنگاریاں اڑنے لگیں۔ بندوق کی گولیوں کی آواز اُبھر کر سناٹے پر ضرب کاری لگاتی ہوئی سہمی مسافروں کو سہا گئی۔ ڈرائیور کا ہاتھ اسٹیرنگ سے بہک گیا اور اُس کے پاؤں سے ایکسی لیٹر کی گرفت جاتی رہی۔ بس ٹھہری ہی تھی کہ خاکی وردی والے کے خوفناک چہرے ابھرے۔ اُن کے ہاتھوں میں بندوقیں تنی ہوئی تھیں اور آنکھوں سے وحشت اور دہشت برس رہی تھی۔ اُن میں سے کچھ بس پر آ چڑھے اور مسافروں کو نشانہ پر لینے کے بعد انھوں نے ڈرائیور سے الگ پہاڑی راستے پر ایک پگڈنڈی کی طرف چلنے کا حکم دیا۔ بس اُسی طرف چل پڑی۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو گیا کہ کوئی مسافر کچھ سمجھ ہی نہ سکا، پھر بغیر کچھ کہے سُنے سب لوگ اِس اچانک ہیبت کا مطلب سمجھ گئے کیونکہ اب انھیں گرفتار کر کے ڈاکوؤں کے کسی پڑاؤ کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ پنڈت جی آنکھیں موند کر جپ کرنے لگے اور مولوی صاحب یکسوئی سے وظیفہ میں مصروف ہو گئے۔ دوسرے مسافر بھی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق مالک کو یاد کرنے لگے۔

راستہ پتھریلا تھا اِس لیے بس کی رفتار بھی سُست تھی۔ لیکن وہ جس سُست رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی مسافروں کے دل اتنی ہی تیزی سے دھڑک رہے تھے۔ کسی کو کچھ معلوم نہ تھا کہ کہاں جانا ہے، اُن کے ذہنوں میں تو صرف ایک ہی بات گونج رہی تھی کہ پہاڑی کے دامن میں باغیوں کا بسیرا ہے اور اُس بستی میں پہنچنے کا مطلب تھا اغوا یا موت! اغوا کی شکل میں اُن کے عزیزوں سے رقم طلب کی جاتی اور ادائیگی نہ ہونے کی صورت میں موت ہی اُن کا مقدر ہو کر رہ جاتی۔ اِن دو صورتوں کے سوا کوئی تیسری ایسی صورت نہ تھی جس سے رہائی ممکن ہوتی۔ باغیوں کی لُغت میں رعایت نام کا کوئی لفظ نہیں ہوتا۔ کچھ دیر بعد جب کئی پیچ و خم سے گزر کر بس ایک کھلے مقام پر پہنچی تو انجن کی گھڑگھڑاہٹ بھی صدا پا گئی۔ سپاہی سے ایک اپنی بندوقوں کے سہارے آرام کرتے نظر آئے۔ بس کی آواز سُن کر اُن میں سے کچھ نے اپنی بندوقوں کو سنبھالا اور بس کو اپنے گھیرے میں لے کر کھڑے ہو گئے۔

"چُپ چاپ نیچے اُتر آؤ!" خوفناک چہرے والے ایک وردی پوش نے حکم دیا اور مسافر ایک ایک کر کے بس سے نیچے اُتر گئے۔

"اُدھر چلو!" مسافروں کو دوسرا حکم ملا۔ جس طرف چلنے کو کہا گیا تھا اُدھر ایک بڑا سا خیمہ نصب تھا۔ سب نے بے چون و چرا تعمیل کی۔

"سردار ملزم حاضر ہیں!" ایک دوسرے وردی پوش نے ہانک لگائی۔ خیمہ سے باہر درخت کے نیچے بہت سے لوگوں کے گھیرے میں بیٹھے ہوئے ایک سیاہ فام لحیم شحیم شخص نے آواز سُن کر بڑی بے نیازی سے سر اٹھایا۔ اُس کی آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں۔ کچھ قتل و غارت کے باعث اور کچھ شراب کے نشہ کا اثر تھا۔ لیکن اُس کے حواس برقرار تھے۔

"کہاں سے لایا ہے اِنھیں؟"

"سڑک پر جا رہے تھے سردار!"

"کہاں؟"

"پرلے گاؤں۔"

"ہوں" کہہ کر سردار اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اُس نے بہت اطمینان سے اپنی بوتل سنبھالی، اُسے منہ سے لگا کر ایک ہی گھونٹ میں ختم کر دیا اور بوتل کو زمین پر پٹخ کر مسافروں کا جائزہ لینے لگا۔ عورتوں نے سہم کر آنکھیں بند کر لیں اور مردوں کی نظریں زمین میں گڑ گئیں۔ کسی میں اُس سے آنکھیں چار کرنے کی جُرأت نہ تھی۔

"جانتے ہو، کس کے سامنے کھڑے ہو؟"

اُس نے سوال کیا، سب خاموش رہے۔

"نہیں جانتے تو اب جان لو تم ... سنگھ

کی عدالت میں حاضر ہو!" اور ظالم سنگھ کا نام سنتے ہی مسافروں کی نظریں حیرت سے اُس کی طرف اٹھیں اور پھر ایک گہرے خوف کے احساس سے ایسی جھکیں کہ پھر نہ اُٹھ سکیں۔ اُن کے ذہن میں ظالم سنگھ کے مظالم کی تصویر گھوم گئی۔ کسی کو تڑپتا اور مرتا ہوا دیکھ کر اُسے دلی تسکین ہوتی تھی۔ اغوا اُس کا محبوب مشغلہ تھا اور گولی چلانا اُس کی پسندیدہ تفریح تھی۔ کتنی ہی ماؤں کا سیندور اُس کی بندوق کی نذر ہو گیا تھا۔ عورتیں اُس کا نام سن کر کانوں میں انگلیاں دینے لگیں۔ اور آج بس کے سارے مسافر اُسی ظالم سنگھ کے آگے سر جھکائے کھڑے تھے!

اچانک ظالم سنگھ کی آواز اُبھری۔

"معلوم نہیں اِن پہاڑیوں میں خطرے پلتے ہیں؟"

"معلوم تھا" کسی نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا۔

"تو پھر اِس وقت اِدھر سے گزرنے کی ہمت کیوں کی؟"

"بس خراب ہو گئی تھی ٹھاکر، اِس لیے دیر ہو گئی" ڈرائیور نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"بس خراب ہو گئی تھی تو اب بے بس ہو جاؤ!" یہ کہتے ہوئے ظالم سنگھ نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور کہا "تلاشی لو ان کی ... اور دیکھو بس کی تلاشی بھی لے لینا" اُس کے ساتھی آگے بڑھے ہی تھے کہ ظالم سنگھ کی آواز پھر گونجی۔

"اچھا تم میں سے جو کوئی موٹی اسامی ہو وہ خود ہی آگے چلا آئے" سب خاموش رہے۔

"لوگو سبھی بھک منگے ہو؟"

"ہاں بھک منگا ہی سمجھو ٹھاکر" پنڈت رام اوتار کی آواز اُبھری۔

"کون ہو تم؟"

"بھیکھ مانگ کر پیٹ بھرتا ہوں"

"او تو پجاری ہو"

"ہاں مہاراج"

"ہم میں سے کوئی بھی مالدار اسامی نہیں ہے ٹھاکر" مولوی احمد دین نے وکالت کی

"تم کیا کرتے ہو؟"

"خدا سے لو لگائے رہتا ہوں"

"اچھا، مولوی ہو ——— یہ بتاؤ کہ خدا کے بندوں سے بھی لو لگائی ہے کبھی؟"

"کیوں نہیں، اُنھیں کے لیے دعائیں کرتے کرتے یہ بال سفید ہوئے ہیں"

"اور تم؟" اچانک ظالم سنگھ نے ایک اور شخص سے پوچھا۔

"میرا نام روی داس ہے، چھوٹی سی دوکان ہے میری"

"او تو بیوپاری ہو"

"بیوپاری تو بڑے لوگ ہوتے ہیں ٹھاکر، میں تو پیسے دو پیسے کا دوکاندار ہوں"

"کتنا مال ہے جیب میں؟"

"یہی کوئی دو چار سو ہوں گے مالک"

پھر ظالم سنگھ دوسروں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مسافروں نے ڈرتے ڈرتے سب کچھ اُگل دیا۔ اُن میں سے زیادہ تر کاشتکار تھے۔ اُن کے لباس ہی اُن کی پریشان حالی کی نشاندہی کے لیے کافی تھے۔ لیکن سبھی جانتے تھے کہ ڈاکوؤں کو اِن کی امیری اور غریبی سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ تو اپنا حق چاہتے ہیں چاہے کوئی اُسے دینے کا اہل ہو یا نہ ہو۔ اُن کے نزدیک تو ہر وہ شخص مجرم ہے جو سماج میں سکون کی زندگی گزار رہا ہو۔

"بس میں کچھ نہیں ہے سردار!" تلاشی لے کر آنے والے ساتھی کی آواز سن کر ظالم سنگھ کے دل میں یک بیک نہ جانے کیا خیال آیا اُس نے دوسرے ساتھی کو حکم دیا۔

ایک دن صبح حکیم مومن خاں مومن کے ایک شاگرد میاں خیرالدین یاس اُن کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اُستاد! ایک مصرعہ کہا ہے ؎

کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

رات بھر پہلا مصرعہ لگانے کی کوشش کرتا رہا ہوں لیکن کامیابی نہیں ہوئی" مومن نے کہا مصرعہ پھر پڑھنا۔ یاس نے مصرعہ دہرایا۔

مومن نے اُسی وقت شعر اِس طرح مکمل کر دیا ؎

ابھی اِس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخیٔ نقشِ پا کی

"ایک کپڑا لاؤ!" فوراً ایک بڑا سا کپڑا لایا گیا۔

"اِسے زمین پر بچھا دو" کپڑا زمین پر بچھا دیا گیا۔ ظالم سنگھ نے مسافروں سے کہا۔

"جو کچھ تمہارے پاس ہو ڈال دو سب اِس کپڑے پر۔!"

دیکھتے ہی دیکھتے کپڑے پر روپیوں پیسوں کا انبار لگ گیا۔ عورتوں نے کانوں اور ہاتھوں سے زیورات اُتار کر ڈالے، نوٹوں کی گڈیاں سیٹھ روی داس کی جیب سے نکلیں، مولوی صاحب اور پنڈت جی نے بھی کچھ سکے کپڑے پر پھینکے اور بس کنڈکٹر نے ٹکٹوں کی رقم کی تھیلی بھینٹ چڑھائی۔

جب سب کے ہاتھ تھم گئے تو ظالم سنگھ نے ایک ساتھی سے کپڑے پر ڈالی گئی رقم کو گننے کا حکم دیا۔ زیور کے علاوہ کل رقم ڈیڑھ ہزار روپے تھی۔ روپے کی گنتی سن کر ظالم سنگھ نے قہقہہ لگایا اور چلا کر کہا۔

[illegible] پڑی
بس۔ لیکن [illegible] بیٹھے ہو
ڈیڑھ ہزار [illegible] تک جنتا رہا
مذاق اُڑا [illegible] مسافروں کی ہر جنبشِ لب کو اپنے
لیے موت کا پیغام سمجھتے رہے۔ انھیں کبھی ایسی
صورتِ حال سے واسطہ نہ پڑا تھا۔ ظالم سنگھ کے
قصے ہی سُنے تھے۔ اُسے دیکھنے کا اتفاق پہلی بار ہوا۔
ظالم سنگھ پھر دہاڑا۔

"جانتے ہو ڈیڑھ ہزار روپے تو ظالم سنگھ
کے ساتھیوں کی ایک دن کی دارو کے لیے بھی کافی
نہیں —!" اُس نے دوسری بوتل منہ سے لگا لی
تھی۔ لوگ سوچنے لگے اب ظالم سنگھ آگے بڑھے گا،
انھیں اپنے ساتھیوں سے رسیوں سے بندھوائے گا
اور اِن کے وارثوں سے مزید رقم کا مطالبہ کرے گا،
ادائیگی نہ ہونے کی صورت میں انھیں موت کے گھاٹ
اُتار دے گا۔ اُن کی نگاہوں میں اُن کے بیوی بچوں کے
اُداس چہرے گھومنے لگے۔ ظالم سنگھ کی آواز
سنجیدہ ہو [illegible] گونجی — [illegible]
[illegible] بھگوان نے بھیجے [illegible]
دے دے! انھیں کو دے دے چار دن کی دال سبزی بن جائے گی۔"
مسافروں کو خیال ہوا کہ ٹھاکر دل لگی کے موڈ میں ہے،
مذاق کرنے کے بعد انھیں گولی سے اُڑا دے گا۔

"سنو!" ظالم سنگھ پھر گرجا۔ "تم میں سے
جس نے جتنی رقم ڈالی تھی ایک ایک کر کے آگے بڑھتا
جائے اور اپنے روپے لے کر چلا جائے۔" یہ کہتا ہوا
ظالم سنگھ جیپ کی طرف مُڑ گیا اور مسافر کچھ دیر پھوٹ
پڑے کچھ دوسرے مسافر اپنی رقم اٹھانے جیپ کی طرف
دوڑ پڑے۔ جلدی جلدی کپڑے، پرس، روپے سمیٹ کر
جب سب لوگ گرتے پڑتے بھاگ کر بس میں جا بیٹھے
تو ڈرائیور نے بھی دیر نہ لگائی۔ بس فوراً ہی اسٹارٹ
ہو گئی۔ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ظالم سنگھ
جیسے [illegible] کے چنگل سے بچ کر آ رہا ہے۔ [illegible]
خوش تھا کہ اُس کی جان بچی ہو گئی [illegible]
[illegible] پھینک دی تھی۔ اُس کی
آدھی [illegible] دوسرے مسافر بھی خوش
تھے کہ انھوں نے اپنی جیب سے پیسے ہوئے نوٹوں
سے کچھ گنا زیادہ نوٹ اُٹھا لیے تھے۔ پنڈت جی نے
کرتے کی جیب میں کڑکڑاتے ہوئے نوٹوں کو چھوتے
ہوئے کہا "بھگوان کی کرپا ہو گئی" اور مولوی
صاحب نے سو سو کے نوٹوں کو مضبوطی سے مٹھی
میں جکڑتے ہوئے کہا "اللہ تیرا شکر ہے!" جیسے
انھوں نے سارے مسافروں کی طرف سے خدا کا شکر
ادا کر دیا ہو اور بس میں بیٹھے ہوئے کچھ لوگ سوچ
رہے تھے دراصل لٹیرا کون ہے، ظالم سنگھ یا
اِن کے ساتھی مسافر؟ ●●

کھڑکیاں بند ہیں

خوشتر مکرانوی
نوربلخی منزل مکرانہ ۳۴۱۵۰۵

●

کھڑکیاں بند ہیں مکانوں کی
سب کواڑوں کے لب مقفل ہیں
گھٹتی چیخیں سنائی دیتی ہیں
جیسے تہذیب ہو گئی محبوس
اور سنسار ہو گیا ننگا
ان گھروں کی کلید کس سے ملے
کس سے اُجڑے ہوئے مکیں پوچھیں
قہقہوں تالیوں کی آوازیں
چاروں جانب سے بڑھتی آتی ہیں
ان مکانوں کی کنجیاں جن میں
ہر زمانے کی قید ہے تہذیب
باہیں تالوں کی کھل نہیں سکتیں
طاقتوں کا وجود پژمردہ
کوششوں کا سفر بھی بے معنی
کنجیوں کو نگل چکے ہیں لوگ
کند ذہنوں میں ڈھل چکے ہیں لوگ

دشمنِ جاں

شوق ماہری
(کھنڈوہ)

●

بوئے نسرین و سمن ہے کہ جوانی تیری
نرم کانٹوں کی چبھن ہے کہ جوانی تیری
چمپئی رنگ میں پگھلے ہوئے سونے کی جھلک
کیف صہبائے کہن ہے کہ جوانی تیری
اُلجھے اُلجھے سے یہ گیسو ہیں کہ ساون کی گھٹا
صبح کی پہلی کرن ہے کہ جوانی تیری
تیری دُزدیدہ نگاہی ہے کہ غالبؔ کی غزل
میرؔ کا طرزِ سخن ہے کہ جوانی تیری
مُسکراہٹ تری ظلمت میں چراغاں کردے
خامشی تیری ستاروں کو غزل خواں کردے
تیرے جذبات کی گرمی تری شوخی کی نسیم
پھول تو پھول ہیں کانٹوں کو گلستاں کردے
تیری رفتار کے جادو کی خدائی تسلیم
تو جسے چاہے اُسے چاک گریباں کردے
دشمنِ جاں! تری نوخیز جوانی کی قسم
تو جہاں جائے وہاں قتل کا ساماں کردے

افسانہ

آئینہ

ایس۔ ٹی۔ ایم۔ عاصم

آسٹرا ہاؤس۔ ملے پلی۔ فیصل خانہ
حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۰۱

●

برادرم نیر صاحب۔ السلام علیکم
ایک شادی کی دعوت کے سلسلے میں دہلی حاضر ہوا تھا۔ پتہ چلا کہ آپ بیرونِ ہند کے سفر پر روانہ ہو چکے ہیں۔ جہاں آپ سے ملاقات نہ ہونے کا ملال ہوا وہیں آپ کے اس بیرونِ سفر پر مسرت ہوئی۔ خدا آپ کو اور کامیاب کرے دن دونی رات چوگنی ترقی دے۔ آپ کی عنایتوں اور حوصلہ افزائیوں کے ہدیۂ عقیدت کے طور پر ایک کہانی جو "بیسویں صدی" کے لیے بطورِ خاص لکھی تھی وہ آپ کی نذر کر رہا ہوں۔ یہ کہنے کی شاید چنداں ضرورت نہیں ہے کہ میں نے سنہ ۱۹۵۳ء سے کہانیاں لکھنے کی ابتدا کی تھی جبکہ علم نجوم کو سنہ ۱۹۵۷ء سے سیکھنا شروع کیا۔ علم نجوم اپنی ذاتی کشش کی بنا پر میرے فن افسانہ نگاری پر حاوی تو نہ ہو سکا۔ لیکن علم نجوم کی پریکٹس کے سبب کہانیاں لکھنے اور چھپوانے کا موقع نہ مل سکا۔ عاصم

ڈیر آنی۔۔۔!

تیرا خط اب کی بار بہت انتظار کے بعد ملا ہے۔ تُو تو جانتی ہے میں اپنے گھر میں تنہا رہتی ہوں۔ تنہائی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میرے سوا یہاں کوئی اور نہیں رہتا۔ گھر کے دوسرے لوگوں کی موجودگی میں بھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہر طرف سناٹا ہے اور میں تنہا ہوں۔ اکثر ورانڈے میں گم سم بیٹھی رہتی ہوں۔ نگاہیں دیوار پر لگے قدِ آدم آئینے میں اپنے عکس اور سدا اپنے آپ سے لڑتی ہوئی چڑیوں پر گڑی رہتی ہیں۔ یہ نظارہ نہ جانے کیوں مجھے اتنا اچھا لگتا ہے کہ گھنٹوں دیکھتی رہتی ہوں پھر بھی وقت کے گزرنے کا پتہ چلتا ہے اور نہ اپنی ہی کچھ خبر رہتی ہے۔ یہ چڑیاں ہر آن غیر کے دھوکے میں اپنے آپ سے لڑتی رہتی ہیں۔ جب لڑتے لڑتے تھک کر ایک طرف کو گر جاتی ہیں تو بے ساختہ مجھے ہنسی آجاتی ہے۔ جیسے یہ سمجھتی ہیں کہ انھوں نے اپنے حریف کو گرا دیا ہے اُن کی چونچ کی ضربوں سے آئینہ ہی زخمی ہو کر دھندلا نہیں جاتا اُن کا وجود بھی کچھ کم مجروح نہیں ہوتا۔ یہ نظارہ مری تنہائی کا ساتھی ہے۔ لیکن وجیہہ کو اس نظارہ سے نہ جانے کیوں خدا واسطے کا بیر ہے۔ لیکن وہ مجھے کچھ کہنے کی بجائے بے چاری معصوم اور بے زبان چڑیوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ آئینے کو پردہ سے ڈھک دینے پر بھی یہ ڈھیٹ چڑیاں پردے کے اندر پہنچ کر لڑنے سے باز نہیں آتیں۔ کھسیانے ہو کر وہ کبھی کبھی اُن چڑیوں میں سے کسی کو دبوچ کر مار بھی ڈالتے ہیں۔ اور اُن کے مُردہ جسم آئینے کے ساتھ لٹکا کر اپنی دانست میں یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اب کبھی یہ چڑیاں اس آئینے کا رُخ نہ کریں گی۔ لیکن اُن چڑیوں کو اتنی سمجھ ہوتی تب نا! چڑیاں تو چڑیاں ہی ہیں۔ بے زبان، ناسمجھ اور معصوم۔ لیکن میں۔۔۔؟ یہی حال تو کچھ میرا بھی ہے۔ چڑیاں جیسے اپنے عکس کو غیر سمجھ کر اپنے آپ سے لڑتی ہیں اُسی طرح میں اُس عکس سے آج بھی برسرِ پیکار ہوں جو ہنوز رحمیؔ کا بنا ہوا ہے۔ میرے لیے میرے وجود کا یہ عکس کچھ اتنا انمٹ، ناقابلِ تسخیر اور اٹوٹ بن گیا ہے کہ مدتیں گزر جانے کے بعد بھی یہ جنگ ہنوز جاری ہے۔ نہ جانے کب تک یہ جنگ جاری رہے گی؟ میں تو کب کی ہار چکی ہوں اور رحمیؔ سے وابستہ میرے وجود کا عکس اب میرے وجود کے متوازی ہی رہتا بستا ہے جب بھی کوئی یہ بات مجھ سے کہتا ہے تو میں سہم کر انجان بن جاتی ہوں۔۔۔

"ارے بھئی یہ منّو نہ جانے کس پر گیا ہے۔ اپنے ماں باپ سے اس کی شکل و صورت تو ملتی نہیں۔

کچھ بھی ہو لیکن ہے یہ بڑا ذندہ حل!

کہتے ہیں جو من میں بستا ہے۔ خیالوں میں گھر کر لیتا ہے اور نس نس میں خون کی طرح دوڑتا پھرتا ہے۔ شاید لاشعوری طور پر بلکہ غیر شعوری طور پر بچوں کی شکل و شباہت اور خدوخال پر اس کا گہرا اثر بھی پڑتا ہے۔ ورنہ ممّو پر اور وجیہہ کا بیٹا کہلا کر بھی جمّی جیسا ہر گز نہ لگتا۔۔۔ یوں تو بظاہر میں بھی کہنے کے لیے وجیہہ کی بیوی ہوں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ میرے اندر کا وجود آج بھی جمّی کا ہے۔ اس وجود کے انمٹ عکس کو اپنے آپ میں سے کھرچ کر پھینک دینے کی مسلسل میری کوشش نے مجھے اپنے آپ ہی سے نہیں سب سے کاٹ کر الگ کر دیا ہے اور سب ہیں کہ مجھے نیم پاگل سمجھتے ہیں۔ جمّی ٹھیک ہی کہا کرتا تھا۔ آج بھی اُس کے الفاظ میرے کانوں میں بازگشت بن کر گونجتے رہتے ہیں۔

رَفّو۔۔۔! مجھ سے اس طرح اچانک اور غیر متوقع ترکِ تعلق کے بعد تم یہ سمجھتی ہو کہ تم مجھے بھول سکو گی۔۔؟ نہیں میری جان۔ کبھی نہیں! اس بات کو تو ناممکن ہی سمجھ لو۔ میں تم سے خوب واقف ہوں اور اس سے بھی زیادہ خود اپنے پیار سے مجھے اتنا یقین ہے کہ میرا پیار جسے میں نے اپنے خونِ دل سے سینچا ہے، جب تک ہمارے وجود میں خون کی روانی موجود ہے کبھی نہیں مٹ سکتا۔ پھر تم اپنی کوشش ضرور کر دیکھو۔ میں تمہیں کبھی نہ روکوں گا۔ تم سے اپنے پیار کی کبھی بھیک بھی نہ مانگوں گا۔ اگر زندگی باقی رہی تو میرے اس ہونے کی حقیقت تم خود جان جاؤ گی بلکہ اس کی تصدیق بھی کرنے لگو گی۔"

نہ جانے کس جذبے کے تحت اپنے لیے وجیہہ کا پیام آنے پر میں نے چپ سادھ لی۔ ورنہ میں چاہتی تو جمّی کی عملی زندگی کے شروع ہونے تک انتظار سے مجھے کوئی روک نہ سکتا تھا۔ شاید وجیہہ کی سماجی حیثیت نے مجھے گونگی بنا دیا تھا پھر وجیہہ کے ساتھ (جو لاس اینجلز میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز تھا۔) سمندر پار کی دنیا دیکھنے کا شوق، متوقع تابناک مستقبل کی چکا چوند نے میری آنکھوں کو خیرہ کر دینے کے ساتھ میری قوتِ گویائی بھی چھین لی تھی۔ وجیہہ کی بننے سے پہلے میں نے جمّی سے کیے گئے سارے عہد و پیماں بہت آسانی سے بھلا دیے لیکن وجیہہ کی بن جانے کے بعد، دنیا کی ہر خوشی اور عیش و راحت کو اپنے قدموں میں دیکھنے کے بعد سوچتی ہوں کوئی مجھ سے میرا سب کچھ لے لے لیکن مجھے صرف میرا جمّی لوٹا دے۔۔۔! لیکن وجیہہ۔۔۔ وہ تو جمّی سے بھی بڑھ کر میرا دیوانہ ہے!

پچھلے سال ہم ایکسپو ۷۰ (EXPO -70) دیکھنے جاپان گئے تھے۔ چلتے چلتے اچانک راہ میں جمّی مل گیا، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے میرا خدا مل گیا! جب اُس کا ہمارا سامنا ہوا تو وہ ہمیں بالکل ہونقوں کی طرح گھورنے لگا۔ وجیہہ کھسیانے ہو کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگے کہیں میں نے اپنے نیم پاگل پن میں کسی اجنبی کو تو جمّی نہیں سمجھ لیا۔

"جمیل بھائی! میں رفیعہ ہوں اور یہ ہیں میرے شوہر ملک وجیہہ!"

"ارے تم رفیعہ ہو۔۔۔؟؟ لاحول ولا قوۃ! میں بھی کتنا احمق ہوں۔ تمہیں پہچان نہ سکا۔ بائی گاڈ تم تو پہچانی بھی نہیں جاتیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اتنے برسوں میں تم پناگیٹو بن کر رہ گئی ہو آخر کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ اچھی تو ہو نا۔۔۔" یہ کہہ کر جب وہ میری آنکھوں میں جھانکنے لگا تو فوراً اس نے منہ پھیر کر اپنی آنکھوں کے کواڑ بند کر لیے کہ کہیں رازِ دل زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا کر آنکھوں کے قفس سے باہر نہ آ جاتے اور میں سدا کے لیے خالی خالی نہ رہ جاؤں۔۔۔ باتوں باتوں میں جمّی نے جب یہ بتایا کہ وہ بھی تقریباً ایک سال سے لاس اینجلز ہی میں مقیم ہے اور آرکیٹیکچر میں ڈگری لینے کے بعد اُس نے یہاں پریکٹس بھی شروع کر دی ہے تو یہ سن کر میں بہت حیران ہوئی کہ کہیں وہ میرے تعاقب میں تو یہاں نہیں پہنچ گیا۔۔۔؟؟

ایکسپو ۷۰ کی ساری رونق، چمک دمک، رنگا رنگی، بے پناہ کشش، گہما گہمی اور سرمستی و تفریح کا میرا سارا موڈ اچانک خوابِ پریشاں بن گیا اور جمّی کا وجود کسی تنکے کی طرح میری آنکھوں میں جم کر رہ گیا۔ میری بے تابی اور بے چینی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی۔ راستہ میں وجیہہ کے کچھ شناسا مل گئے تھے اور وہ اُن سے باتوں میں اتنا کھو گئے کہ میں آنکھ بچا کر چپ چاپ قریب کے ریستوران میں چلی گئی سامنے ہی اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے جمّی کو دیکھ کر میرے قدم ٹھٹھک کر رک گئے۔ لیکن شاید اُس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اُس کی آواز نے مجھے ٹوک دیا۔

"آخر تم میرا تعاقب کرتے کرتے یہاں تک پہنچ گئیں۔۔۔" اُس کی یہ بات سن کر میں تو سناٹے میں آ گئی اور وہ دُور خلاؤں میں گھورتے ہوئے شرارت سے سیٹیاں بجانے لگا۔ اچھا ہوا کہ میں اکیلی یہاں آئی ورنہ وجیہہ نے یہ بات سنی ہوتی تو میرا کیا ہوتا۔۔۔؟ جمّی کی ان شرارتوں ہی سے جی بہت ڈرتا تھا۔ پتہ نہیں کب کیا بول جائے۔

احتجاج کروں تو "محض تفریح" کہہ کر معصوم بن جائے گا۔

"جس کا یقین تھا وہ سامنے آ ہی گیا۔ میں نے کہا تھا نا کہ ہم ایک بار پھر زندگی میں کہیں نہ کہیں ضرور ملیں گے۔ کیا میں واقعی یقین کروں کہ تم نے مجھے بھلا دیا ہے۔ ؟ خیر اپنی بات تم کرو میں اپنی بات کرتا ہوں۔ یقین کرو میں نے مدّت ہوئی تمہیں بھلا دیا ہے۔ لیکن تم نے اپنی یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ برسوں کی مریض معلوم ہوتی ہو۔ بخدا تمہیں دیکھ کر تو کسی کھنڈر کی ویرانی یاد آتی ہے۔" وہ اپنی رو میں نہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ میں ساری سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے جیسے گونگی اور بہری ہو کر رہ گئی تھی۔ سردی سے بچنے کے لیے میں نے اپنا چہرہ بھی اوورکوٹ کے کالر میں چھپا رکھا تھا۔ تاکہ اُس کی تیز نظریں میرے وجود کی بند کتاب کے اوراق نہ الٹنے لگ جائیں۔ وہ تو اچھا ہوا کہ وجیہہ لوٹ کر آ گئے اور مجھے اور اس صبر و ضبط کے امتحان سے نجات مل گئی۔ لیکن وجیہہ کی اُس سے ساری گفتگو نے میری ساری احتیاط، بناوٹ، تصنّع اور بھرم پر پانی پھیر دیا۔ مجھے محسوس ہوا کسی نے اچانک مجھے سرِ راہ عریاں کر دیا ہو۔ میں اپنے غصّے کو پی کر چپ چاپ وہاں سے باہر نکل گئی۔ کتنی دیر تک میں دل ہی دل میں وجیہہ کی اس حماقت اور اپنی بے جا رسوائی پر کُڑھتی رہی۔ میں نے کئی بار سوچا اگر وجیہہ کو مجھ سے اور میرے لاعلاج مرض سے اتنی ہی شکایت تھی تو وہ مجھے طلاق دے دیتے۔ مجھ سے قطع تعلق کر لیتے یا پھر کسی اور سے شادی کر لیتے، مجھے اُن سے کبھی شکایت نہ ہوتی۔ لیکن میری اس طرح شکایت سے اُنھیں نہ جانے کیا مل گیا تھا؟

وجیہہ چند ہی گھنٹوں میں جمی سے اتنے گھل مل چکے تھے کہ اُنھوں نے جمی کے ساتھ ہی واپس ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن میں ایک دن اور ٹھہر جانے کے لیے بضد ہو گئی۔ کیونکہ پھر جمی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ہم لوگ جس دن لاس اینجلز کے لیے پرواز کرنے والے تھے۔ اُس دن جمی کو بھی ائیرپورٹ پر دیکھ کر میں حیران ہو گئی۔ حقیقت میں یہ جمی بھی شیطان سے کچھ کم شر انگیز نہ تھا۔ جتنا دور بھاگو اتنا ہی دوڑ کر قریب آ جائے گا۔ اُس کا یہ تعاقب تو شاید ازل ہی سے جاری ہے۔

"ارے آپ گئے نہیں؟" وجیہہ کے لہجے میں حیرت کم، مسرّت زیادہ تھی۔

"جی! شاید آپ کی کشش ہی نے مجھے روک لیا۔ ورنہ کل کی پرواز موسم کی خرابی کے باعث کینسل نہ ہوتی۔" ویری گڈ! میری بھی یہ عین خواہش تھی لیکن رفیعہ نے میری بات نہیں مانی۔ خیر قدرت نے میری بات مان لی۔" وجیہہ اُسے اپنے ساتھ ہی بلکہ اپنے برابر کی سیٹ پر ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن وہ ہم دونوں کو تنہا چھوڑ کر مُنّو کو اپنی گود میں اُٹھائے بہت بے اعتنائی سے اگلی نشستوں میں اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔ وقت گزرتا گیا۔ اور میرا وجود بلین کی طرح فضاؤں میں جیسے معلّق ہو کر رہ گیا تھا۔ جی چاہتا تھا دوڑ کر جمی کے پاس پہنچ جاؤں۔ جیسے کوئی غیر مرئی غیبی طاقت اور مقناطیسی کشش میری ساری قوّتِ مدافعت پر بُری طرح حاوی ہو جانا چاہتی تھی۔ آخر کار مجھ سے نہ رہا گیا۔ جب میں نے مُنّو کی آہٹ سُنی تو دوڑ کر اُس کے پاس پہنچ گئی۔ میں نے دیکھا مُنّو کروٹ بدل کر پھر جمی کی گود میں سو گیا تھا اور خود جمی کا سارا وجود جیسے دھوئیں کے مرغولوں میں چھپ سا گیا تھا۔ جلتے ہوئے سگریٹ کی چنگاری نیم روشن اندھیرے میں سُرخ سگنل کی طرح چمک رہی تھی اور میرے قدم وہیں ٹھٹک کر رُک گئے اچانک سانپ کی پھنکار کی طرح اُس کی سرگوشی گونجی۔

"تم سوئی نہیں...؟؟"

"مُنّو... ؟... میں کھسیانی ہو کر بولی۔

"وہ تو کب کا سو چکا ہے... تم مُنّو کی کوئی فکر نہ کرو۔ جاؤ جا کر سو جاؤ..." اُس کا لہجہ اتنا کُھردرا اور اجنبی تھا کہ میں سوچنے لگی۔ یہ جمی گوشت پوست کا انسان تو ہرگز نہیں ہو سکتا چہرے پر کوئی تاثّر نہیں۔ اُس کا ہر جذبہ جیسے موت کی نیند سو گیا تھا۔ لیکن پھر یہ خود بھی کیوں نہیں سو جاتا۔ مجھے تو شاید موت ہی سُلا سکتی تھی کیونکہ جمی اور جمی کے قُرب نے مجھے آتش فشاں بنا دیا تھا۔ میں کب آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی، کب صبح ہوئی، کب ہم گھر پہنچے اور کب ہم سے جمی رخصت ہوا مجھے کچھ یاد نہیں۔ شاید کچھ ہی دیر بعد اُس رات مجھ پر بے ہوشی کا دورہ پڑ گیا تھا۔

وجیہہ کا جمی سے تعارف کیا ہو گیا تھا کہ وہ بھاگ بھاگ کر اُس کے پاس جایا کرتے اور پکڑ کر اُسے بھی اپنے گھر لایا کرتے۔ پھر شعر و ادب، موسیقی، شطرنج اور نہ جانے کیا کیا... بہر حال روز کہیں نہ کہیں محفلیں ضرور جما کرتیں، ایک دن پتہ چلا کہ جمی کسی فرضی نام سے کہانیاں بھی لکھا کرتا ہے جو ہند و پاک کے موقّر جرائد میں خاص مقام پاتی ہیں۔ تو پھر روز ہی شبِ افسانہ کا بھی اہتمام ہو جایا کرتا...

"محبت کا زہر...؟" جمی شاید انجان بن کر پوچھنے لگا۔

"ہاں...!! محبت کا زہر... یعنی کسی لڑکی کی طرف سے دھوکہ، محبت میں بے وفائی کا صدمہ... اور اپنی شکست کا ناقابلِ فراموش احساس..." وجیہہ اپنی بات کی وضاحت کرنے لگتے۔

شششت۔!! آپ بھی کیا بات کرتے ہیں۔ کہاں کی لڑکی، کدھر کی لڑکی بھلا سوچیے تو کون احمق لڑکی ہوگی جو میری زندگی کے اس ریگستان میں خاک چھاننے چلی آئے گی یا مجھ جیسے غیر سنجیدہ اور بے پرواہ انسان سے محبت بھی کرنے لگے گی پھر میرے پاس کسی کو دینے کے لیے ہے بھی کیا۔۔۔ میں ٹھہرا ایک آوارہ گرد، نہ میرا

- دنیا کی ساری نعمتیں کام میں لاؤ، لیکن بے اعتدالی سے بچو۔ مصیبت کا سرچشمہ دنیا نہیں، دنیا کا بے اعتدالانہ استعمال ہے۔ (قرآن پاک)
- تم میں سے مجھے وہ شخص بہت پیارا ہے جس کا اخلاق اچھا ہو۔ (پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم)
- تین چیزیں دوستی کو پختہ کرتی ہیں۔ سلام میں پہل، دوست کو اچھے نام سے پکارنا، دوست کو مجلس میں اچھی جگہ دینا۔ (حضرت عمرؓ)
- اچھا دوست اور رفیق ایک نعمت ہے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)
- جو شخص اپنی زبان کو قابو میں نہیں رکھتا وہ پشیمان ہوتا ہے۔ (حضرت امام جعفرؒ)

کبھی کوئی ماضی تھا نہ حال ہی ایسا ہے اور مستقبل کا تو بس خدا ہی حافظ ہے۔ میں کوئی ادیب ہوں نہ فن کار۔ کبھی کچھ کسی کی دیکھا دیکھی لکھ بھی لیتا ہوں یا پارٹیوں میں کبھی گا لیتا ہوں ساتھی۔ وہی یہ گٹار بجا لیتا ہوں تو یہ سب کچھ زندہ رہنے کے لیے ہے۔ کمانے کے لیے میں نے کبھی زندگی وقف نہیں کی۔ شاید یہی میری سب سے بڑی بھول ہے اور میری زندگی کا المیہ بھی۔ جب سے وطن چھوٹا ہے اپنی آوارہ گردی اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ویسے ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم یافتہ دانشور اور سنجیدہ لوگ بھی روزگار کی تلاش میں آوارہ گردی تو بنے رہتے ہیں۔ لیکن یہاں میں اپنی ساری آوارہ گردی کے باوجود اتنا کما لیتا ہوں کہ بہت سارے روپے عزیز رشتہ داروں کو بھیج دینے کے بعد بھی جب بہت کچھ بچ جاتا ہے تو اکثر سوچ سوچ کر حیران ہوتا ہوں کہ آخر یہ سب کچھ میرے بعد کس کے کام آئے گا؟"

"اسی لیے تو میں کہتا ہوں آپ شادی کر لیجیے" وجیہہ اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیتے۔ "شادی۔۔؟ نہیں بھائی نہیں۔۔۔! یہ میرے بس کا روگ نہیں۔ ایمان سے کہیے۔ آپ جیسا ذمہ دار، دور اندیش، فہیم و فریس اور سنجیدہ انسان کیا شادی کر کے آج خوش ہے۔۔۔؟ پھر میں تو ٹھہرا ایک آوارہ گرد، اور ذمہ داریوں سے دور بھاگنے والا انسان۔۔۔ آج یہاں ہوں پتہ نہیں کل کہاں ہوں گا۔ یہ زنجیریں تو انھیں زیب دیتی ہیں۔ جو زندگی میں کسی ایک کے ہو کر نہ رہیں نہ سہی لیکن اپنا سب کچھ تج کر اسی ایک کے ہو رہنے کا کم از کم ڈھونگ تو رچا سکتے ہیں۔ میں تو بس اپنی مرضی کا آپ مالک بنا رہنا چاہتا ہوں اور مجھے اپنی یہ آزادی بہر صورت عزیز ہے۔"

مجھے محسوس ہوا جمی کے یہ الفاظ جیسے الفاظ نہیں تھے، زہر میں بجھے تیر تھے جو ٹھیک نشانے پر بیٹھتے ہوئے میرے دل میں پیوست ہو چکے تھے۔ اچھا ہوا کہ جمی کا ماضی وجیہہ کے علم میں نہ آسکا ورنہ وہ جذبۂ ایثار میں مجھے طلاق دیکر جمی کے حوالے کرنے سے بھی گریز نہ کرتے۔

آنی! پچھلے دنوں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ میں تجھے ایک خط لکھتے لکھتے ادھورا چھوڑ کر ممو کی اچانک طبیعت بگڑ جانے کے باعث سراسیمگی کی حالت میں فوراً ڈاکٹر کے پاس چلی گئی تھی۔ واپس آکر جب فرصت ملنے پر اس خط کو مکمل کرنا چاہا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ وہ خط نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ جب بہت تلاش کے بعد بھی وہ خط نہ ملا تو میرے ہوش اڑ گئے۔ وہ تو کہو وجیہہ کسی کام سے ایک ہفتہ کے لیے نیویارک گئے ہوتے تھے۔ گھر کے دوسرے لوگ بھی گھر پر موجود نہ تھے۔۔۔ ورنہ اتنی بے پروائی مجھ سے کبھی نہ ہوتی۔ ملازمہ نے اتنا ضرور بتایا تھا کہ میری غیر موجودگی میں جمی کے علاوہ کوئی آیا بھی نہ تھا۔ اس اطلاع پر تو میں اور بھی گھبرا گئی۔ اس خط میں کچھ اتنی نجی باتیں بھی میں نے لکھ دی تھیں کہ کسی کے ہاتھ میں پڑ جاتا تو خودکشی میرے لیے مقدر بن جاتی۔ لیکن جمی پر مجھے اتنا بھروسہ تھا کہ وہ اس خط کو دیکھ بھی لے تو مجھے کبھی بلیک میل کرنے کی نہ سوچے گا۔ لیکن کسی بے پروائی اور اس کی کسی بے احتیاطی سے وہ خط کسی دوسرے کے ہاتھ میں پہنچ جائے تو پھر میرا کیا ہوگا۔۔۔؟ اسی سوچ میں کئی دن گزر گئے حالانکہ جمی کئی بار آیا اور گیا لیکن میری کبھی ہمت نہ ہو سکی کہ اس سے کچھ پوچھ سکوں اس کمبخت نے بھی مجھے کچھ نہ بتایا تھا۔ میری تشویش روز بروز بڑھتی ہی رہتی۔ پھر میں اٹھتے بیٹھتے ایک ایسے حادثے کا انتظار کرنے لگی کہ وہ خط کسی بھی وقت وجیہہ کے ہاتھ لگ جائے گا اور میری ساری گرہستی، میرا وجود بارود کے ایک ڈھیر کی طرح بھک سے اڑ جائے گا۔ اسی انتظار میں ایک دن ممو کو پڑھاتے پڑھاتے اچانک وہی خط اس کی ایک کتاب سے نکل آیا تو میری جان میں جان آئی۔ میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے میری لاج رکھ لی۔ ممو نے اس خط کو اٹھا کر کھیلتے کھیلتے اپنی کتاب میں نہ رکھ لیا ہوتا تو شاید کوئی

دت ضرور ہو کر رہتا۔ لیکن جیسے ہی اس خط کی نست پر جمی کی تحریر پر میری نظر پڑی تو دھک سے رہ گیا۔ مجھے جیسے سکتہ سا ہو گیا۔ ظالم نے کس بےباکی اور بے دردی سے لکھا تھا۔

"سوچتا ہوں۔ تمہیں جب میری یہ تحریر ملے گی تو تمہارا کیا ردِ عمل ہو گا۔ شاید وہی جو تمہارا خط پڑھ کر مجھ پر ہوا ہے۔ اچانک ہی اگر کچھ ہو جائے، چاہے وہ بے انتہا خوشی اور بے پناہ مسرت ہی کیوں نہ ہو پتہ نہیں کیوں انسانی ذہن اُسے فوراً قبول کیوں نہیں کرتا۔ ؟ ناگہاں ایک جانکاہ صدمے سے کیوں دوچار ہو جاتا ہے۔ ؟ ویسے تمہارا المیہ تو یہ ہے کہ مٹو کی پیدائش کے آپریشن نے جہاں تمہیں اور بچوں کی ماں بننے سے سدا کے لیے محروم کر دیا ہے۔ وہیں تمہیں دن رات یہ غم کھائے جاتا ہے کہ مٹو جیسے تمہارے سوا سب ہی وجیہہ ہی کی اولاد سمجھتے ہیں وہ دراصل میرا بیٹا ہے۔ تمہارا یہ غیر متوقع انکشاف میرے لیے شادیٔ مرگ ہے۔ لیکن تمہاری بے بسی پر رہ رہ کر مسرت بھی ہوتی ہے کہ قدرت نے بھی خوب انصاف کیا۔ تم اب کبھی وجیہہ کے بچوں کی ماں بن سکتی ہو اور نہ مٹو کے جیتے جی مجھے کبھی بھلا سکتی ہو۔ مٹو کا وجود درمیان میں نہ ہوتا یا وہ میرا بیٹا ہونے کی بجائے وجیہہ کا بیٹا ہوتا تو تم نے وجیہہ کی جنّت میں پہنچ کر میری یاد کو دل سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا ہوتا۔ اب بھی کچھ نہیں گیا۔ کیوں کہ یہ راز ہنوز راز ہی ہے... جہاں وجیہہ کی جنّت اور اپنے عیش و آرام کے لیے تم نے میری قربانی دی تھی اُسی وجیہہ کی جنّت اور اپنے سکون اور چین کے لیے کیا مٹو کی قربانی نہیں دے سکتیں۔؟ ورنہ سوچو کسی دن یہ راز فاش ہو جائے تو تمہارے ساتھ ساتھ مٹو کا کیا ہو گا۔ ؟ تم چاہو تو میں تمہاری خوشی کے لیے مٹو کو تمہارے راستے سے ہٹانے کے لیے بھی تیار ہوں۔ اتنا ہی ہو گا کہ مجھے جیل کی چار دیواری کے باہر کی بجائے جیل کی چار دیواری کے اندر عمر قید بھگتنا پڑے گا۔ اس طرح میری آوارہ گردی تو ختم ہو جائے گی...!!

کہو کیا کہتی ہو ـــــ؟

تمہارے حکم کا منتظر۔ جمی"

اُس دن نئے سال کا جشن تھا، کئی ڈسکو تھیکس، ہوٹلوں، کلبوں اور ٹی۔ وی پر جمی کے بہت سارے پروگرام تھے وہ اُس دن اتنا خوش اور بے خود بنا ہوا تھا جیسے میں نے اُسے مٹو بخش دیا ہو۔ لیکن میری حالت بہت دگرگوں تھی جمی کی تحریر کے کبھی نہ مندمل نہ ہونے والے زخم نے جیسے میرے ذہن و دل میں بارود سی بچھا دی تھی۔ جمی کی بے نیازی، بے خودی اور مجھ سے بے تعلقی قابلِ دید تھی۔ وہ بدمست

- جو اپنی پناہ میں آجانے والے کی حفاظت نہیں کرتا اُس کی حکومت میں وقت پر بویا ہوا بیج بھی نہ اُگے گا۔
(مہا بھارت)
- یقین زندگی ہے اور بے یقینی موت۔
(رام کرشن پرم ہنس)
- دوست وہی جس پر یقین کیا جا سکے۔
(بھرتری ہری)
- جس ملک میں رعیت حکمراں سے تنگ ہو، اُس روئے زمین پر آسودگی نہیں ہوتی (کسریٰ)
- سچائی اور ایمانداری سگی بہنیں ہیں۔
(ایمرسن)
- دولت انسان کو شریف نہیں بنا سکتی۔
(ڈارون)

بے خود، جھومتا گاتا گٹار کے تاروں کو ایسے جھنجھوڑ رہا تھا جیسے وہ گٹار کے تاروں کی بجائے مجھے جھنجھوڑ کر بے قابو کر دینا چاہتا ہو۔ جب اُس کے پیر تھرکتے اور اُس کا سارا وجود بل کھانے لگا تو میرا اضطراب اُسی رفتار سے بڑھتا رہا۔ نئے سال کی خوشی، سازوں کی گھن گرج، موسیقی ریز ماحول سے متاثر بے پناہ مسرت اور خوشی سے سرشار نشے میں ڈوبے لوگ گھڑی کی آواز کے

شــشت ۔!! آپ بھی کیا بات کرتے ہیں۔ کہاں کی لڑکی، کدھر کی لڑکی بھلا سوچیے تو کون احمق لڑکی ہوگی جو میری زندگی کے اس ریگستان میں خاک چھاننے چلی آئے گی یا مجھ جیسے غیر سنجیدہ اور بے پرواہ انسان سے محبت بھی کرنے لگے گی پھر میرے پاس کسی کو دینے کے لیے ہے بھی کیا۔ ۔ ۔ میں ٹھہرا ایک آوارہ گرد، نہ میرا

- دُنیا کی ساری نعمتیں کام میں لاؤ لیکن بے اعتدالی سے بچو۔ مصیبت کا سرچشمہ دنیا نہیں، دنیا کا بے اعتدالانہ استعمال ہے۔ (قرآن پاک)
- تم میں سے مجھے وہ شخص بہت پیارا ہے جس کا اخلاق اچھا ہو۔
(پیغمبر اسلام حضرت محمّد صلی اللہ علیہ وسلّم)
- تین چیزیں دوستی کو پختہ کرتی ہیں۔ سلام میں پہل، دوست کو اچھے نام سے پُکارنا، دوست کو مجلس میں اچھی جگہ دینا۔ (حضرت عمرؓ)
- اچھا دوست اور رفیق ایک نعمت ہے۔
(حضرت علی کرم اللہ وجہہ)
- جو شخص اپنی زبان کو قابو میں نہیں رکھتا وہ پشیمان ہوتا ہے۔ (حضرت امام جعفرؓ)

کبھی کوئی ماضی تھا نہ حال ہی ایسا ہے اور مستقبل کا تو بس خدا ہی حافظ ہے۔ میں کوئی ادیب ہوں نہ فن کار۔ ۔ کبھی کچھ کسی کی دیکھا دیکھی لکھ بھی لیتا ہوں یا پارٹیوں میں کبھی گا لیتا ہوں ٹی۔ وی پر گٹار بجا لیتا ہوں تو یہ سب کچھ زندہ رہنے کے لیے ہے۔ کمانے کے لیے میں نے کبھی زندگی وقف نہیں کی۔ شاید یہی میری سب سے بڑی بھول ہے اور میری زندگی کا المیہ بھی۔ جب سے وطن چھوٹا ہے اپنی آوارہ گردی اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ویسے ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم یافتہ دانشور اور سنجیدہ لوگ بھی روزگار کی تلاش میں آوارہ گرد ہی تو بنے رہتے ہیں۔ لیکن یہاں میں اپنی ساری آوارہ گردی کے باوجود اتنا کما لیتا ہوں کہ بہت سارے روپے عزیز رشتہ داروں کو بھیج دینے کے بعد بھی جب بہت کچھ بچ جاتا ہے تو اکثر سوچ سوچ کر حیران ہوتا ہوں کہ آخر یہ سب کچھ میرے بعد کس کے کام آئے گا؟"

"اِسی لیے تو میں کہتا ہوں آپ شادی کر لیجیے" وجیہہ اُس کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیتے۔ شادی ۔۔؟ نہیں بھائی نہیں۔ ۔ ۔! یہ میرے بس کا روگ نہیں۔ ایمان سے کہیے۔ آپ جیسا ذمّہ دار، دُور اندیش، فہیم و فریس اور سنجیدہ انسان کیا شادی کر کے آج خوش ہے۔ ۔ ۔؟ پھر میں تو ٹھہرا ایک آوارہ گرد، اور ذمّہ داریوں سے دُور بھاگنے والا انسان۔ ۔ ۔ آج یہاں ہوں پتہ نہیں کل کہاں ہوں گا۔ یہ زنجیریں تو اُنھیں زیب دیتی ہیں۔ جو زندگی میں کسی ایک کے ہو کر نہ رہیں نہ سہی لیکن اپنا سب کچھ تج کر اُسی ایک کے ہو رہنے کا کم از کم ڈھونگ تو رچا سکتے ہیں۔ میں تو بس اپنی مرضی کا آپ مالک بنا رہنا چاہتا ہوں اور مجھے اپنی یہ آزادی بہرصورت عزیز ہے۔

مجھے محسوس ہوا جمّی کے یہ الفاظ جیسے الفاظ نہیں تھے، زہر میں بجھے تیر تھے جو ٹھیک نشانے پر بیٹھتے ہوئے میرے دل میں پیوست ہو چکے تھے۔ اچھّا ہوا کہ جمّی کا ماضی وجیہہ کے علم میں نہ آسکا ورنہ وہ جذبۂ ایثار میں مجھے طلاق دیکر جمّی کے حوالے کرنے سے بھی گریز نہ کرتے۔

اَنّی! پچھلے دنوں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ میں تجھے ایک خط لکھتے لکھتے ادھورا چھوڑ کر منّو کی اچانک طبیعت بگڑ جانے کے باعث سراسیمگی کی حالت میں فوراً ڈاکٹر کے پاس چلی گئی تھی۔ واپس آکر جب فرصت ملنے پہ اِس خط کو مکمل کرنا چاہا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ وہ خط نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ جب بہت تلاش کے بعد بھی وہ خط نہ ملا تو میرے ہوش اُڑ گئے۔ وہ تو کہو وجیہہ کسی کام سے ایک ہفتہ کے لیے نیویارک گئے ہوتے تھے۔ گھر کے دوسرے لوگ بھی گھر پر موجود نہ تھے۔ ۔ ۔ ورنہ اتنی بے پروائی مجھ سے کبھی نہ ہوتی۔ ملازمہ نے اتنا ضرور بتایا تھا کہ میری غیر موجودگی میں جمّی کے علاوہ کوئی آیا بھی نہ تھا۔ اِس اطلاع پر تو میں اور بھی گھبرا گئی۔ اس خط میں کچھ اتنی نجی باتیں بھی میں نے لکھ دی تھیں کہ کسی کے ہاتھ میں پڑ جاتا تو خودکشی میرے لیے مقدّر بن جاتی۔ لیکن جمّی پر مجھے اتنا بھروسہ تھا کہ وہ اُس خط کو دیکھ بھی لے تو مجھے کبھی بلیک میل کرنے کی نہ سوچے گا۔ لیکن کسی بے پروائی اور اُس کی کسی بے احتیاطی سے وہ خط کسی دوسرے کے ہاتھ میں پہنچ جائے تو پھر میرا کیا ہوگا۔ ۔ ۔؟ اسی سوچ میں کئی دن گزر گئے حالانکہ جمّی کئی بار آیا اور گیا لیکن میری کبھی ہمّت نہ ہو سکی کہ اُس سے کچھ پوچھ سکوں اُس کمبخت نے بھی مجھے کچھ نہ بتایا تھا۔ میری تشویش روز بروز بڑھتی ہی رہتی۔ پھر میں اُٹھتے بیٹھتے ایک ایسے حادثے کا انتظار کرنے لگی کہ وہ خط کسی بھی وقت وجیہہ کے ہاتھ لگ جائے گا اور میری ساری گرہستی، میرا وجود بارود کے ایک ڈھیر کی طرح بھک سے اُڑ جائے گا۔ اِسی انتظار میں ایک دن منّو کو پڑھاتے پڑھاتے اچانک وہی خط اُس کی ایک کتاب سے نکل آیا تو میری جان میں جان آئی۔ میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اُس نے میری لاج رکھ لی۔ منّو نے اُس خط کو اُٹھا کر کھیلتے کھیلتے اپنی کتاب میں نہ رکھ لیا ہوتا تو شاید کوئی

ضرور ہو کر رہتا۔ لیکن جیسے ہی اس خط کی ...پر جمی کی تحریر پر میری نظر پڑی تو دھک ...ہ گیا۔ مجھے جیسے سکتہ سا ہو گیا۔ ظالم نے کس ...ی اور بے دردی سے لکھا تھا۔

"سوچتا ہوں۔ تمہیں جب میری یہ تحریر ملے گی تو تمہارا کیا ردِ عمل ہو گا شاید وہی جو تمہارا خط پڑھ کر مجھ پر ہوا ہے۔ اچانک ہی اگر کچھ ہو جائے، چاہے وہ بے انتہا خوشی اور بے پناہ مسرت ہی کیوں نہ ہو پتہ نہیں کیوں انسانی ذہن اُسے فوراً قبول کیوں نہیں کرتا۔؟ ناگہاں ایک جانکاہ صدمے سے کیوں دو چار ہو جاتا ہے۔؟ ویسے تمہارا المیہ تو یہ ہے کہ ممّو کی پیدائش کے آپریشن نے جہاں تمہیں اور بچوّں کی ماں بننے سے سدا کے لیے محروم کر دیا ہے۔ وہیں تمہیں دن رات یہ غم کھائے جاتا ہے کہ ممّو جیسے تمہارے سوا سب ہی وجیہہ ہی کی اولاد سمجھتے ہیں وہ دراصل میرا بیٹا ہے۔ تمہارا یہ غیر متوقع انکشاف میرے لیے شادیٔ مرگ ہے۔ لیکن تمہاری بے بسی پر رہ رہ کر مسرت بھی ہوتی ہے کہ قدرت نے بھی خوب انصاف کیا نہ تم اب کبھی وجیہہ کے بچوّں کی ماں بن سکتی ہو اور نہ ممّو کے جیتے جی مجھے کبھی بھلا سکتی ہو۔ ممّو کا وجود درمیان میں نہ ہوتا یا وہ میرا بیٹا ہونے کی بجائے وجیہہ کا بیٹا ہوتا تو تم نے وجیہہ کی جنّت میں پہنچ کر میری یاد کو دل سے حرفِ غلط کی طرح مِٹا دیا ہوتا۔ اب بھی کچھ نہیں گیا، کیوں کہ یہ راز ہنوز راز ہی ہے... جہاں وجیہہ کی جنّت اور اپنے عیش و آرام کے لیے تم نے میری قربانی دی تھی اُسی وجیہہ کی جنّت اور اپنے سکون اور چین کے لیے کیا ممّو کی قربانی نہیں دے سکتیں۔؟ ورنہ سوچو کسی دن یہ راز فاش ہو جائے تو تمہارے ساتھ ساتھ ممّو کا کیا ہو گا۔؟ تم چاہو تو میں تمہاری خوشی کے لیے ممّو کو تمہارے راستے سے ہٹانے کے لیے بھی تیار ہوں۔ اتنا ہی ہو گا کہ مجھے جیل کی چار دیواری کے باہر کی بجائے جیل کی چار دیواری کے اندر عمر قید بھگتنا پڑے گا۔ اس طرح میری آوارہ گردی تو ختم ہو جائے گی...!!

کہو کیا کہتی ہو ــــ؟

تمہارے حکم کا منتظر۔ جمّی"

اُس دن نئے سال کا جشن تھا، کئی ڈسکو تھیکس، ہوٹلوں، کلبوں اور ٹی۔ وی پر جمّی کے بہت سارے پروگرام تھے وہ اُس دن اتنا خوش اور بے خود بنا ہوا تھا جیسے میں نے اُسے ممّو بخش دیا ہو۔ لیکن میری حالت بہت دگرگوں تھی جمّی کی تحریر کے کبھی نہ مندمل نہ ہونے والے زخم نے جیسے میرے ذہن و دل میں بارود سی بچھا دی تھی۔ جمّی کی بے نیازی، بے خودی اور مجھ سے بے تعلّق قابلِ دید تھی۔ وہ بدمست۔

- جو اپنی پناہ میں آجانے والے کی حفاظت نہیں کرتا اُس کی حکومت میں وقت پر بویا ہوا بیج بھی نہ اُگے گا۔

  (مہا بھارت)

- یقین زندگی ہے اور بے یقینی موت۔

  (رام کرشن پرم ہنس)

- دوست وہی جس پر یقین کیا جا سکے۔

  (بھر تری ہری)

- جس ملک میں رعیت حکمراں سے تنگ ہو، اُس روئے زمین پر آسودگی نہیں ہوتی

  (کسریٰ)

- سچائی اور ایمانداری سگی بہنیں ہیں۔

  (ایمرسن)

- دولت انسان کو شریف نہیں بنا سکتی۔

  (ڈارون)

بے خود، جھومتا گاتا گٹار کے تاروں کو ایسے جھنجھوڑ رہا تھا جیسے وہ گٹار کے تاروں کی بجائے مجھے جھنجھوڑ کر بے قابو کر دینا چاہتا ہو۔ جب اُس کے پیر تھرکتے اور اُس کا سارا وجود بل کھانے لگا تو میرا اضطراب اُسی رفتار سے بڑھتا رہا۔ نئے سال کی خوشی، سازوں کی گھن گرج، موسیقی ریز ماحول سے متاثر بے پناہ مسرت اور خوشی سے سرشار نشے میں ڈوبے لوگ گھڑی کی آواز کے

ساتھ ہی جب پاگل ہوکر چیخنے لگے تو میں نے اپنے دونوں کانوں میں اپنی انگلیاں ٹھونس لیں۔۔۔ کیوں کہ اُن کی چیخیں، سیٹیاں، بے ہنگم قہقہے ناچتے قدموں، تھرکتے جسموں اور سروں کی دیوانہ وار جنبش کے منظر نے مجھے بے چین کر دیا... میں تیزی سے اُٹھ کر باہر نکلنا ہی چاہتی تھی کہ اچانک ایک اور بے ہنگم شور بلند ہوا میں نے دیکھا جمّی نے میری نظروں کے سامنے گٹار بجاتے بجاتے، اور اور مغربی سازوں کی دُھن پر دیوانہ وار ناچتے ناچتے شاید عالمِ بے خودی یا شدّتِ اضطراب میں یکایک اُس نے گٹار کے سارے تار توڑ ڈالے۔ پھر وہ دیکھتے ہی دیکھتے دھم سے فرش پر گر پڑا اور اُس کے بعد دیکھنے والوں نے دیکھا اور جو دیکھ نہ سکتے تھے انھوں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اس لیے پُرانے سال کے ساتھ ہی چشم زدن میں جمّی کی روح بھی چُپ چاپ پرواز کر گئی اور بظاہر اُس کا مُردہ جسم ٹوٹے ہوئے گٹار کے تاروں میں اُلجھ کر فرش پر بکھرا پڑا رہ گیا تھا پھر سب کچھ اچانک ایسے تھم گیا۔ جیسے بجلی فیل ہو ہوگئی ہو۔ ساز ٹوٹ گئے ہوں، تار بکھر گئے ہوں اور سانس منجمد ہوکر رہ گئی ہو۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ کیسے ہوا۔۔۔؟ اور اُس کے بعد کیا ہوا۔۔؟ مجھے کچھ بھی یاد نہیں اور نہ اُس بارے میں میں نے کبھی کسی سے پوچھنے کی ہمّت کی۔ اس اچانک، غیر متوقع، اور غیر یقینی حادثے کے فوری بعد مجھ پر حسبِ معمول بے ہوشی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ جب ہوش آیا تو پتہ چلا کہ میں ہسپتال میں ہوں۔ یہ خط تجھے ہسپتال ہی سے لکھ رہی ہوں۔ تاکہ کسی طرح تو دل کی بھڑاس نکلے۔ شاید برسوں کی یہی گھٹن اور دل کا یہ بوجھ رفتہ رفتہ بڑھتے بڑھتے آج مرضِ موت میں تبدیل ہوچکا ہے۔ جو ڈاکٹروں کے لیے ایک چیلنج بن کر رہ گیا ہے۔ اُنھیں اپنی کامیابی کا پورا پورا یقین ہے جبکہ میری چھٹی حس کہتی ہے اب میرا بچنا محال ہے پھر بھی وجیہہ کی ضد کے آگے میں نے آپریشن سے انکار کی ضد چھوڑ دی ہے۔ ابھی جانکنی کے عالم میں ایک اور حادثہ پیش آگیا۔ آج صبح جمّی کا سالیسٹر مجھ سے یہ کہنے آیا تھا کہ جمّی نے اپنی ساری جائداد میرے نام کر دی ہے، تو اچانک مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میری چیخ کے ساتھ ہی میری سانس بھی اُکھڑ گئی ہے۔ لیکن موت بھی جمّی کی طرح بیدرد، بے رحم اور اذیت پسند معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ جمّی نے مرتے جاتے جاتے اپنا سارا درد و کرب، اضطراب اور محرومیاں مجھے ہی سونپ دی تھیں۔ ڈیر انّی اب تو ہی بتا کیا اب بھی جی سکتی ہوں۔ ؟؟؟ انّی! میری انّی ڈیر! کبھی نہیں!! کبھی نہیں...!!

فقط قریبِ مرگ۔۔۔

رفیعہ

غزلیں

خیالؔ سہارنپوری

شیرازان سٹریٹ مکان نمبر ۶۰۷/۱۴ سہارنپور (یو۔پی)

ایک ٹھوکر میں بدل جاتے ہیں کتنے چہرے
آئینہ دیکھ کے حیران ہے ٹوٹے چہرے

دائرے شکل کی صورت میں بدل جاتے ہیں
کون کہتا ہے کہ بنتے نہیں بگڑے چہرے

برف کی طرح ہر احساس پگھل جائے گا
وقت کی دھند میں کھو جائیں گے سارے چہرے

پل کی دہلیز پہ رکھا ہی تھا یادوں نے قدم
رنگ بھرنے لگے تصویر میں مٹتے چہرے

درد کا شہر بسائے ہوئے آنکھوں میں خیالؔ
ڈھونڈتے پھرتے ہیں تنہائی میں بکھرے چہرے

محمد الطاف الرحمٰن نادرؔ

بھدراک ضلع بالاسور (اڑیسہ)

جب کبھی میں اُس سے ملا نا مہرباں اکثر لگا
کیا پتہ اوروں کو وہ غم آشنا کیوں کر لگا

سطح سے ہوتا ہے گہرائی کا اندازہ کہیں
دل کی حالت کا پتہ مت نبض کو چھو کر لگا

راہ کا پتھر ہوں سنگِ آستاں مجھ کو نہ جان
یا اُٹھا کر پھینک دے یا پاؤں سے ٹھوکر لگا

کل تلک محلوں میں تھا جو فرشِ گل پر محوِ خواب
آج اسی انساں کا ہے فٹ پاتھ پر بستر لگا

تھا مثالِ آئینہ نادرؔ! یہاں میرا وجود
دیکھنے میں اہلِ دُنیا کو مگر پتھر لگا

شائقؔ مظفرپوری

نیشنل پین سینٹر ۶۶۔ گول موری مارکیٹ، جمشید پور

اک ایسا چور مجھ میں چھپ گیا ہے
مجھے، مجھ سے چرانا چاہتا ہے

مرے احساس کا ساگر ہے گہرا
یہ دل پتھر ہے جو ڈوبا ہوا ہے

نہ پتھر پھینک کر کیچڑ اُچھالو
ہوا کا رُخ ابھی بدلا ہوا ہے

مری تصویر میں تم رنگ بھر دو
بڑی مدّت سے یہ صحرا نما ہے

جو نبضِ وقت کی رفتار سمجھے
وہی شائقؔ مسیحِ ارتقا ہے

پہلا خط

ڈاکٹر آمنہ شوکت

۱۱۶۲ کٹرہ۔ الٰہ آباد نمبر ۲ (یوپی)

●

محترمی جناب نیر صاحب
آداب۔ ایک افسانہ "پہلا خط" ارسالِ خدمت ہے افسانے کا مرکزی کردار نسیم ایک نفسیاتی مرض میں مبتلا ہے۔ اس مرض کی تشخیص کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوئی ہوں۔ اس کا فیصلہ آپ اور "بیسویں صدی" کے قارئین کریں گے۔ امید ہے کہ آپ بفضل تعالیٰ بخیریت ہوں گے۔
مخلص
آمنہ شوکت

نسیم اپنے کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اُسے ایک ہفتہ سے اپنے خط کا انتظار تھا جو اُس کے نام ہر سوموار کو ضرور آتا تھا جسے پا کر اُسے بے حد خوشی ہوتی۔ وہ اُس خط کو بار بار پڑھتا اور پھر جواب لکھ بھیجتا۔ یہ سلسلہ مسلسل تین ماہ سے جاری تھا۔

نسیم یہاں سپلائی آفس میں ایک کلرک تھا اور تقریباً چھ ماہ سے اختر حسین صاحب کے کمرے میں بطور کرایہ دار رہا کرتا تھا۔ وہ ایک خوبصورت اور ہونہار نوجوان تھا۔ جو ہمیشہ دفتر کے اور بابوؤں سے الگ تھلگ رہا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کا کوئی دوست تھا نہ ہمراز۔ وہ احساس کمتری کا بُری طرح شکار تھا۔

آج وہ ڈاکیہ کے انتظار میں بہت بے چین تھا اور بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آج دفتر کی چھٹی تھی اس لیے وہ اپنے کمرے میں اور بھی بور ہو رہا تھا کہ اتنے میں اختر حسین صاحب مالک مکان کے مُلازم نے کمرے میں داخل ہو کر نسیم سے کہا۔

"آپ کو مالک نے یاد کیا ہے۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"کیا بات ہے شیرو؟" نسیم نے جلدی سے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم بابو جی!" یہ کہہ کر شیرو باہر چلا گیا۔

نسیم سوچ رہا تھا آج اُسے اختر حسین صاحب نے کیوں بلایا ہے۔ کرایہ تو ہر ماہ میں خود ہی دے آتا ہوں پھر آج کیا خاص بات ہو گئی؟ یہی سوچتا ہوا وہ کمرہ بند کر کے اختر حسین صاحب کے کمرے کی طرف چل پڑا۔

اختر صاحب اُسے باہر کھڑا دیکھ کر اپنی بھاری آواز میں بولے۔

"اندر چلے آیئے" اور نسیم چق اٹھا کر سہما سہما کمرے میں داخل ہو گیا۔

اختر صاحب نے خالی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "بیٹھ جایئے۔" نسیم ڈرتے ڈرتے خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔

اختر صاحب نے اُس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کو میرے مکان میں رہتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا؟"

"جی! جی۔ چھ ماہ ہوئے" نسیم نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

میں نے آپ کو ایک شریف اور سیدھا سادہ آدمی سمجھ کر اپنا کمرہ دیا تھا اور اتنے عرصے آپ کی کوئی

شکایت ملی نہ دیکھی گئی۔ بلکہ اِدھر آپ سے جو حرکتیں سرزد ہو رہی ہیں وہ ایسی نہیں کہ آپ کو ایک شریف محلّے میں رہنے دیا جائے۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں کہ آپ میری کن حرکتوں کا تذکرہ کر رہے ہیں؟" نسیم نے آہستہ سے کہا۔

"میں بچّہ نہیں ہوں نسیم صاحب اور نہ مجھے کسی پر کیچڑ اُچھالنے کا شوق ہے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ جلد از جلد میرا کمرہ خالی کر دیں اور اس محلّے سے کہیں دُور چلے جائیں۔"

نسیم کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کونسی ایسی غلط حرکت ہو گئی ہے جس کی بنا پر اس سے مکان خالی کرایا جا رہا ہے۔ اتنے میں پھر اُس کے کانوں میں اختر حسین کی آواز گونجی۔ وہ کہہ رہے تھے

"آپ کو کچھ کہنا ہے؟"

"جی ہاں۔ مجھے یہ تو بتایئے کہ میرا جُرم کیا ہے۔ مجھے یہ بھی تو معلوم ہو کہ میری غلطی کیا ہے؟"

"تم جھوٹ بولتے ہو!" اختر حسین غصّے سے چیخ پڑے۔ "تم جانتے ہوئے بھی انجان بن رہے ہو!" اور پھر جیب سے ایک خط نکالتے ہوئے بولے۔

"کیا یہ تمہاری آوارگی اور بد چلنی کا ثبوت نہیں ہے؟ کیا اس لڑکی کو تم محبت بھرے خطوط نہیں لکھتے؟ اسے پڑھنے کے بعد کیا لوگ تمہارے تعلقات کی حد کو نہیں سمجھ سکتے؟ اب تو تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو گا؟"

نسیم حیرت اور شرمندگی کے ملے جُلے احساس کے ساتھ لفافے کو دیکھتا رہا۔ اُسے اپنی بے بسی اور بے چارگی پر رونا آ رہا تھا۔ اُس کے پاس الفاظ نہ تھے جن کی مدد سے اپنی بے گناہی ثابت کر سکتا۔ یہ سچ تھا کہ وہ لفافہ اُسی کے نام اُس کے پتے پر بھیجا گیا تھا۔ جو اُس وقت اختر حسین صاحب کے ہاتھ میں تھا۔ کچھ دیر کے لیے تو اُس پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ اور پھر یکایک دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر سسکیاں لینے لگا۔

اختر صاحب پہلے تو اُس کی طرف بغور دیکھتے رہے۔ پھر پہلو بدلتے ہوئے نرم آواز میں بولے۔

"نسیم میاں! میں یہ نہیں کہتا کہ محبت کرنا جُرم ہے۔ لیکن میں یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ محبت وقتی جذبے کے تحت کی جائے۔ جس کا نتیجہ بدنامی اور ذلّت کے سوا کچھ نہ ہو۔ خط پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم دونوں ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرتے ہو۔ بہتر ہے کہ تم ثریّا سے شادی کر لو!"

"ثریّا اور شادی؟" نسیم نے چونک کر کہا۔

"ہاں! ہاں۔ شادی! کیا حرج ہے۔" اختر صاحب نے کہا۔

"مگر کوئی ثریّا ہو بھی تو!" نسیم نے آہستہ سے جواب دیا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟ یہ خط ثریّا کا لکھا ہوا نہیں ہے؟" اختر صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

"جی نہیں یہ خط خود میرا ہی لکھا ہوا ہے!"

"یہ کیا بکتے ہو۔ آخر بات کیا ہے؟" اختر صاحب غصّے میں اُبل پڑے۔

"اب میں آپ سے کیا بتاؤں۔ آپ یقین نہ کریں گے۔ ثریّا میری اپنی ذہنی تخلیق ہے جس کے نام سے میں خود اپنے آپ کو اپنے ہی پتے پر خط لکھا کرتا ہوں۔"

"آخر تم ایسا کیوں کرتے ہو؟" اختر صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے بچپن سے آج تک کسی کا پیار نہ مل سکا۔ نہ ماں باپ کا۔ نہ بھائی بہن کا۔ میری پرورش میرے ایک دُور کے رشتہ دار کے یہاں ہوئی تھی جب میں نے ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو اس بھری دنیا میں تنہا پایا۔ کن کن پریشانیوں اور مصیبتوں کے بعد ہائی اسکول پاس کر سکا۔ پھر تلاش معاش کے در بدر کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ میں نے ہمّت نہیں ہاری اور اللہ کی مہربانی سے یہاں آ کر سپلائی آفس میں جگہ مل گئی۔ حالات اور واقعات نے مجھے فرصت ہی نہ دی کہ میں اور کسی بات کو سوچ سکوں۔ میں احساسِ کمتری کا بُری طرح شکار تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں الگ تھلگ اپنی زندگی گزار رہا تھا۔ مجھ میں ہمّت نہ تھی کہ کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکوں۔ لیکن دل میں ایک دبی دبی سی خواہش ضرور اُبھرتی تھی کہ مجھے بھی کوئی پیار بھری نظروں سے دیکھے اوروں کی طرح مجھے بھی کوئی خط لکھے۔ اور میں بھی محبت بھرے انداز میں جواب دوں۔ لیکن میری خواہش کبھی پوری نہ ہوئی۔ مجھے کسی نے محبت بھری نظروں سے نہ دیکھا۔ نہ میرے نام کسی کا کوئی خط ہی آیا۔ میری راتیں خیالی تصویریں بناتی رہیں اور ذہن میں طرح طرح کے محبت بھرے سین نظر آتے رہے۔ پھر اپنے جذبات کی تسکین کے لیے میں نے ایک خیالی ثریّا تخلیق کر لی اور اُس کی طرف سے اپنے نام محبت بھرے خطوط لکھتا رہا۔ جب دوسرے دن میرا ہی لکھا ہوا خط میرے نام اور پتے پر مجھے ملتا ہے تو میری خوشی کی انتہا نہ رہتی۔ دل کی تسلّی ہو جاتی کہ مجھ سے بھی کوئی محبت کرتا ہے۔ اس طرح اپنے دل کی تسکین کے لیے اپنے آپ کو ایک حسین دھوکہ دیتا رہا اور آج ڈاکیہ کی غلطی سے ایک مجرم کی طرح آپ کے سامنے بیٹھا ہوں لیکن جو حقیقت تھی وہ میں نے بیان کر دی۔" یہ کہہ کر نسیم خاموش ہو گیا۔

ایک دن گرمی انتہا پر تھی۔ لائبریری سے نکل کر دہکتی دھوپ اور تیز لُو میں گھر واپس آرہا تھا۔ سڑک پار کی تو حاشیہ پر لگے ہوئے ایک جیتد درخت کی جڑ پر بیٹھا ہوا ایک شخص نظر آیا۔ جسم پر صرف ایک میلی پھٹی لنگی تھی۔ چھتری سنبھالتا، جھکڑ سے بچتا، جلد جلد وہاں سے گزرا۔ غور سے یہ دیکھنے کی نہ ضرورت سمجھی نہ ہمت پڑی کہ کون شخص تھا اور وہاں بیٹھا کیا کر رہا تھا۔ کچھ ہی دور نکلا تھا خیال آیا کہ درخت کے پاس سے گزرتے ہوئے کچھ آواز سنی تھی جس کا میں نے کچھ خیال نہیں کیا اور یہ سوچتا ہوا آگے بڑھ گیا کہ کوئی فقیر ہوگا۔ جس نے پیسے مانگے ہوں گے۔ کچھ دور جانے کے بعد بھوک اور موسم دونوں کی سختی اور زیادہ محسوس ہوئی تو فقیر کا خیال آیا کہ اس پر معلوم نہیں گزر رہی ہوگی۔ بادلِ نخواستہ پلٹا۔ جیب سے کچھ پیسے نکالے اور اس شخص کے پاس آکر کہا۔ "یہ لو تمہاری آواز اچھی طرح نہیں سن سکا تھا"۔

قریب سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ روٹی کے چند ٹکڑوں پر اُبلی ہوئی ترکاری اور ساگ کھا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر کھڑا ہوگیا اور بڑے اعتماد لیکن انکسار سے کہا۔ میاں اللہ آپ کو اچھا رکھے۔ آپ کو دھوکا ہوا میں نے کچھ مانگا نہیں تھا۔ کھانے کا وقت تھا میں کھا رہا تھا۔ آپ بھی شاید بھوکے گزر رہے تھے۔ منہ سے نکل گیا۔ "میاں کھانا حاضر ہے"۔ آپ کے لائق یہ ساگ اور سوکھی روٹی نہ تھی لیکن باپ دادا کی ڈالی ہوئی عادت کو کیا کہوں، کھانا کھاتے وقت کسی کو پاس دیکھتا ہوں تو اس طرح کی بات منہ سے نکل ہی جاتی ہے۔ کوئی شریک ہوجاتا ہے تو دل خوش ہوجاتا ہے۔ نہیں ہوتا جب بھی ایک طرح کی تسکین ملتی ہے۔ مزدوری میں جو پیسے مل جاتے ہیں اس سے گزر بسر ہوجاتی ہے۔ اُس کا شکر ہے۔ محنت مزدوری سے سارے کام چلاتا رہتا ہوں۔ پیسے آپ اپنے پاس رکھیں!

میں نہایت شرمندہ ہوا اور اُس مزدور کے فقرِ غیوّر کے مقابلے میں اپنے تمام مناصب و مراتب پر لعنت بھیجتا ہوا گھر پہنچ گیا"۔ (رشید احمد صدیقی)

اختر صاحب اپنی جگہ سے اٹھ کر نسیم کی کرسی کے پاس آئے اور اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

"تم بیوقوفی کی حد تک سیدھے ہو اور بزدل بھی۔ میں تم سے بہت خوش ہوں۔ واقعی تم ایک نیک دل اور شریف انسان ہو۔ مجھے امید ہے کہ تم میری غلط فہمی کو نظر انداز کردوگے۔ اب جاکر اپنے کمرے میں آرام کرو۔ اور نسیم اُن کے کمرے سے باہر نکل آیا

اس واقعہ سے نسیم کے دل کو ایک چوٹ سی لگی۔ وہ کئی دن تک خاموش یہی سوچتا رہا کہ ایک غریب اور خوددار انسان کے لیے محبت کے بارے میں سوچنا بھی گناہ ہے۔ اُسے اتنا بھی حق نہیں پہنچتا کہ وہ تخیّل کی دنیا میں کسی فرضی ثریّا کو بھی بسا سکے۔ پھر اُس نے طے کرلیا کہ وہ جلد از جلد اس کمرے کو چھوڑ دے گا۔

ایک دن شام کو وہ تھکا تھکا سا اُس سے گھر آیا۔ کمرے کا دروازہ کھولتے ہی اُس کی نگاہ اندر پڑے ہوئے ایک لفافے پر پڑی۔ اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جھپٹ کر اُس نے لفافہ اٹھالیا اور بغور پتے کو دیکھنے لگا۔ خط پر اپنا ہی پتہ دیکھ کر سوچنے لگا آخر مجھے خط لکھنے والا کون ہوسکتا ہے؟ یہ اس کی زندگی میں پہلا خط تھا جو اُس نے خود نہیں لکھا تھا۔ کسی دوسرے نے اُس کے نام لکھا تھا۔ خوشی اور مسرّت کے جذبات کو لیے ہوئے وہ بار بار خط کو اُلٹتا پلٹتا رہا۔ ہمّت نہیں ہورہی تھی کہ لفافہ چاک کرکے پڑھے۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اندر سے کمرہ بند کرلیا اور پھر کرسی پر بیٹھ کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ کھولا اور خط پڑھنے لگا۔ جوں جوں وہ خط پڑھتا جاتا تھا اُس کے چہرے کا رنگ متغیّر ہوتا جاتا تھا اور خوشی سے اُس کی آنکھیں چمک اٹھتی تھیں۔ خط میں تحریر تھا۔

"جناب نسیم!"

آپ کو میرا خط پاکر حیرت ہوگی اور ہونا بھی چاہیئے تھا، کیوں کہ آپ مجھے نہیں جانتے۔ لیکن اُس دن ابو کے کمرہ میں جو باتیں ہوئیں اُس سے مجھے آپ سے بیحد ہمدردی پیدا ہوگئی۔ آپ کتنے سادہ لوح اور معصوم انسان ہیں۔ اتنی بڑی دنیا میں آپ پیار کو ترستے رہے اور کسی نے آپ کو پیار نہ دیا! آپ احساسِ کمتری کا شکار کیوں ہیں؟ خود اعتمادی انسان کا سب سے بڑا جوہر ہے۔ حوصلہ سے کام لیجیے۔ اتنے دنوں تک اپنے دل کی تسکین کے لیے اپنے آپ کو دھوکہ دیتے رہے اور ایک خیالی ثریّا بھی اب آپ سے روٹھ گئی۔ شاید وہ آپ کو اب کبھی خط نہ لکھے گی لیکن آپ مایوس نہ ہوں میں آپ کو یقین دلاتی ہوں آپ کی ثریّا زندہ ہے اور زندہ رہے گی! وہ اُسی طرح آپ کو خط لکھے گی جس طرح اب تک لکھتی آئی ہے۔ آپ خوش رہیے اور بس!

آپ کی۔ ثریّا اختر

نسیم نے خوشی سے جھوم کر خط کو سینے سے لگالیا۔ بار بار پڑھا اور پھر حسین تخیلات کی دنیا میں کھو گیا۔ ●●

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی

دُنیا اور آخرت سنوارنے والی
کتاب

آٹھ سو صفحات پر تیار ہے

دُنیا اور آخرت

قیمت بیس۲۰ روپے

سفید چکنا کاغذ اعلیٰ طباعت مجلد رنگین سرورق

تذکرہ خلفائے راشدینؓ (کلاں)
المعروف
ہشت بہشت

سفید چکنا کاغذ ــــ مجلد قیمت : دس روپے

کامیاب درزی خانہ ــــ قیمت : -/۸ روپے
پروین کشیدہ کاری ــــ قیمت : -/۹ روپے

بچوّں کے لیے دلچسپ کہانیاں

ایران کا فقیر ــــ ساٹھ پیسے
خوددار بیٹا ــــ ساٹھ پیسے
دولت مند بھکاری ــــ ساٹھ پیسے
بڑھیا کا بٹوہ ــــ چالیس پیسے

بیسویں صدی بک ڈپو
دریا گنج، نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰

یادوں کے سائے

بیگم ممتاز میرزا دہلوی کی شاعری کا ایک ایسا مجموعہ کلام جس میں شاعرہ کی انفرادی آرزومندی نے انسانیت کے وسیع تر مظاہر کی طرف بھرپور رہنمائی کی ہے۔
ہندوستانی عورت کی تعریف گیسوؤں کی برہمی، جھکی جھکی نظریں اور رُکتے جھجکتے قدم ہی نہیں بلکہ ہندوستانی عورت کی سپردگی، وفاشعاری اور اس کے نرم و لطیف جذبات کا اظہار اس مجموعہ کلام میں بڑی پاکیزگی اور خوبی سے کیا گیا ہے۔
نہایت خوبصورت عکسی طباعت اعلیٰ کتابت سفید چکنا کاغذ بڑے سائز پر اور گردپوش پاکستان کے مشہور آرٹسٹ اسلم کمال نے بنایا ہے اور ان تمام خوبیوں کے باوجود قیمت صرف بیس۲۰ روپے۔

ملنے کا پتہ:۔ **بیسویں صدی بک ڈپو، دریا گنج نئی دہلی**

تمام کشیدہ کاریوں سے سبقت لے جانے والی
تازہ ترین اور آخری ڈیزائن

شاہین کشیدہ کاری

مُرتبہ: شاہین آصف

نئے نئے ڈیزائن، گُل بوٹے، جمپروں کے گلے، تکیہ کے اشعار اور سینکڑوں ڈیزائنوں سے آراستہ ایک ایسی کشیدہ کاری، جو اب تک کی چھپی ہوئی تمام کشیدہ کاریوں سے افضل اور اعلیٰ ہے۔ فوٹو آفسٹ (عکسی) طباعت عمدہ اور دبیز کاغذ تین رنگ کی جلد سے مزین۔ قیمت صرف نو روپے۔

پونے دو۲ سو صفحات

بیسویں صدی بک ڈپو، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

غزلیں

نجمہ عزیز

محلہ قاضیان۔ بستی کیرت پور۔ ضلع بجنور (یو۔ پی)

●

کون جانے مرے دِل کی گہرائیاں؟
درد و غم کی ہیں دفن اس میں پرچھائیاں
یہ صِلہ بے گناہی کا اچھا ملا!
ہیں تعاقب میں کیوں میرے رُسوائیاں
کیوں ستاروں کے جُھرمٹ میں ہنگامِ شب
ڈس رہی ہیں مجھے میری تنہائیاں!
پھر سرِ شام یاد اُن کی آنے لگی
بج اُٹھیں پھر فضاؤں میں شہنائیاں
ظُلمتوں میں بُرائی کی دیکھی گئیں
قتل ہوتی ہوئی اپنی اچھائیاں
بزم میں تیری غزلوں کی، نجمہ کبھی
بُھول سکتے نہیں جلوہ آرائیاں

شہلا نگار شمسی

معرفت ڈاکٹر جمشید عالم (پلاسٹک سرجن) ۲۴۔ ایم۔ سی۔ پی۔ ڈبلیو۔ پی۔ ایم۔ سی۔ ایچ۔ پٹنہ۔ ۴ (بہار)

●

دیکھ کر مجھ کو کوئی آنکھ بھی بےتاب نہیں
میں تہی جام تو ہوں موجِ مئے ناب نہیں
تُم دِکھاؤ نہ مجھے میری مرادوں کے کھنڈر
اِن خرابوں میں کوئی رنگ نہیں آب نہیں
دل کو ہے اُن کے تغافل سے وفا کی اُمید
جن کو معلوم ابھی پیار کے آداب نہیں
تُم سلاؤ نہ مجھے جاگتے رہنے دو یونہی
میری آنکھوں میں کوئی پیار بھرا خواب نہیں
کام آیا نہ لہو دل کا سرِ شامِ غزل
میرے شعروں کی فضا ہے کہ شفق تاب نہیں

سیّدہ شانؔ معراج

محلہ تارین ٹکلی، عقب موہن نرسنگ ہوم، شاہجہانپور (یو۔پی)

●

رہبر ہو جذبِ شوق تو کیا ذکرِ پیچ و خم
تیری تلاش کو مری مشکل کہا نہ جائے
اک عمر کھو کے ہاتھ لگی ہے متاعِ غم
پھر کیوں اُسے حیات کا حاصل کہا نہ جائے
ترکِ طلب پہ آتو گئے ہیں کشاں کشاں
لیکن اِسے بھی آخری منزل کہا نہ جائے
پردہ بھی آئینہ پسِ پردہ بھی آئینہ
اندازِ دل فریبیِ محمل کہا نہ جائے
کہنے کو چھوڑ آئے ترا راستا مگر
اب کوئی راستا متبادل کہا نہ جائے
ہے کس لیے سکوت کا الزام شانؔ پر
تجھ سے بھی کچھ تو اے خلشِ دل کہا نہ جائے

یہ کتابیں ہم سے طلب کیجیے

حافظ اور اقبال
ڈاکٹر یوسف حسین خاں

اس کتاب میں مصنف نے بڑی خوبی سے تنقید اور تحقیق کو ایک دوسرے میں سمو دیا ہے اور دونوں عارفوں کی فکر کی مماثلت اور اختلاف کو بڑی جامعیت کے ساتھ نمایاں کیا ہے۔ حافظ اور اقبال کے کلام پر ایسی مدلل بحث نہ اُردو میں ملتی ہے اور نہ فارسی میں۔ قیمت -/۲۵ روپے

روحِ اقبال (صدی ایڈیشن)
ڈاکٹر یوسف حسین خاں

اس کتاب میں مصنف نے اقبال کی فکر اور شاعری کا بالکل انوکھے انداز میں تجزیہ کیا ہے۔ اس کتاب سے اُردو زبان کے تنقیدی ادب میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔

قیمت -/۲۵ روپے

غالب اور آہنگ غالب
ڈاکٹر یوسف حسین خاں

غالب پر یہ سب سے زیادہ جامع اور فکر انگیز تصنیف ہے۔ اس میں غالب کی شخصیت پر بالکل انوکھے انداز میں تجزیہ کیا گیا ہے جس سے اردو کے تنقیدی ادب میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ قیمت : -/۱۶ روپے

نقشِ غالب
پروفیسر اسلوب احمد انصاری

اِس کتاب میں غالب کی اُردو اور فارسی شاعری اور اُردو خطوط کو فکر اور فن کی میزان پر پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ غالب کی افہام و تفہیم کے سلسلے میں یہ ایک نہایت وقیع کوشش ہے جسے انداز بیان کی شیفتگی اور ندرت نے پرکشش بنا دیا ہے۔ قیمت -/۱۲ روپے۔

غالب اور ذکا
ضیاء الدین احمد شکیب

یہ تالیف مرزا غالب کی زندگی کے آخر دس برسوں کی بعض کھوئی کڑیوں کی بازیافت کرتی ہے۔ ذکا بیلوری کی نظم و نثر پر غالب کی اصلاحوں کے ساتھ یہ کتاب ماحول، تاریخی پس منظر اور روابط کے تجزیہ کی روشنی میں مطالعۂ غالب کے نئے مناہج و امکانات کی نشان دہی کرتی ہے۔ قیمت -/۶ روپے۔

تلمیحات غالب
محمود نیازی

یہ ان تلمیحات کی تشریح و توضیح کا مجموعہ ہے جنہیں غالب نے اپنے اردو کلام میں نہایت منفرد انداز میں اپنایا ہے۔ اس کتاب میں وہ تلمیحات بھی شامل ہیں جو مرزا نے خود اختراع کی ہیں۔ یہ کتاب غالب فہمی کی کوشش میں ایک اہم اضافہ ہے۔

قیمت : -/۶ روپے

دیگر ادبی کتب

لکھنؤ کا دبستان شاعری	ڈاکٹر ابو اللیث	-/۲۵ روپے
ہماری داستانیں	وقار عظیم	-/۱۵ روپے
دکنی ادب کی تاریخ	محی الدین قادری زور	-/۵ روپے
قواعدِ اُردو	مولانا عبدالحق	-/۱۰ روپے
پطرس کے مضامین	پطرس بخاری	۳/۵۰ روپے
چراغ تلے (طنز و مزاح)	مشتاق احمد یوسفی	-/۶ روپے
خاکم بدہن	〃 〃 〃	۷/۵۰ روپے
تنقیدی زاویے	ڈاکٹر عبادت بریلوی	-/۱۰ روپے
اُردو تنقید نگاری	〃 〃 〃	۱۱/۵۰ روپے
اُردو تنقید کا ارتقا	〃 〃 〃	-/۱۶ روپے
پیامِ اقبال	عبدالرحمٰن طارق	-/۱۰ روپے
ذکرِ اقبال	عبدالمجید سالک	۱۲/۵۰ روپے
عرفانِ اقبال	بشیر مخفی	-/۱۰ روپے
ولی سے اقبال تک	ڈاکٹر سید عبداللہ	-/۹ روپے
سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا	〃	۱۲/۵۰ روپے
میر امن سے عبدالحق تک	〃	-/۱۵ روپے
مقاماتِ اقبال	〃	۱۰/۵۰ روپے
داستان زبان اُردو	ڈاکٹر شوکت سبزواری	۷/۵۰ روپے
اُردو زبان کا ارتقا	〃 〃 〃	-/۱۱ روپے
اُردو کی تین مثنویاں	پروفیسر خاں رشید	-/۶ روپے
ترقی پسند ادب	عزیز احمد	-/۶ روپے
قول فیصل	مولانا آزاد	۵/۵۰ روپے

ناول

شبیلہ	فرزانہ یاسمین	۹/۵۰ روپے
دیوانی	ماہِ مبین	-/۸ روپے
فرحی	فرزانہ نصیر	-/۱۰ روپے
نائرہ	〃	-/۹ روپے
دور اک تارا	شیریں گل درانی	-/۱۲ روپے

بیسویں صدی بک ڈپو۔ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

افسانہ

آخری خط

عزیز مرادآبادی

محلہ قاضیاں
بسی کرت پور، ضلع بجنور (یو۔پی)

محترمی رحمٰن نیر صاحب!
تسلیم
آپ کا حکم سر آنکھوں پر!
آپ کے اس پیار بھرے حکم کو بھلا کیسے ٹالا جا سکتا ہے ---؟
یہ آپ کے پیار اور خلوص کا ہی تو کرشمہ ہے کہ ادھر میں نے "بیسویں صدی" کے لیے افسانے کو آخری شکل دی، اُدھر آپ کا حکمنامہ مل گیا۔
اس لیے خلوص کی اس شدت اور کرشمہ سازی کے پیشِ نظر میرے پاس شکریہ ادا کرنے کے لیے مناسب الفاظ نہیں ہیں ---!!
آپ کا بھائی
عزیز مرادآبادی

مجھ سے دور، دل کے قریب، میرے ندیم! سلامِ محبت قبول کیجیے۔

خدا آپ کو ہر بلا سے محفوظ رکھے!

جب میں ہاسٹل چھوڑ کر گھر آئی تھی تو کچھ دنوں تک آپ نے میرے ہر خط کا جواب پابندی کے ساتھ دیا تھا۔ آپ اپنے ہر خط میں اپنے دل کے اضطراب اور احساس و جذبات کو خط کے بے جان صفحات میں یوں سمو دیتے تھے کہ آپ کا محبت نامہ کراہتا ہوا محسوس ہوتا تھا، لفظ لفظ دل میں نشتر کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر جاتا تھا۔ لیکن اُف ---! مجھے آپ اب تک کتنے خطوط کے جوابات سے محروم کر چکے ہیں، کبھی سوچا بھی آپ نے؟ کیا آپ محسوس کر سکتے ہیں کہ لمحہ لمحہ انتظار کی جاں گسل گھڑیوں میں بدل کر کس طرح صدیوں کا روپ دھارتا جا رہا ہے!؟

مجھے آپ نے اپنے قرب کی خوشبو سے نواز کر بے کراں خوشیوں کے لمحات سے ہمکنار کیا تھا، لیکن وہی لمحے اب ہوا کے ناپائیدار جھونکے ثابت ہو رہے ہیں، جو خوشیاں بکھیرتے ہوئے آئے تھے اور اب ساری خوشیوں کو سمیٹ کر لیے جا رہے ہیں! میں بار بار لکھ چکی ہوں کہ جب سے آپ سے جُدا ہوئی ہوں میرا بُرا حال ہے ؎

تری دُوری سے بے کل ہو گیا ہے ∴ مرا دل جیسے پاگل ہو گیا ہے

دلِ دیوانہ کی یہ حالت تو یہاں آتے ہی ہو گئی تھی، لیکن آپ کی مسلسل خاموشی نے تو اب یہ حال کر دیا ہے کہ ؎

نہیں ملتا سکوں اب ایک بھی پل ∴ کہ دردِ دل مسلسل ہو گیا ہے

آپ کی بے توجہی، یکایک خاموشی اور سنگ دلی کے نشتروں سے تڑپ تڑپ کر اب مجھے یہ بھی افسوس ہے کہ ؎

نہ کہا روزِ ازل میں نے خدا سے افسوس!
اور کچھ لکھ مری قسمت میں محبت کے سوا

اب مجھے بے رحم وقت ایک ایسے انجان اور نامعلوم غم سے روشناس کرا رہا ہے جس کا احساس میری نس نس میں غم و اندوہ اور کرب و اضطراب کا طوفان بپا کر دیتا ہے۔ میں تو محبت کو صرف ایک مقدس خوشبو سے معطر رشتہ سمجھتی تھی --- ایک ایسا اٹوٹ رشتہ سمجھتی تھی جو جسموں کے تحلیل ہو جانے پر بھی نہیں ٹوٹا کرتا۔ محبت کو میں نے روحوں کا اتصال سمجھا تھا... لیکن افسوس!

آپ نے ثابت کر دیا کہ محبت ایک فرسودہ جذبہ ہے، محبت دماغ کا خلل ہے، محبت ایک خوبصورت فریب ہے! خوبصورت اور رنگین فریب!!

اگر آپ نے اب بھی جواب نہ دیا تو مجھے خود کو مجبوراً حزن و ملال، درد و کرب اور یاس و حسرت کے حصار سے نکالنے کے لیے خوشگوار زندگی سے سمجھوتہ کرنا ہی پڑے گا۔ میں عجیب کش مکش میں مبتلا ہوں! غالباً میری حالت دیکھ کر میرے شفیق والدین کا ارادہ فیصلے کی قطعی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ وہ میری قسمت کسی اور کے سپرد کر دینا چاہتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے شادی کے بعد میرے مرجھائے ہوئے چہرے پر مسرت و شادمانی کے پھول کھل سکتے ہیں! اس ضمن میں میری ہمراز سہیلیوں اور رشتے کی بہنوں سے میری رضامندی معلوم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے.... اس لیے اگر آپ کا جواب پندرہ دن کے اندر اندر مجھے نہ ملا تو میں اپنی خزاں رسیدہ زندگی کی ویرانی اور وحشت کو کم کرنے کے لیے اپنی ساری آرزوئیں کو والدین کی مرضی کے سپرد کر دوں گی! آپ ہی فیصلہ کیجیے، آخر میں کب تک امید و بیم کی کشمکش میں مبتلا رہوں؟ کب تک والدین کو بغیر کسی معقول وجہ کے انتظار کی زحمت میں مبتلا کرتی رہوں؟ البتہ میں آپ کی خوشی، آپ کی مرضی کے لیے خودکشی کے جُرم کا بھی ارتکاب کر سکتی ہوں۔ بشرطیکہ آپ اپنی وفاداری کا ثبوت پیش کرتے ہوئے مجھے ہلکا سا ہی اشارہ کر دیں! بغیر کسی وجہ کے آپ کی مسلسل خاموشی اور بے پروائی میرے لیے اذیت ناک پہیلی بن کر رہ گئی ہے!

کبھی کبھی تو میرا شک یقین میں بدل جاتا ہے آپ کسی اور لڑکی کی حسین و پرستش شخصیت میں خود کو گم کر چکے ہیں، کیونکہ سائیکالوجی ڈیپارٹمنٹ میں جس جگہ آپ تعینات ہیں وہاں خوب سے خوب تر لڑکیوں کی نمائش سی لگی رہتی ہے۔ بے شمار ہیروں کی چمک دمک کے سامنے پتھر کے ایک حقیر ٹکڑے کا خیال کیونکر رہ سکتا ہے؟!

مقررہ مدت میں آپ کا جواب آنے تک میری مرضی آپ کے لیے محفوظ ہے۔ براہِ کرم میرے حالِ پریشاں پر ترس کھائیے اور پندرہ دن کے اندر اندر اپنے امید افزا جواب سے ضرور نواز دیجیے، ورنہ مجھے اپنا ارادہ بدلنا پڑے گا!

ارے ہاں، یاد آیا! آپ کی نورِ نظر شاگردہ

"زہرہ جمال" کے خطوط سے آپ کی خیریت معلوم ہوتی رہتی ہے کہ آپ پابندی سے اپنی ڈیوٹی جوائن کر رہے ہیں اور صحت مند و توانا ہیں ـــــ!!

آپ کی اپنی ـــــ آصفہ عبدالرب

محترمہ آصفہ صاحبہ! تسلیمات

آپ کے کئی خطوط درد میں ڈوبے ہوئے ملے تھے، شکریہ! مجھے خود بھی آپ کی حالت کا شدید احساس ہے، لیکن کبھی کبھی قسمت بھی انسان کے ساتھ عجیب کھیل کھیلتی ہے۔ مجھے اپنی محبت کو اپنے مشفق و دُور اندیش والدین کی مرضی پر قربان کر دینا پڑا، یعنی مجھے شادی کے مقدس بندھن میں باندھ دیا گیا ہے۔ میں نے آپ کے اُن سارے خطوط کے جواب دانستہ ہی نہیں دئے تھے جو میری شادی کے بعد مجھے ملے تھے۔ پھر شادی چٹ منگنی پٹ بیاہ کے اصول کے تحت فوراً ہی ہو گئی تھی! میرا خیال تھا کہ مجھے بے وفا، دغاباز اور فریب کار سمجھ کر آپ ہمیشہ کے لیے بھول جائیں گی اور اپنی بہکی ہوئی، آوارہ زندگی کو ہمیشہ کے لیے کسی خوشگوار سمت کی طرف موڑ لیں گی!

آپ سمجھ دار، پڑھی لکھی ہیں! مجھے یقین ہے کہ میری مجبوری کے پیشِ نظر مجھے ضرور معاف فرما دیں گی۔ اور اپنی مرضی کو اپنے والدین کے سپرد کر کے خوشیوں کے پھولوں سے اپنی زندگی کا دامن ضرور بھر لیں گی!

آپ کا بہی خواہ، ندیم

مسٹر ندیم!

آخر وہی ہوا نا جس کا مجھے اندیشہ تھا! تم نے بہانہ تراش کر اپنی خوشیوں کی خاطر بلکہ ہوس پرستی کے جذبے کو تسکین دینے کے لیے مجھے فریب میں مبتلا رکھا۔ خیر، میں بھی پاگل لڑکی نہیں ہوں جو اپنا اچھا بُرا نہ سوچ سکوں۔ آج میری شادی ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا ہے۔ میرے شوہر تم سے لاکھ درجے اچھے ہیں! اعلیٰ تعلیم سے آراستہ ہیں۔ خوبصورت و خوب سیرت ہیں۔ انھوں نے میری خزاں رسیدہ زندگی کو بہار بکنار بنانے کے لیے اپنی ساری توجہ، ساری فکریں، سارے خیالات اور احساسات و جذبات میرے لیے وقف کر دیے ہیں!

اب تم میری نظر سے کسی کمینہ خصلت، فریبی، دغاباز اور ہوس پرست انسان کی طرح ہمیشہ کے لیے گر چکے ہو! ایک حیادار کے لیے یہ ایک جملہ ہی کافی ہے اور بس! اسی سمندر سے بھی گہرے جملے میں ڈوب مرنے کے لیے چلّو بھر پانی بہ آسانی حاصل کیا جا سکتا ہے! لیکن سوال یہ ہے کہ تم حیادار ہو بھی ـــــ؟

فریب خوردہ، لیکن مسرور و مطمئن

آصفہ پرویز۔

یاس کی تاریکیوں میں ڈوب جانے دے مجھے!

اب میں شمعِ آرزو کی لَو بڑھا سکتا نہیں

محترمہ آصفہ صاحبہ! واجبات

شادی مبارک ہو ـــــ! آپ نے مجھے اپنے خط میں جن خطابات سے نوازا ہے ان کی تلخی مجھ سے برداشت نہ ہو سکی اور مجبوراً یہ آخری خط آپ کی خدمت میں ارسال کر دینا ضروری سا ہو گیا!

میں پہلے کیا تھا؟ اب کیا ہوں؟ اس کا اندازہ آپ اس خط سے لگا سکیں گی جو میرے اسی خط کے ساتھ اوریجنل فارم میں ہی منسلک ہے!

بے قصور و مجبور، ندیم!"

"عزیزم میاں ندیم! دعائیں

بیٹا! اگر تمہارا ایک تفصیلی خط میرے ہاتھ نہ لگتا تو میں سارے معاملات سے بے خبر رہتا، تم یقیناً کسی اچھے خاندان کے چشم و چراغ ہو گے! تم اچھے انسان ہوتے ہوئے بھی میری اکلوتی بیٹی کو جذبات کی رَو میں بہہ کر غلط راہ دکھا رہے ہو! کیا یہ مناسب ہے ـــــ؟

تمہاری سمجھ داری اور معاملہ فہمی پر یقین کرتے ہوئے میں تمہیں اس حقیقت سے روشناس کرانا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ میں اپنے مرحوم بڑے بھائی صاحب کے اکلوتے اور یتیم بیٹے کو اپنا چکا ہوں! بھائی صاحب سے، اُن کی جاں کنی کے وقت عہد کر چکا ہوں کہ میں اپنے بھتیجے جی آصفہ کو اُن کی بہو ضرور بناؤں گا..... !! اس وعدہ کے بعد ہی اُن کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی تھی، میری اس انتہائی مجبوری کے پیشِ نظر تم آصفہ کے راستے سے ڈرامائی انداز میں ہمیشہ کے لیے ہٹ جاؤ تو میں اپنے فرض سے بخوبی سبکدوش ہو سکوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم میری اس درخواست کو ٹھکراؤ گے نہیں اور آصفہ سے سارے رشتے ناطے توڑ کر ایک مجبور باپ کے عہد کی لاج رکھ لو گے!

تمہارے خوشگوار مستقبل کے لیے میری دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں!

تمہارا ممنونِ کرم، عبدالرب"

●●

مشہور افسانہ نگار حضرت آسی رام نگری نے سہ ماہی [illegible] اصلاح کا کام بھی کرتے ہیں۔ [illegible] اصحاب خصوصاً نئے لکھنے والے اپنے مضامین، افسانوں اور کتابوں پر اصلاح لے کر ایک مستند ادیب کی خدمات سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ [illegible] طلب امور کے لیے جوابی لفافہ یا ٹکٹ بھیجئے۔ پتہ: حضرت آسی رام نگری [illegible]

افسانہ

نئی نسل

محمد رفیع انصاری

۵۴- درگاہ روڈ- بھیونڈی
ضلع تھانہ (مہاراشٹرا)

●

محترم نیر صاحب! آداب

ایک ہلکا پھلکا افسانہ "نئی نسل"، "بیسویں صدی" کے لیے بھیج رہا ہوں۔ نئی نسل کے طلبہ ممتحن کو امتحان ہال میں کس کس طرح پریشان کرتے ہیں اور کیا کیا حرکتیں کرتے ہیں اُس کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے اور اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے۔

مخلص
محمد رفیع انصاری

"پرچہ بہت مشکل ہے۔ عالمگیر!"
"ایک کام کرو شہناز!"
"کیا؟"
"سوال کا پرچہ مجھے دے دو۔"
"کیوں؟"
"میں مشکل سوالوں کو حل کر دیتا ہوں۔"
"کسی کو معلوم ہو گیا تو!"
"مجھے اپنے آپ پر بہت بھروسہ ہے۔"
"لیکن میں تو ڈرتی ہوں۔"
"ڈرو گی تو پچھتاؤ گی۔"
"میری ہمت نہیں پڑتی۔"
"بے ہمتی کرو گی تو روؤ گی۔"
"اچھا! تو یہ پرچہ لے لو۔"
"ہوں، رک کیوں گئیں؟"
"وہ دیکھ رہا ہے!"
"اُسے مارو گولی!"
"کبھی اُس نے ہم دونوں کو گولی مار دی تو؟"
"امتحان ہال میں بھی تمہیں مذاق سوجھا ہے!"
"تم بات ہی ایسی کرتے ہو۔"
"پھر کیا ارادہ ہے؟"
"ابھی اسے ملتوی کر دو۔"

"تم کیا کر رہے تھے؟"
"کچھ بھی تو نہیں سر۔"
"ابھی اس لڑکی سے تم کیا باتیں کر رہے تھے؟"
"سر! میں اُس سے پیار کی باتیں کر رہا تھا!"
"تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ تفریح گاہ نہیں ہے!"
"جی ہاں میں جانتا ہوں کہ یہ امتحان ہال ہے۔"
"پھر ایسی حرکت کیوں کی؟"
"کیا کروں سر! دل کے ہاتھوں مجبور ہوں!"
"تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ میں بھی مجبور ہوں۔"
"پھر سر!"
"میں تمہیں امتحان ہال سے نکال سکتا ہوں۔"
"ایسا؟"
"ہاں!"
"سر!"
"کیا؟"
"آئندہ ایسی حرکت نہ کروں گا۔"
"چھوڑ دیتا ہوں۔"

"اے لڑکی اب تم بتاؤ کہ تم دونوں میں کیا باتیں ہو رہی تھیں؟"
"سر یہ لڑکا مجھے دھمکیاں دے رہا تھا!"
"امتحان ہال میں بھی!"
"جی ہاں"
"پھر!"

"وہ کہہ رہا تھا"
"کیا کہہ رہا تھا؟"
"وہ کہہ رہا تھا کہ میں مر جاؤں گا!"
"تو پھر تم نے کیا کہا؟"
"میں نے کہا میں بھی مر جاؤں گی!"
"اور تم دونوں یہ بھول گئے۔"
"کیا سر؟"
"کہ امتحان ہال میں تم دونوں کی موت سے میرے بھی جان کے لالے پڑ جائیں گے!"
"جی!"
"میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی!"
"کیا بات؟"
"کہ آخر یہ نئی نسل کہاں جا رہی ہے؟"
"کچھ پتہ نہیں کہ یہ کہاں جا رہی ہے؟"

"سر! ایک بات کہوں!"
"یہ نیا لڑکا کون بولا؟"
"میں مجاہد ہوں۔"
"کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"
"سر! مجھے معلوم ہے یہ نئی نسل کہاں جا رہی ہے؟"
"کہاں جا رہی ہے؟"
"لیکن میں اس کا پتہ بتانا نہیں چاہتا!"
"وہ بھلا کیوں؟"
"ہاں! ایک شرط پر بتا سکتا ہوں!"
"کیا شرط ہے؟"
"پہلے آپ سوال نمبر پانچ بتائیے۔"
"شٹ اپ۔ نان سنس!"

"پھر تم نے بات شروع کر دی عالمگیر!"
"سر مجھے آپ سے ایک درخواست کرنی ہے؟"
"واٹ؟"
"میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں؟"
"واٹ بات؟"
"میں شدید تکلیف میں مبتلا ہوں!"
"کیا تکلیف ہے؟"
"اس وقت میں عجیب عجیب مناظر دیکھ رہا ہوں۔"
"کیا؟"
"تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔"
"ہوں"
"یہ سچ ہے کہ میگستھنیز کی تصنیف ”انڈیکا“ ہے۔"
"......"
"ہٹلر نے ۳۰ اپریل ۱۹۴۵ء کو خودکشی کی تھی۔"
"کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"
"ٹالسٹائی اور میکسم گورکی دو روسی ادیب تھے۔"
"معلوم ہوتا ہے اسے بخار ہو گیا ہے۔"
"سر میں کہاں ہوں؟"
"امتحان ہال میں!"
"بسمارک جرمنی کا رہنما تھا"
"آں"
"آرک ڈیوک فرڈی نینڈ آسٹریا کا ولی عہد تھا۔"
"خاموش ہو جاؤ"
"اودھم سنگھ نے ظالم اوڈوائر کو خاموش کر دیا!"
"ڈاکٹر کو بلاؤ۔"
"ڈاکٹر اینی بسینٹ نے ہوم رول کا مطالبہ کیا۔"
"چپراسی کدھر ہے؟"
"کینیا افریقہ میں ہے۔"
"یہ تم کیا بک رہے ہو؟"
"بک نہیں رہا فرما رہا ہوں۔"
"آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"
"سر!"
"کیا؟؟؟"
"مجھے کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔"
"پھر کیوں چلا رہے ہو؟"
"صرف ایک درخواست ہے آپ سے؟"
"اب بولو بھی خدا کے لیے۔"
"مجھے ایک گلاس پانی منگوا دیجیے"
"بس!"
"جی!"
"پانی میں ڈوب مرنے کا مقام ہے کم بختو!"
"......"
"اب اگر کسی نے منہ کھولا تو اسے باہر نکال دیا جائے گا!"
"اے لڑکی!"
"جی سر!"
"اب تم بھی بات مت کرنا۔"
"جی نہیں۔"
"....."
"سر! یہ سوال نمبر پانچ واقعی بہت مشکل تھا!"
"ہوں!"
"لیکن ہم نے اسے حل کر لیا!"
"میری موجودگی میں تم نے یہ حرکت کیسے کی؟"
"بہت آسانی سے!"
"آں"
ابھی ابھی عالمگیر کی زبانی تاریخ دہرائی جا رہی تھی۔
"کیا مطلب؟؟؟"
"مطلب یہ کہ عالمگیر نے ہمیں بتا دیا۔"
"میری موجودگی میں کیسے بتایا؟"
"وہ آپ سے باتیں کر رہا تھا نا۔"
"ہاں"
"آپ کو اس کی بکواس نے پریشان کر دیا تھا۔"
"ہوں!"
"اور ہمیں اپنے سوالوں کا جواب مل رہا تھا۔"

"اچھا تو یہ بات تھی!"

"جی"

"تب ہی تو تم سب ہمہ تن گوش تھے۔"

"ہوں!!!"

"عالمگیر"

"جی سر!"

"تم نے یہ کیا حرکت کی؟"

"جی"

"اب تم امتحان ہال میں ایک منٹ بھی نہیں ٹھہر سکتے!"

"اوہ!"

"فوراً چلے جاؤ"

"جیسے... آپ کی... مرضی"

"جاتے جاتے ایک بات کہنا چاہتا ہوں"

"بکواس بند کرو!"

"آپ کو ایک اطلاع دینا چاہتا ہوں۔"

"کیسی اطلاع؟؟؟"

"یہی کہ امتحان کا وقت بس... ختم ہوگیا۔ سُنیئے بیل بج رہی ہے۔"

میں جارہا ہوں

"......"

"ہم جارہے ہیں"

"پتہ نہیں یہ نئی نسل کہاں جارہی ہے"

●●

طنزیہ

رپورتاژ کی تیسری قسط

آدھے آدمی کا سفر

فکر تونسوی

۵۰ ڈی۔ گل مہر پارک نئی دہلی

قافلہ ــــ مریضوں کا

جب آدھا آدمی اپنے وارڈ کے فرنٹ وِنگ میں آیا تھا۔ تو تنہا تھا۔ اُس کے ساتھ کوئی قافلہ، کوئی راہی نہیں تھا۔ چنانچہ اُس کا سفر شروع ہُوا۔ تو وُہ "بیڈ" پر تنہا بیٹھا تھا۔ اُسے بیٹھنے کی بجائے بیڈ پر لیٹ جانا چاہیے تھا۔ کیونکہ بیڈ پر لیٹا ہُوا آدمی ہی مریض معلوم ہوتا ہے ــــ لیکن اُسے لیٹتے ہوئے شرم محسوس ہوتی تھی۔ کیونکہ اُس کے گرد وپیش میں کوئی پڑوسی مریض نہیں تھا۔ پڑوس چاہے مریضوں کا ہو، جس میں پُورا ہندوستان سمایا ہُوا ہے اُسے آباد ضرور ہونا چاہیے۔ انسان چاہے لکڑ بگڑ ہو، بندر ہو، بکری ہو، تنہا نہیں رہ سکتا۔

"یہ کس احمق نے کہا تھا کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے۔" آدھے آدمی نے سوچا۔

"میں تو کہتا ہوں دُنیا کی ہر شے سماجی حیوان ہے۔ مثلاً ایک بیڈ کو لے لیجیے وُہ بھی ایک سماجی حیوان ہے" آدھے آدمی نے اپنے سوال کا خود ہی جواب دے دیا۔ کیونکہ جواب دینے کے لیے کوئی پڑوسی نہیں تھا۔

آپ ہسپتال کے پورے وارڈ میں صرف ایک، تنہا بیڈ ڈال دیجیے یُوں لگے گا، جیسے اُس بیڈ نے کسی کو قتل کیا ہے۔ جس کی اُسے یہ سزا مل رہی ہے ــــ تنہائی کی سزا۔

کہتے ہیں کہ پڑوسی اچھا ہو تمہارا نصیب اچھا ہے، پڑوسی بُرا ہو تو تمہارا نصیب بُرا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے۔ کہ اگر پڑوسی ہی نہ ہو۔ تو تمہارے پاس نصیب ہی نہیں ہے۔ نہ اچھا نہ بُرا۔

آدھا آدمی جب اپنے بیڈ پر آکر بیٹھا۔ تو وِنگ کے باقی سبھی بیڈ خالی تھے یوں لگتا تھا یہ وِنگ نہیں کوئی نئی تعمیر شدہ رفیوجی کالونی ہے۔ جو ابھی آباد نہیں ہُوئی۔ یہ ایک ایسا مُلک ہے، جسے کوئی نادر شاہ ویران کر گیا ہے۔ زندگی کا کھیل یونہی صدیوں سے جاری ہے، انسان آتے ہیں، بستیاں بساتے ہیں، رہن سہن کے کچھ ڈھنگ اور آداب بناتے ہیں اور اُسے اپنی تہذیب کا دلکش نام دے دیتے ہیں۔ اُس کے بعد کوئی نادر شاہ، کوئی چنگیز خاں، کوئی ہٹلر آتا ہے اور اُس تہذیب کو ملیامیٹ کر جاتا ہے۔ بیڈ پھر خالی ہو جاتے ہیں۔ صرف اُن کے نام ونشان اور کھنڈر باقی رہ جاتے ہیں۔ لیکن ہسپتال والوں نے تو اُن کے کھنڈر بھی مٹا دیے تھے، پلنگ دھو دھو کر، اور اُن پر نئی چادریں اور سرہانے سجا کر رکھ دیے تھے، پُرانے مریضوں کے آثار مٹا دیے تھے۔ اور نئے مریضوں کا انتظار کر رہے تھے تا کہ وُہ آکر اپنی نئی تہذیب بنائیں اور جسے ہم پھر مٹا ڈالیں۔

اور اللہ کی اس دُنیا میں بندوں کی اور ہندوستان میں مریضوں کی کوئی کمی نہیں۔ چنانچہ دُوسری صُبح کا سورج ابھی طلوع بھی نہیں ہُوا تھا۔ کہ میرے قریب کے پلنگ سے کسی کے کھانسنے کی آواز آئی، یہ بڑی خطرناک کھانسی تھی۔ میرا خیال ہے اگر موت کو کسی ہسپتال کے بیڈ پر بطور مریض لِٹا دیا جائے تو وہ بالکل اسی طرح کھانسے گی۔

"کون ہو، ارے بھئی کھانسنے والے!" میں نے فلم دیوداس کے دِق زدہ سہگل کے کرب انگیز لہجے میں پوچھا۔

"ایک سکول ماسٹر ہوں۔ تھوک میں خون آتا ہے۔ ہائے!" اُس نے بمشکل جواب دیا۔

آدھے آدمی نے پُوری آنکھیں کھول کر پورے سکول ماسٹر کو دیکھنا چاہا۔ ادھیڑ عُمر کا کوئی شریف النفس انسان لگتا تھا۔ سر کے کچھ بال اُڑ گئے تھے۔ بے ساختہ جی میں آئی۔ اس جدید تہذیب کے سہگل سے ہمدردی جتاؤں۔ آدھا آدمی جسے خود ہمدردی کی ضرورت ہو وُہ دوسروں کی ہمدردی کرے ــــ یہ کچھ کم تکلّف سا لگتا ہے۔ میرا مطلب ہے، یہ بیکار کی مکّاری ہے اور پھر یُوں بھی جبکہ میرے اندر کا آدھا آدمی اپنی تمام مکّاریوں اور بناوٹوں کے ساتھ بے حِس ہو چکا تھا، میں اُس بے حِس آدھے

آدمی کو دوبارہ تکلّف کا شکار نہیں بنانا چاہتا تھا، لہٰذا میں نے کہا۔

"ماسٹر جی! باہر سے آپ کے بال اور اندر سے پھیپھڑا اُڑ چکا ہے۔ سکول کے اوقات کے علاوہ ٹیوشنیں بھی پڑھایا کرتے ہو؟"

"کیا کریں جی! ٹیوشنیں نہ پڑھائیں تو گزارا نہیں ہوتا۔ گورنمنٹ کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔ ٹیچروں سے ایسے سلوک کرتی ہے جیسے... جیسے... کھوں کھوں، کھوں!"

ماسٹر جی پر کھانسی کا دورہ پھر پڑا۔ وہ گورنمنٹ کے خلاف اپنی تشبیہ مکمل نہیں کر سکے۔ لیکن میں نے دل ہی دل میں مکمل ضرور کر لی کہ گورنمنٹ بچارے ٹیچروں سے یوں سلوک کرتی ہے جیسے وہ انسان نہ ہوں کھانسی کی کھوں کھوں ہوں۔ ہندوستان کے ان گنت لوگ صبح، دوپہر، شام کھانستے پھرتے ہیں۔ لیکن اُسے کیا پرواہ ہے کسی وزیر کو کھانسی نہیں ہوتی، اس لیے گورنمنٹ کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ کھوں کھوں کس بلا کا نام ہے۔ ٹیچر کیوں کھانستا ہے، اُس کی کھانسی میں خون کیوں آتا ہے؛ انتہائی جلتی دوپہروں میں، سردی کی برفیلی راتوں میں، بائیسکل پر کئی کئی میل کا سفر طے کر کے، وہ ٹیوشنیں نہ پڑھاتے تو دو روٹیوں کی بجائے ڈیڑھ روٹی سے پیٹ کو بھر کر اُسے حسین فریب دینا پڑتا ہے۔ مگر پھیپھڑا فریب کھانے کا عادی نہیں۔ چنانچہ شدید محنت، مسلسل نیم فاقہ کشی اور گھٹیا خوراک کھانے سے آخر ایک دن اُس کے تھوک میں خون آنے لگتا ہے۔ یہ تہذیب کا خون ہے، اور یہ خونخوار تہذیب آخر ایک دن اُسے ہسپتال کا راستہ دکھا دیتی ہے۔

ماسٹر جی میرا اچھا پڑوسی ہے۔ ہر کھوں کھوں میری دوست بن جاتی ہے۔ وہ میرے نام سے بھی پہلے سے آشنا ہے۔ وہ پڑھا لکھا آدمی ہے۔ اس لیے عقل مندانہ باتیں بھی اُس کے منہ سے نکل جاتی ہیں۔ حالانکہ خونخوار تہذیب کو ماسٹر جی کی کھانسی کی ضرورت ہے اُس کی عقل کی نہیں۔

میرا دوسرا پڑوسی ایک جمعدار ہے۔ وہ مریض نہیں ہے مگر جدید تہذیب نے اُس کے کھردرے ڈھانچے کو مریض کا سا روپ دے رکھا ہے وہ وارڈ کا کوڑا کرکٹ صاف کرنے آتا ہے، مکار تہذیب نے صرف اُس کا لفظی مرتبہ بلند کر دیا ہے۔ یعنی اُسے بھنگی نہیں کہتی، صفائی کرمچاری کہتی ہے۔

لیکن اُس دن وہ صفائی کرتے کرتے اچانک گر پڑا، اپنا دل تھام لیا۔ میں نے کہا "خیراتی رام! کیا سمجھتا ہے؟"

"بابو جی! مجھے اسی طرح کبھی کبھی دل کا دورہ پڑ جاتا ہے۔"

"دل کا دورہ پڑتا ہے اور پھر بھی جھاڑو دیے جاتے ہو۔ چھوڑو جھاڑو! اور ڈاکٹر سے کہو، مجھے بھی ایک بیڈ دلا دو۔ میں بھی لیٹوں گا"

"نہیں بابو! دل کی بیماری تو امیرانہ ہے، میں غریب ہوں، غریب کو بیڈ کون دیتا ہے، اُسے تو جھاڑو دے دیتے ہیں۔ مگر آپ گھبرائیے نہیں، میں ابھی مروں گا نہیں، ابھی نہیں، ابھی جھاڑو دیے جاؤں گا۔ جب تک اپنی لجو بیٹی کے ہاتھ پیلے نہیں کر لوں گا۔"

مجھے یوں لگا۔ امیروں نے غریبوں کو اور تو کچھ نہیں دیا، اپنی دل کی بیماری میں سے حصہ دینا ضرور شروع کر دیا۔ بیٹی کے ہاتھ جہیز کے بغیر پیلے نہیں ہوں تو خیراتی کے دل کو ایسے جھٹکے لگتے رہیں گے۔

اور مجھے یوں لگا، جیسے خیراتی رام کو اس دنیا میں بطور خیرات بھیجا گیا ہے۔ اُس کا رنگ نسلاً کالا ہے، دل کی مسلسل دھڑکنوں اور کوڑے کرکٹ کی میل کچیل نے اُسے مزید کالا کر دیا ہے اتنی گہری سیاہی کہ اُس کا ناک نقشہ بھی پہچاننا مشکل ہو گیا ہے۔ وہ جب بھی آتا جاتا ہے، مجھے احتراماً بلکہ خلافاً سلام کرتا ہے۔ جو مجھے اچھا نہیں لگتا۔ گزشتہ تیس برس کی آزاد قوم بھی اُس کے اندر سے نہ کمتری کم کر سکی نہ بہتری۔ وہ مجھے اس انداز میں سلام کرتا ہے جیسے میں اس ہسپتال کا مالک ہوں۔ خیراتی رام کی ایک جمعدارن بھی ہے۔ مگر وہ ظالم تو بڑے کرّوفر والی عورت ہے۔ مجھے ہمیشہ خیال آتا ہے کہ خیراتی رام کا دل اس کروفر سے بھی دھڑکتا ہو گا — اُس کا مرض در اصل، بظاہر کروفر مگر بباطن غلیظ تہذیب کے اندر چھپا ہوا ہے۔ جو کبھی کبھی جھاڑو دیتے ہوئے ذرا سا ایکسپوز ہو جاتا ہے۔

کچھ دن گزرے ہیں، میرے ایک ملاقاتی نے مجھے ماسٹر جی کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی۔ بھڑکانے کو اُس نے میرے ساتھ ہمدردی کی شکل میں پیش کیا اور کہا "فکر صاحب! اس ماسٹر کو ٹی۔ بی ہے۔ جس تھوک دان میں یہ تھوکتا ہے وہ آپ سے دو چار فٹ کے فاصلے پر پڑا ہے اور ٹی۔ بی کے جراثیم باقاعدگی سے آپ کے اندر جا رہے ہیں۔ آپ ڈاکٹر سے کہہ کر اُسے یہاں سے اُٹھوا دیجیے۔

میں نے جواب دیا "ہاں" میں نے تو کل ماسٹر جی سے آم کی ایک پھانک لے کر کھائی تھی۔"

ملاقاتی میری حماقت پر کافی جز بز ہوا اور ماتھے پر دو ہتڑ مار کر بولا "اُف! آپ تو خود ٹی۔ بی کو دعوت دے رہے ہیں۔ آپ نہیں جانتے۔ کہ راشٹر قوم کی امانت ہوتا ہے"

میں نے زہر خند کیا "قوم کی امانت

ٹی۔ بی کے جراثیم ہیں۔ اس لیے آپ بھی ذرا احتیاط کیجیے۔"

"کیسے؟"

"کیونکہ یہ جراثیم میرے اندر جا چکے ہیں اور ابھی ابھی آپ نے میرے جراثیم زدہ ہاتھ سے لے کر لیچیاں کھائی ہیں۔"

اُس کے بعد وہ ملاقاتی کبھی نہیں آیا۔ ورنہ وہ ہر روز میری صحت کے بلیٹن کی طرح چھینے کے لیے آجاتا تھا۔

میرے وارڈ کے چوتھے بیڈ پر ایک سردار جی بیمار پڑے ہیں۔ شاید ان کی سانس کی نالی میں کوئی نقص ہے۔ وہ ایک سرکاری محکمے میں ڈرائیور ہیں۔ وہ سرکار میں نوکری کرنے کے باوجود اتنے زیادہ شریف ہیں۔ کہ گذشتہ پچیس برس سے ڈرائیوری ہی کرتے چلے جا رہے ہیں حالانکہ سرکار میں بد دیانتیوں کی اتنی کھلی چھوٹ ہے کہ ایک ٹائیمسٹ کلرک تک وزیر اعظم کا پرسنل سیکریٹری بن جاتا ہے۔ سردار جی کے کئی ساتھی ڈرائیور بھی اتنی ترقی کر گئے۔ کہ انہوں نے اپنی پانچ پانچ ٹیکسیاں بنا لیں اور اب خود کوئی کام نہیں کرتے صرف عیش کرتے ہیں۔ پچیس برس تک شریف بنے رہنے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ جرأت مندانہ حماقت کی یا پختہ ایمان کی۔ اور سردار کلدیپ سنگھ کے پاس بفضل تعالیٰ دونوں چیزیں موجود ہیں۔

اور شاید انہیں دونوں چیزوں کے سہارے سردار جی نے عیش کا راستہ نہیں اپنایا نتیجے کے طور پر اپنے سانس کی نالی خراب کر بیٹھا وہ اکثر و بیشتر اپنے بیڈ پر بیٹھا جپ جی کا پاٹھ کرتا رہتا ہے۔ اُس کا عقیدہ ہے کہ جب تک سانس کی نالی میں کچھ سانس باقی ہیں وہ پاٹھ کرتا رہے گا۔ اُسے پاٹھ پر وشواش ہے، سانس پر نہیں۔

ایک دن ہسپتال کے اردلی نے اچانک آکر اُسے بتایا: "سردار جی! چلیے اپریشن روم تک۔ وہاں آپکا اپریشن ہوگا۔"

سردار کلدیپ سنگھ نے بڑے شانت مئی لہجے میں کہا: "میں جپ جی کا پاٹھ پورا کرلوں۔ جب اپریشن روم چلوں گا"

"مگر میاں اپریشن کا ٹائم مقرر ہے شیڈول کے مطابق باری آپ کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب آپکا انتظار کر رہے ہیں۔ وقت نکل گیا۔ تو اپریشن نہیں ہوگا۔"

"ہاں ہاں سن لیا۔ مگر میں پاٹھ پورا کیے بغیر نہیں چل سکتا۔"

ایک طرف عقیدہ تھا دوسری طرف شیڈول ٹائم تھا۔ دونوں آپس میں ٹکرا رہے تھے اور اردلی تڑپ پھڑک رہا تھا۔ کہ ڈاکٹر صاحب مجھے ہی ملزم ٹھہرائیں گے مجھے خطرہ پیدا ہوگیا۔ کہ اردلی کے اپنے سانس کی نالی خراب ہو جائے گی۔ میں نے کبھی سردار جی کی طرف دیکھا کتنا شانت مئی چہرہ تھا۔ کبھی اردلی کی طرف دیکھا۔ کتنا پریشان تھا۔ اردلی، میڈیکل سائنس کی مشین کا ایک پرزہ تھا۔ دوسری طرف دھارمک شردھا کا وشال ساگر تھا۔ شردھا جس کا کوئی شیڈول ٹائم نہیں ہوتا۔ مگر اس کے باوجود ایک طاقت تھی۔ جو ایک معمولی ڈرائیور کے قبضے میں تھی۔ میڈیکل سائنس لاکھ طاقتور سہی۔ مگر پاٹھ کے مقابلے پر ایک چیونٹی تھی۔ ایک طاقت مطمئن تھی، ایک ہانپ رہی تھی۔

شاید سردار کلدیپ سنگھ کو یقین تھا۔ کہ واہگورو کے ہاتھ سے ہی سانس کی نالی راہِ راست پر آجانے گی۔ اپریشن تو کاغذی کتابوں کی پیداوار ہے۔ مگر جپ جی میری روح کی پیداوار ہے۔ روح ہوگی تو سانس کی نالی چلے گی۔ روح اور کتاب کی طاقتیں بڑی شدت سے باہم ٹکرائیں۔ مگر بالآخر فتح روح کی ہوئی۔

جب اُنہوں نے پاٹھ ختم کرلیا۔ تو واہگورو کا نام لے کر اُٹھے اور سٹریچر پر لیٹ گئے۔ جب اپریشن روم سے واپس آئے۔ تو سنا ہے، رات کے ڈیڑھ بجے اُن کی طبیعت ایک دم بگڑ گئی۔ اُن کے لیے سانس لینا بے حد مشکل ہوگیا۔ شاید اپریشن ناکام ہوگیا تھا۔ ہسپتال میں اپریشن تو عام طور پر ناکام ہو جاتے ہیں مگر اس پر بُرا نہیں مانا جاتا۔ کیونکہ اپریشن سے پہلے مریض سے لکھوا لیا جاتا ہے۔ موت کی ذمے داری ہسپتال پر نہیں ہوگی۔ البتہ یہ ذمے داری آپ خدا پر ڈال سکتے ہیں۔

ڈاکٹر اور نرسیں بھاگے بھاگے آئے۔ آکسیجن گیس کی نالی اُن کی ناک میں ٹھونس دی گئی۔

کہتے ہیں اس وقت سردار کلدیپ سنگھ نے ایک نرس کو اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا: "وہ جپ جی مجھے اُٹھا کر دے دو۔ میں مرنے سے پہلے پاٹھ ضرور کرنا چاہتا ہوں۔ پاٹھ کرتے کرتے واہگورو کے پاس چلا جاؤں تو وہ میری روح کو قصور وار نہیں ٹھہرائیں گے۔"

مگر صبح جب آدھے آدمی کی آنکھ کھلی۔ تو میں نے دیکھا، سردار جی بالکل ٹھیک ٹھاک تھے اور بدستور جپ جی کا پاٹھ کرنے میں مصروف تھے۔ آکسیجن کی نالی الگ کردی گئی تھی۔ میں نے پوچھا "سردار جی! آکسیجن کی نالی کون لے گیا؟"

"واہگورو لے گئے۔ ایک ناک میں دو چیزیں نہیں رہ سکتی تھیں۔ یا واہگورو رہ سکتے تھے یا آکسیجن گیس کل رات واہگورو میرے کان میں کہہ گئے۔ اب تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

آدھے آدمی کا اعتقاد آکسیجن گیس پر سے متزلزل

ہوگیا۔ بے اختیار میرے حلق تک یہ فقرہ آیا منہ سے نکل سکا: "سردار جی! اگر میں آدھا آدمی، اپنے بے بس آدھے آدمی میں پانی کا انجکشن دوں۔ تو کیا اس کی حسیں بھی ناچنے گانے لگیں گی "

اور سردار جی نے بھی جیسے میری بات سنے بغیر کہا" اوئے بادشاہو! واہگورو کیا کچھ نہیں کرسکتا وہ تو زندگی کا بھنڈار ہے"

مگر ہائے! زندگی سے پہلے تو میرے اندر یقین کا بھنڈار چاہیے۔ میں نے اپنی بے یقینی کو چھپانے کے لیے گفتگو کا رخ موڑ دیا۔ اور کہا" سردار جی! جب آپ کا سانس کا سسٹم بالکل ٹھیک ہوجائے گا۔ تو کیا آپ پھر بھی ڈرائیوری کریں گے "

وہ بولے "کیا کریں بابو جی! ڈرائیوری نہیں کروں گا۔ تو بال بچے بھو کے مرجائیں گے۔ انہیں بھوکا مارنے کا پاپ کس کے سر لگے گا"

"میں نے کہا" بجا فرمایا۔ لیکن اسی ڈرائیوری جمع دیانتداری نے ہی تو آپ کے سانس کی نالی کو تہہ و بالا کر ڈالا۔۔ پھر آپ ۔۔۔؟

"واہگورو نے جو بھاگیہ میں لکھ دیا ہے وہ تو کرنا ہی پڑے گا"

اتنے میں میرے بیڈ کے پاس کانتا پرساد آگیا۔ کانتا پرساد، ہسپتال میں آنے سے پہلے ٹیلر ماسٹر تھا۔ ہسپتال میں آتے ہی افسانہ نگار بن گیا۔ ٹیلرنگ اور مسلسل فاقہ کشی سے اُس کے اعصابی نظام کے سارے پیچ ڈھیلے ہو گئے تھے۔ اُس پر کئی بار دل کے دورے پڑے۔ جس سے اُسے ایک فائدہ ہوا اور ایک نقصان۔ فائدہ یہ ہوا۔ کہ اُسے ٹیلرنگ سے نجات مل گئی۔ نقصان یہ ہوا۔ کہ اس کے اندر ایک آرٹسٹ جاگ پڑا اور افسانہ نگاری کرنے لگا۔ مگر اس کی بینائی بے حد کمزور ہوگئی تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں پہلا افسانہ نگار دیکھا۔ جو افسانہ لکھ تو لیتا ہے مگر اپنا لکھا ہوا افسانہ پڑھ نہیں سکتا۔ اس کی آنکھوں میں جتنی بینائی تھی۔ وہ پارٹ ٹائم بینائی تھی۔ وہ اس سے لکھ سکتا ہے، پڑھ نہیں سکتا۔

چنانچہ وہ میرے پاس آگیا "فکر صاحب! میرا یہ نیا افسانہ آپ مجھے پڑھ کر سنا دیں "

اور میں نے سوچا۔ میرا آدھا جسم سن ہوچکا ہے اس کی آدھی بینائی سُن ہو چکی ہے۔ وہ بھی میری طرح آدھا آدمی ہے۔ میری طرح آدھا جی رہا ہے۔ آدھا نہیں جی رہا ہے۔ دو آدھے آدمی ایک دوسرے سے مل کر پُورا آدمی بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔

میں نے اُس کا افسانہ پڑھ کر سنا دیا۔ پڑھتے پڑھتے میں بھی اُس آپ سے رو دیا۔ جس آپ سے اس نے افسانہ لکھا تھا۔ آدھا میں رویا! آدھا وہ رویا۔ اور اس طرح ایک پُورا آنسو بن کر ماحول کے رخسار پر گر پڑا۔ (سفر مسلسل ہے)

صحت و زندگی

کیا آپ جانتے ہیں؟

● زیادہ نمک کھانے سے جسم پر داغ، بینائی زور، خون خراب ہو جاتا ہے۔

● باسی غذا کھانے سے دردِ معدہ، بد ہضمی، ن کی خرابی اور بخار کا اندیشہ ہوتا ہے۔

● رات میں دودھ پی کر کم از کم ایک گھنٹہ بعد سونا چاہیے، ورنہ نزلہ، زکام، اور جگر خراب ہو جانے کا رضعف معدہ کا اندیشہ رہتا ہے۔

● دو تولہ چولائی کے پتوں کو کچل کر آدھ پاؤ نی میں جوش دیں۔ جب آدھا پانی باقی رہ جائے، یک ماشہ نمک ملا کر صبح و شام پینا دردِ قولنج میں فید ہے۔

● چولائی کے دو تولہ پتوں کو کچل کر آدھ پاؤ نی میں رگڑ کر چھان کر صبح، دوپہر شام کو پینے سے تھری دُور ہو جاتی ہے، جگر، مثانہ، گردے کی تھری میں یکساں فائدہ بخش ہے۔ اسی طرح یگِ گردہ اور ریگ مثانہ بھی دُور ہو جاتی ہے۔

● ادھیڑ عمر میں جوانی کا احساس پیدا کرنے کے لیے پروٹین کو ہرگز نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔

● اطبا اور ڈاکٹروں کی رائے میں چاولوں ی پیچ زود ہضم، ملیّن، اشتہا آور اور دافع صفرا ہے۔

● دانتوں کے امراض خصوصاً پائیوریا میں سنترہ بے حد مفید ہے۔

● مرضِ سکروی میں جس میں مسوڑھے متورم ہوتے ہیں، سنترے کا استعمال بے حد فائدہ بخش ہے۔

● گاجر معدے کی تیزابیت کا بہترین دافع ہے۔ گاجر قبض رفع کرتی ہے، پیشاب آور ہے۔

● دل کی دھڑکن اور اختلاج کی شکایتوں میں بے حد مفید ہے۔ معدہ کو طاقت بخشتی ہے۔

● دودھ، مغزیات، ناریل، انڈے کی زردی، دودھ، لوبیا، مٹر، گیہوں، سیب، بادام، اخروٹ، جو، چنے، شلغم، مولی، گاجر، کھیرا، گوبھی، پالک، انجیر، مچھلی اور پرندوں کے گوشت میں فاسفورس کی وافر مقدار ہوتی ہے۔

● ایامِ زچگی میں جب جسم سے زیادہ خون خارج ہو گیا ہو، انگور کا رس آبِ حیات کا کام کرتا ہے۔

● دہی کے استعمال سے تندرستی ہی قائم نہیں رہتی، بہت سی بیماریوں سے نجات مل جاتی ہے، عمر میں اضافہ ہوتا ہے۔

● جو شخص سونے کے وقت کچھ بادام کھا لیتا ہے وہ بہت سے امراض سے محفوظ رہتا ہے۔

● خشک دھنیا کوٹ کر اس کے چاول الگ کر لیں۔ اُن چاولوں کو پیس کر باریک آٹے کی طرح بنا لیں۔ گرمی کی وجہ سے پیدا ہوئی خشک کھانسی میں ڈیڑھ ماشہ یہ سفوف چھ ماشہ شہد میں ملا کر چاٹنے سے کھانسی دُور ہو جاتی ہے۔

● دل کے مریضوں کے لیے زیادہ ثقیل، قابض اور مقوّی غذاؤں سے پرہیز ضروری ہے۔ دل کے مریضوں کے لیے موٹاپا بہت خطرناک ہے۔ اُن کا وزن زیادہ ہو تو انھیں اپنا وزن کم کرنا چاہیے۔

● غذائی اعتبار سے ایک پونڈ بینہ تقریباً ایک گیلن دودھ کے برابر ہوتا ہے۔

● چکوترا جسم کو غذائیت دیتا اور طاقت بخشتا ہے۔ مفرح ہے۔ صفراوی مزاج والوں کو زیادہ فائدہ بخش ہے۔

● ایک سرکردہ ڈاکٹر نے لکھا ہے۔ اگر دنیا کے سارے لوگ روزانہ غسل کریں، روزانہ کم سے کم چھ گلاس پانی پئیں اور صحیح طریقہ سے سانس لیں تو دنیا کے آدھے ڈاکٹروں کو معالجاتی کام ترک کرنا پڑے گا۔

قدرت کی گرانقدر دین

مکھن قدرت کی گرانقدر دین ہے۔ گھی کی نسبت مکھن زیادہ مقوّی اور مفید ہے۔ ہر طرح کی گرمی، خشکی اور کمزوری کو دُور کرتا ہے۔ دل و دماغ کو طاقت بخشتا ہے۔ آنکھوں کو طراوت دیتا، مادۂ تولید کو بڑھاتا اور بدن کو فربہ کرتا ہے۔ بوڑھے، جوان اور بچے، ہر عمر والوں کے لیے یکساں فائدہ

بخش ہے۔

مکھن ضعفِ دماغ میں بہت نافع ہے۔ مغز بادام کے ساتھ کھانے سے بینائی تیز ہوتی ہے۔

بینائی کے لیے اکسیر

بادام قدرت کا گرانقدر عطیہ ہے۔ دماغ کی کمزوری اور آنکھوں کی بینائی کے لیے اکسیر ہے۔

مسلسل بادام کھانے سے جسم فربہ ہوتا ہے۔ اعضائے رئیسہ کو طاقت و تقویت بخشتا ہے۔ جسمانی طاقت میں اضافہ کرتا ہے۔

روزانہ صبح مغز بادام کا چھلکا اتار کر کشمش کے ساتھ کھانے سے جسم کو حیرت انگیز توانائیت حاصل ہوتی ہے۔ مغز بادام باریک پیس کر دودھ میں اُبال لینے کے بعد شہد میں ملا کر پینے سے جسم کو مقوی ترین غذا ملتی ہے۔

موسم سرما میں صبح کی سیر یا ہلکی ورزش کے بعد دس بادام ایک چھٹانک مکھن میں مصری ملا کر خوب چبا چبا کر کھانا صحت و طاقت حاصل کرنے کے لیے بے حد فائدہ بخش ہے۔ رات دس عدد مغز بادام پانی میں بھگو کر صبح چھلکا اتار کر دس عدد منقہ، پانچ عدد سیاہ مرچ، بڑی الائچی کے چند دانے سل پہ باریک پیس کر تھوڑی مصری ملا کر مٹھائی کی طرح کھانا دل، دماغ، جگر اور آنکھوں کی بینائی کے لیے اکسیر ہے۔

روغن بادام دودھ میں ملا کر پینے سے بینائی تیز ہوتی ہے۔ دائمی قبض دور کرنے کے لیے مفید ہے۔

مغز بادام دس عدد، تخم کاہو دس عدد کو خوب پیس کر مصری سے میٹھا کر کے پینے سے دل اور دماغ کو قوت حاصل ہوتی ہے، بینائی تیز ہوتی ہے۔ دائمی دردِ سر سے نجات مل جاتی ہے۔

ہر بیماری کی دوا

اسپین کی ایک کہاوت ہے ——

"زیتون کا تیل ہر بیماری کی دوا ہے۔" زیتون کا تیل آنکھوں میں لگانے سے بصارت تیز ہوتی ہے۔ آنکھوں سے پانی بہتا ہو تو بند ہو جاتا ہے۔ ہمیشہ آنکھوں میں لگاتے رہیں تو موتیا بند کو تحلیل کر دیتا ہے اور آپریشن کی ضرورت نہیں پیش آتی۔ آنکھوں کے دھند جالے اور پھُنسی کو دفع کرتا ہے۔

زیتون کا تیل ریاح خارج کرتا ہے،

زیتون کا تیل کھانا مرگی اور بواسیر میں نافع ہے۔ یہ بہترین قبض کشا ہے۔ زیتون کے تیل کی مالش عرق النساء اور گنٹھیا میں فائدہ بخش ہے۔ کمزور لاغر بچوں کے لیے اس کی مالش اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔

دانتوں پر زیتون کا تیل ملنے سے ماؤف مسوڑھے اور ہلتے ہوئے دانت مضبوط ہو جاتے ہیں۔

ایک ارزاں لیکن گراں قدر غذا

تل ارزاں لیکن گراں قدر غذا ہے۔

تل عورت، مرد، چھوٹے، بڑے سب کی درازیٔ عمر اور صحت مند زندگی کے لیے مفید ہے۔ اس کا اثر جسم کے بوسیدہ خلیوں کی تعمیر میں بہت حیرت انگیز ہے۔ جو لوگ درازیٔ عمر کے خواہشمند ہیں اُن کے لیے تل گرانقدر غذا ہے۔ تل میں قابلِ جذب معدنی نمک —— میگنیشیم، کیلشیم، فولاد، ایلومونیم، تانبہ، نکل، سوڈیم اور دوسرے معدنی اجزاء موجود ہیں۔

تیل دماغ کے لیے خصوصیت سے مفید ہے۔ یہ سرطان، سل و دق اور خون کی کمی جیسے عوارض کو دور کرنے کے لیے اکسیر ہے۔

بھنڈی

بھنڈی لذیذ سبزی ہونے کے ساتھ بے حد مفید بھی ہے۔ جسم میں طاقت پیدا کرتی ہے۔ قوتِ باہ بڑھاتی ہے۔ سنگِ گردہ و مثانہ میں نافع ہے۔ پیچش کے مریضوں کو بھنڈی کا لعاب نکال کر، اس میں شربت انجبار ملا کر استعمال کرانے سے فوری فائدہ ہوتا ہے۔ بھنڈی کے جوشاندہ میں انگور کا سرکہ ملا کر غرارے کرنے سے دانتوں کا درد رفع ہوتا ہے۔

ورموں اور پھوڑے کو پکانے کے لیے بھنڈی کا خشک گودہ کوٹ کر بطور پلٹس گرم گرم باندھنے سے ورم تحلیل ہو جاتا ہے۔ پھوڑے پک کر پھوٹ جاتے ہیں۔

بھنڈی ہاضمہ اور معدے کے لیے نقصان دہ ہے۔ دودھ پلانے والی ماؤں کو بھنڈی نہ کھانی چاہیے۔ دودھ یا لسی پینے کے فوراً بعد بھنڈی نہ کھانی چاہیے۔

لہسن

بھارت کی قدیم کتابوں میں لہسن کو اکسیر کہا گیا ہے۔ بچوں، بوڑھوں اور سرد مزاجوں کے لیے لہسن کا استعمال اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ لہسن کھانے سے بڑھاپا جوانی میں بدل جاتا ہے۔ نیا خون پیدا ہوتا ہے۔ خون میں سرخی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے استعمال سے موتیا بند کا پانی بند ہو جاتا ہے۔ لہسن کم نظری کا مجرب علاج ہے۔ نقرہ گنٹھیا اور فالج میں اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ یہ مقوی معدہ، مقوی باہ، مقوی بدن، اور مقوی دماغ ہے۔ بدہضمی۔ بلغمی کھانسی۔ بادی بواسیر، باؤ گولہ، اور پیٹ کے کیڑوں کو دور کرنے کے لیے بے حد مفید ہے۔

لہسن دق کے مریضوں کے لیے بے خطا دوا ہے۔ اس کے استعمال کا طریقہ یہ ہے کہ

لہسن کو پانی میں پیس کر چھان لیجیے اور اُس چھنے ہوئے عرق کو شیشی میں محفوظ رکھ لیجیے۔ یہ پانی ۶ ماشہ کی مقدار میں غذا کے درمیان دق کے مریض کو پلا دینے۔ یہ دق کے مرض کا حکمی علاج ہے۔

تپ دق میں لہسن کے چار پانچ جوے کاٹ کر شہد یا گلقند کے ساتھ استعمال کرنا فائدہ بخش ہے۔

لہسن گرم مزاج والوں کے لیئے مضر ہے۔ اس کی تاثیر گرم خشک ہے۔ اپنے جسم کی طاقت اور طبیعت نیز موسم کو دیکھتے ہوئے ۶ ماشہ سے ۲ تولہ تک روزانہ استعمال کیا جاسکتا ہے۔

غلط رویّہ

مشہور دانشور کے نولسن نے لکھا ہے — بہت سے ادیب و فنکار ایسے ہیں جو لوگوں کی نکتہ چینی اور اخبارات و رسائل کے تلخ تبصروں کو برداشت نہیں کرتے۔ یہ غلط رویّہ ہے۔ کوئی آپ کی خامیوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرائے تو آپ کو چاہیئے کہ ٹھنڈے دل سے اُن پر غور کریں اور انھیں اپنی تحریروں سے دُور کرنے کی کوشش کریں۔ یہ عمل آپ کے حق میں سودمند ثابت ہوگا۔

کچھ ادیب ایسے بھی ہوتے ہیں جو اخبارات و رسائل میں اچھے تبصرے کے ساتھ بُرے تبصرے کو بھی شہرت کا باعث سمجھتے ہیں۔

رزمگاہِ حیات میں

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے۔

" اگر رزمگاہِ حیات میں کامیاب و کامراں ہونا چاہتے ہو تو نامساعد حالات سے کبھی بددل نہ ہو۔ حوصلہ نہ ہارو۔" ایک دوسرے دانشور نے لکھا ہے — " زندگی کے ہر شعبے میں وہی لوگ کامیاب و کامراں ہوتے ہیں جنھوں نے کبھی ہمت نہیں ہاری۔ زندگی کے کلبھنے میں مُردہ کھوپڑیوں کو دیکھ کر خوف زدہ نہ ہوئے۔ اُن کی ہمّت، اُن کے حوصلے کو کوئی پسپانہ کرسکا۔"

●●

سرگوشیاں

اس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، طبی، ادبی سوالات کے جوابات دیے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شاملِ اشاعت نہیں کیے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھیے۔ ہر سوال کے بعد جواب کے لیے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھیے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ——— (ایڈیٹر بیسویں صدی، نئی دہلی)

یاسمین نوشاد۔ پٹنہ

س۔ اگر سسرال والے فراخ دل نہ ہوں تو لڑکی کو ان کے ساتھ کیسے رہنا چاہیے؟

ج۔ حالات سے سمجھوتہ کرکے۔ خود فراخ دل بن کر۔

ریاض احمد انصاری۔ ٹکیا پارہ

س۔ کیا دنیا کی حسین ترین شے عورت ہے؟

ج۔ جی ہاں، علامہ اقبال نے فرمایا ہے ؎
"وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ"

سید جاوید اسلام۔ مدھوبنی

س۔ انسان اپنے نفس پر قابو پالے تو؟

ج۔ یہ اس کی سب سے بڑی فتح ہوگی۔

س۔ بیسویں صدی میں انسان چاند تک جا پہنچا۔ بائیسویں صدی تک ستاروں تک نہیں پہنچ سکتا؟

ج۔ انسان کی تگ و تاز سے یہ کچھ بعید نہیں ؎
تگ و تازِ آدمی ہے یہ ضوفشاں سے آگے

سید شاہجہاں اعظمی۔ نوادہ

س۔ کیا منزل کی طلب انسان کو دیوانہ بنا دیتی ہے؟

ج۔ کبھی دیوانہ بنا دیتی ہے، کبھی فرزانہ ——

نواب ایس جاوید۔ گملا

س۔ انسان کی بربادی مجبوری ہے یا کمزوری؟

ج۔ ایسی کمزوری جو انسان کو مجبور کر دیتی ہے

س۔ کیا ہندوستان کے مسلمان سب سے زیادہ غریب ہیں؟

ج۔ ایسا تو نہیں ہے۔ ہندوستان میں بہت سے غیر مسلم بھی غریب ہیں اور بہت سے مسلمان بھی امیر ہیں۔

کلام احمد آرزو۔ ہزاری باغ

س۔ رحمٰن بھیا، کچھ دین کی باتیں بتائیے۔

ج۔ حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:۔

- مومن اپنی خوش خلقی کے ذریعہ رات کو عبادت کرنے والے اور دن کو روزہ رکھنے والے شخص کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔
- نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔
- جو چیز لوگوں کو جنت میں داخل کرے گی وہ اللہ سے ڈرنا اور خوش خلقی ہے۔

اختر خالق۔ بارہ مولا (کشمیر)

س۔ مرجھائے ہوئے پھول اور ٹھکرائے ہوئے انسان میں کیا فرق ہے؟

ج۔ مرجھایا ہوا پھول پھر شاداب نہیں ہو سکتا۔ ٹھکرایا ہوا انسان حوصلہ کا دامن نہ چھوڑے تو پھر بلند مقام حاصل کر سکتا ہے۔

اسد قریشی۔ ورنگل

س۔ کچھ حیات افروز اشعار سنائیے...؟

ج۔
- چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے
- یہ کہہ کے دل نے مرے حوصلے بڑھائے ہیں
غموں کی دھوپ کے آگے خوشی کے سائے ہیں
- جسے ہوائے زمانہ کبھی بجھا نہ سکے
قدم قدم پہ وہ اک شمعِ راہ پیدا کر

خورشید عالم۔ ارریہ کوٹ

س۔ خود غرض دوست کی پہچان کیا ہے؟

ج۔ خود غرض برے وقت میں دوست کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔

عرفان احمد فراز۔ مدھوپور

س۔ محبت کی زبان کیا ہے؟

ج۔ آنکھیں!

جعفر بن موسیٰ صلالہ (سلطنت عمان)

س۔ انسان کی عادت اسے اپنے ماں باپ کے خون سے ملتی ہے یا وہ اس عادت کو دنیا میں آکر اپناتا ہے؟

ج۔ انسان کو ماں باپ کے خون سے اچھی یا بری عادت نہیں ملتی۔ ماحول اور صحبت سے انسان اچھی یا بری عادت اپناتا ہے۔

جے یسی مدھا۔ اجین

س۔ کیا اردو زبان کی ترقی کے لیے ہندوستان میں ایسے کچھ سنٹرز ہیں۔ جہاں پر قابلِ اشاعت افسانوں اور غزلوں کے بارے میں ٹریننگ دی جاتی ہو۔

ج۔ ایسا کوئی سنٹر نہیں۔ آپ جاننے والے فنکاروں سے استفادہ کر کے یہ مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد علی۔ حیدرآباد

س۔ دولت۔ عزت۔ شہرت ان تینوں میں افضل کون ہے۔

ج۔ کبھی دولت و شہرت پر عزت کو افضلیت حاصل تھی۔ لیکن اس دور میں دولت سب کچھ ہے۔

نورالدین شمسی مرادآباد۔

س۔ مرنے والوں کو لوگ اتنی جلدی کیوں بھول جاتے ہیں۔

ج۔ انسان فطرتاً فراموش کار ہے۔

عبدالقیوم خاں۔ الجبیر (سعودی عرب)

س۔ بیسویں صدی (اپریل ۷۸) میں ایک سوال کے جواب میں درج ہے کہ رئیس احمد جعفری بفضلِ خدا حیات ہیں جبکہ میری ناقص معلومات کے مطابق کئی سال ہوئے ان کا انتقال ہو چکا ہے کیا یہ صحیح ہے؟

ج۔ کتابت کی غلطی سے ایسا ہوا جس کے لیے ادارہ معذرت خواہ ہے دراصل یہ سوال مشہور شاعر رئیس امروہوی کیلیے تھا۔ رئیس احمد جعفری کا انتقال کئی سال پہلے ہو چکا ہے۔

پرنٹر پبلشر آر۔ نیّر نے پربھات آفسیٹ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر بیسویں صدی پبلیکیشنز پرائیویٹ لمیٹیڈ ۲۵۸۳ نیتاجی سبھاش مارگ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا

42ND YEAR OF PUBLICATION. Rs. 3.00 MAY 78
TELEPHONE 271637, 275927, 272059, 270529 Res. : 292070
MEMBER : ABC — IENS — AINEC

۱۹۷۸ء کی اردو تاریخ میں

ایک نیا ادبی اضافہ

اردو ڈائجسٹ

گلفشاں

سلامت علی مہدی کی ادارت

اور

رحمٰن نیّر کے انتظام میں

گلفشاں اردو ڈائجسٹ ہر اعتبار سے ایک مکمل اردو ڈائجسٹ ثابت ہوگا کیونکہ اس میں ہندوستان میں چھپنے والی تمام اردو ڈائجسٹوں سے زیادہ صفحات، زیادہ مضامین، زیادہ تصاویر، زیادہ موضوعات اور زیادہ دلچسپیاں ہوں گی۔

ضخامت: ——— تقریباً ڈھائی سو صفحات

طباعت: ——— فوٹو آفسٹ ——— سرورق انتہائی دیدہ زیب

اور قیمت ——— صرف: **۵/ روپے**

گلفشاں اردو ڈائجسٹ کو دنیا کی کسی بھی زبان کی مشہور ڈائجسٹ کے مقابلہ پر رکھا جاسکتا ہے

ایجنٹ حضرات اپنے آرڈر فوراً بھیج دیں۔

منیجر: گلفشاں اردو ڈائجسٹ پوسٹ بکس 7013 دریا گنج نئی دہلی ۲۔



— تینتیس روپے

۵ پونڈ

بس ۱۳۰۱۷، دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲



ینیجر: گلفشاں

موسس
خوشتر گرامی

ایڈیٹر
رحمٰن نیر

جون
۱۹۷۸ء

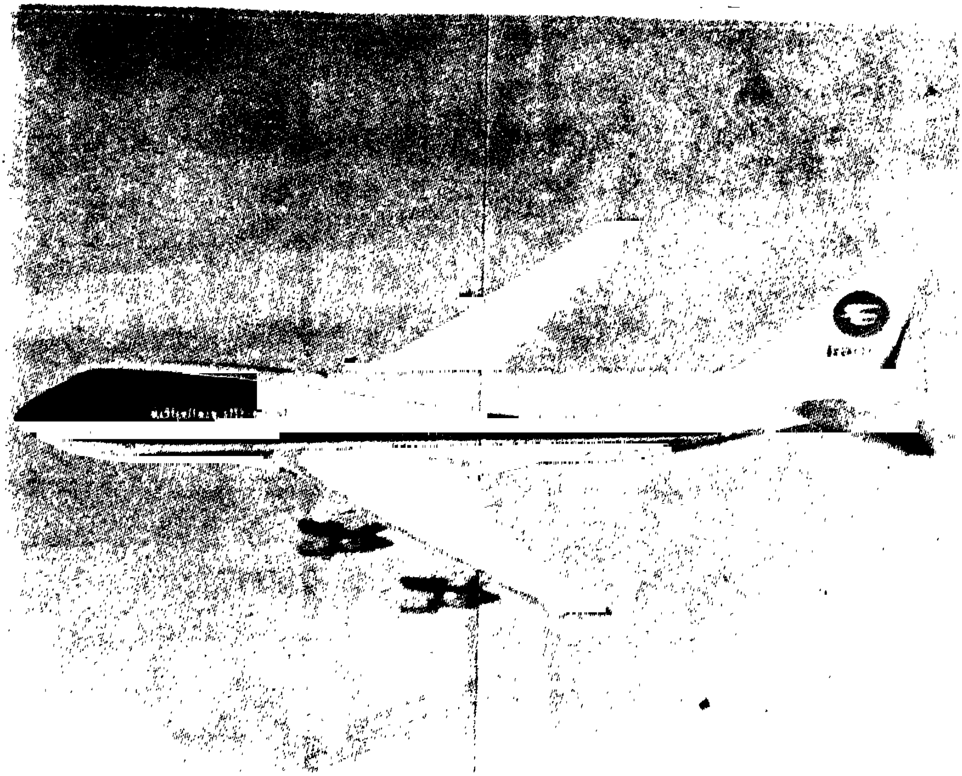
فون آفس: ۲۷۱۶۳۷، ۲۷۵۹۲۷، ۲۷۲۰۵۹، ۲۷۰۵۲۹، رہائش: ۲۰۲۰۷۰

جلد ——— ۴۲ شمارہ ——— ۶
قیمت ——— تین روپے

سالانہ قیمت مع خاص نمبر ہندوستان میں ——— تینتیس روپے
غیر ممالک میں ہوائی ڈاک سے ——— چھ پونڈ
خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ: بیسویں صدی پوسٹ بکس ۱۳۱۰۷، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

الخطوط الجوية العراقية
iraqi airways

عظیم لوگوں کے لئے عراق ایرویز
شاندار پرواز



آرام دہ اور محفوظ عالمی سفر کے لیے عراق ایرویز سے پرواز کیجئے

iraqi airways

General Sales Agents :

ALL INDIA TRAVEL SERVICES

Delhi Cargo : 4-N, Janpath, New Delhi-110001
Phone : 45396, 44131

Passenger Office : 101, Ansal Bhawan, K. Gandhi Marg
New Delhi-110001 Phone : 387532/33

Bombay : Mayfair, Veer Nariman Road, Bombay-400020
Phone : 293361, 293861

Madras, Jullundur City, Chandi Garh

تیرونشتر

"ہندوستان ایمرجنسی کے بحران سے نکل کر عام بے چینی کے بحران میں داخل ہو گیا ہے"۔ مسٹر جگجیون رام ———
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

"چیف منسٹر تامل ناڈو مسٹر ایم۔ جی۔ رامچندرن دوبارہ فلموں میں کام کریں گے"۔ ایک خبر ——— اس لیے کہ سیاست کی اداکاری اُنھیں بہت مہنگی پڑ رہی ہے۔

"بہار میں آتشزنی۔ حیدر آباد میں فائرنگ۔ پنت نگر میں فائرنگ، امرتسر میں فائرنگ۔ فتح پور میں فائرنگ۔ سنبھل میں فساد" ———
ایک ہفتہ کے اخباروں کی سُرخیاں ——— اب تو اخبار پڑھنے میں سچ مچ مزہ آنے لگا ہے۔

"دلی میں دن دھاڑے ایک بینک کو لوٹ لیا گیا" ———
ایک خبر ——— اور پولیس دن دھاڑے سوتی رہی۔

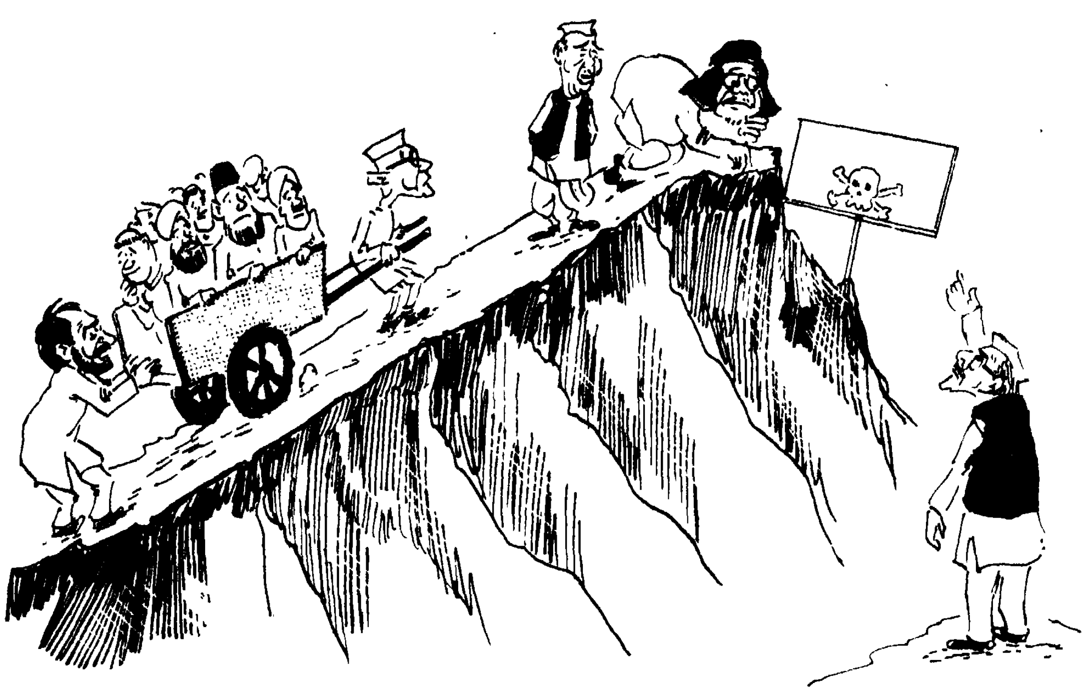
"جنتا پارٹی کے حالات کو ٹھیک کیا جائے گا"۔ ایک خبر ———
لیکن راج نارائن جی کی حالت کو کون ٹھیک کرے گا۔

"حکومت کھیلوں کے معیار کو بہتر بنانے کی کوشش کرے گی"۔ اسٹیٹ منسٹر برائے تعلیم مسٹر دھنا سنگھ گلشن ——— یہ بیان یوں دیا گیا ہے جیسے کھیلوں کے معیار کو بلند کرنا حکومت کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

"حکومت بڑی صنعتوں کو نظر انداز کر رہی ہے"۔ مسز اندرا گاندھی
——— لیکن وہ بڑے صنعت کاروں کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔



"حکومت بڑی صنعتوں کو نظر انداز کر رہی ہے"۔ مسز اندرا گا:



"جنتا پارٹی جمہوریت کو خطرناک راستے پر لے جا رہی ہے" ——— مسٹر گلزاری لال نندہ

"دہلی میں بس سروس کو بہتر بنایا جائے گا" ایک خبر ——— یہ اور بات ہے کہ اس وعدے کو پورا کرنے کے لیے کم از کم پچیس برس ؤ لگ ہی جائیں گے۔

"جنتا پارٹی جمہوریت کو خطرناک راستے پر پہنچا رہی ہے" ——— مسٹر گلزاری لال نندہ ——— قصور ہماری جمہوریت کا ہے کہ وہ ہر راستے پر نکل کھڑی ہوتی ہے۔

"اسرائیل کو امریکہ کی مسلسل فوجی امداد پر اردن کے شاہ حسین کی تنقید" ایک خبر ——— نقار خانے میں بھلا طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔

"ایمرجنسی کے بعد اسمگلنگ میں اضافہ نہیں ہوا ہے"۔ وزیر فینانس مسٹر ستیش اگروال ——— اضافہ تو صرف چوری، ڈکیتی، قتل و غارتگری اور گرانی میں ہوا ہے۔

"جنتا پارٹی کی ایک سالہ کارکردگی مایوس کن ہے" ——— سردار سورن سنگھ ——— لیکن کانگریس پارٹی کی ایک سالہ کارکردگی بھی کچھ کم مایوس کن نہیں رہی ہے۔ ؎

تو مرے حالِ پریشاں پہ بہت طنز نہ کر
اپنے گیسو بھی ذرا دیکھ کہاں تک پہنچے

"جنتا پارٹی کی ایک سالہ کارکردگی اطمینان بخش رہی ہے"۔ صدر جنتا پارٹی مسٹر چندر شیکھر ——— لیکن اب لوگ ایسے اطمینان بخش بیانوں سے مطمئن نہیں ہوتے۔

"ہندوستان کو فلم سازی میں دنیا بھر میں پہلا مقام حاصل ہے"۔ ایک خبر ——— تیسرے درجے کی فلموں کے ذریعہ فلم سازی میں دنیا بھر میں پہلا مقام حاصل کرنا بھی ایک کمال ہے۔

"ہریجنوں کے مسائل" ایک عنوان ——— کوئی بھی حل نہیں کرے گا

"حیدرآباد کے پُرتشدد واقعات کے پیچھے نکسلائیٹس کا ہاتھ تھا"۔
یک خبر ——— اور ٹانگ کس کی تھی؟

"جنتا پارٹی کے لیڈروں میں کوئی اختلافات نہیں ہیں" ———
سٹر چندر شیکھر ——— لیکن اس بیان کا مطلب یہ نہ لیا جائے کہ
ن میں اتحاد موجود ہے۔

"اسرائیل اور امریکہ کے درمیان اختلافات کی خبریں مضحکہ خیز ہیں"۔
یک خبر ——— لیکن ایسی مضحکہ خیز خبروں کے ذریعہ ہی تو عربوں کو بیوقوف
بنایا جا سکتا ہے۔

"ترقی پسند عناصر ملک کی خدمت کے لیے آگے آئیں"۔ ایک اپیل
——— ان کو پیچھے جانے کے لیے کس نے کہا تھا۔

"ہریجنوں پر کئی صدیوں سے ظلم کیا جاتا رہا ہے"۔ ایک عنوان۔

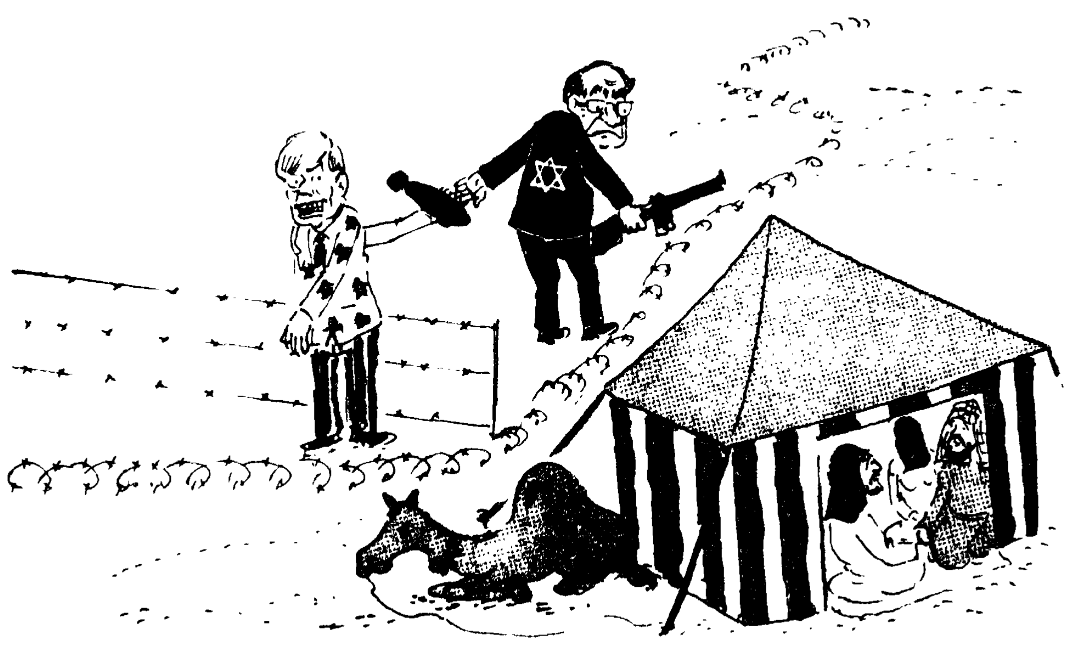
——— اور آگے بھی یہ سلسلہ جاری رکھا جائے گا۔

"ریاستوں کو زائد اختیارات دیے جائیں"۔ ایک عنوان ———
تاکہ وہ اُن کا کم سے کم استعمال کر سکیں۔

"کانگریسی کارکن جلد بازی سے کام نہ لیں"۔ سردار سورن سنگھ
——— بلکہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔

"عام آدمی کی تکلیفوں کو سب سے پہلے دور کیا جائے"۔ ———
ایک بیان ——— یہ اُسی وقت ممکن ہے جب آپ عام آدمی کو ہی ہمیشہ
ہمیشہ کے لیے دور کر دیں۔

"بہار کی ساری یونیورسٹیوں کو بند کر دیا گیا"۔ ایک خبر ———
نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔



"اسرائیل اور امریکہ کے درمیان اختلافات کی خبریں مضحکہ خیز ہیں"۔



"ہمیں اندرا کانگریس اور جنتا پارٹی دونوں سے لڑنا ہے" ــــ وائی۔بی۔چوان

"ہمیں اندرا کانگریس اور جنتا پارٹی دونوں سے لڑنا ہے" ــــ مسٹر وائی۔بی چوان ــــ اس بیان پر نہ جانے کیوں میاں خوجی کی یاد آگئی۔

"عوام کو موجودہ سرکار پر اعتماد نہیں رہا"۔ مسز اندرا گاندھی ــــ وہ سرکار ہی کیا جس پر عوام کو اعتماد ہو۔

"عوام اور طلبا احتجاجی مظاہروں سے پرہیز کریں"۔ ایک اپیل ــــ پھر تو زندگی میں لطف ہی کیا باقی رہ جائے گا۔

"قلب پر حملے کی صورت میں شراب کا استعمال فائدہ مند ہے"۔ ایک خبر ــــ گویا اب "پیشاب" کے علاوہ "شراب" میں بھی طبی فائدے ڈھونڈے جا رہے ہیں۔

"ایک بے روزگار نوجوان نے خودکشی کر لی"۔ ایک خبر ــــ چلیے بے روزگاری کا مسئلہ کچھ تو حل ہوا۔

"ہندی اور نشہ بندی کو عوام پر زبردستی مسلط نہ کیا جائے"۔ جنرل کری آپا ــــ اس کے لیے "نس بندی" کی مثال کو سامنے رکھا جائے۔

"دہلی میں ایک دن میں قتل کی چھ وارداتیں ہوئیں"۔ ایک خبر ــــ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حالات اب معمول پر آرہے ہیں۔

"جمہوریت دشمن طاقتیں پھر سر اُٹھا رہی ہیں"۔ مسٹر ہیگڑے۔ ــــ اور حکومت اپنا سر پکڑے بیٹھی ہے۔

"اُتر پردیش اُردو اکیڈیمی کے انعامات کا اعلان ہو گیا"۔ ایک خبر ــــ یوں کہیے کہ اُتر پردیش اُردو اکیڈیمی کے انعامات کا "جلوس" نکل گیا۔

"جنتا پارٹی کی مقبولیت میں کمی ہوتی جا رہی ہے"۔ ایک عنوان ــــ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔

"اُردو نے ملک کو انقلاب زندہ باد کا نعرہ دیا ہے۔" ایک عنوان
——— لیکن اب ملک کو انقلاب کی ضرورت ہے نہ اُردو کی۔

"تعلیم کے لیے مادری زبان کو ہی ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔" ———
ٹرمرارجی ڈیسائی ——— کاش کہ اُردو بھی کسی کی مادری زبان ہوتی اور
سے بھی ذریعۂ تعلیم بنایا جاسکتا۔

"ہندوستانی نوجوانوں کے مسائل پر سیمینار ہوگا۔" ایک عنوان
——— اور اس کے بعد سیمینار ختم ہوجائے گا اور نوجوانوں کے
سائل باقی رہ جائیں گے۔

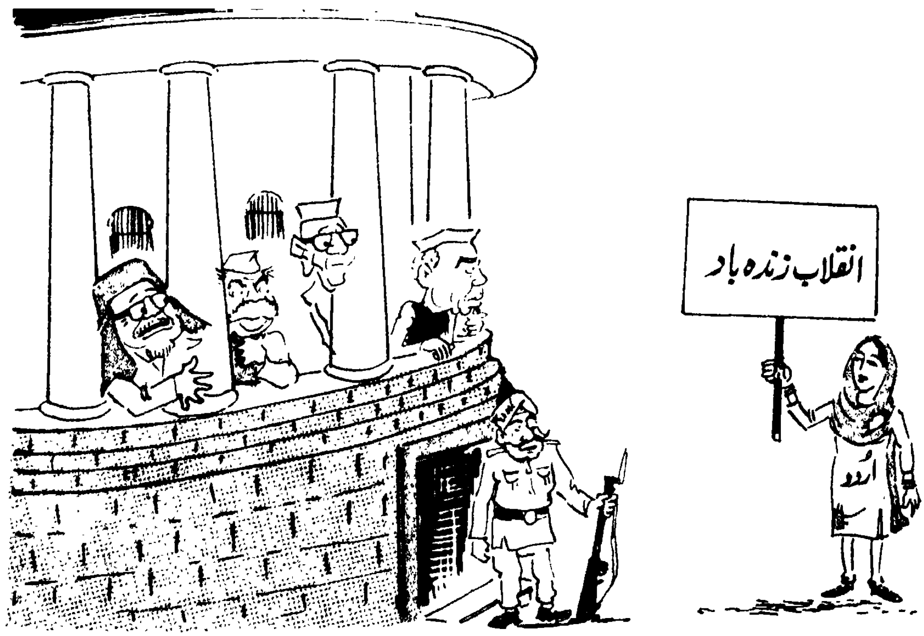
"جنتا پارٹی کے ارکان کھلے عام ایک دوسرے پر تنقید نہ کریں۔"
ٹرمرارجی ڈیسائی ——— اس طرح لوگوں کو جنتا پارٹی کی اصلیت
پتہ چل جاتا ہے۔

"حکومتِ اُتر پردیش اُردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا
کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔" ایک خبر ——— ہمیں اس نیک نیتی کا
بہت پہلے سے علم ہے۔

"مہاراشٹرا میں سیمنٹ کے چار کارخانے کھولے جائیں گے۔"
ایک خبر ——— مگر افسوس کہ اس سیمنٹ سے دونوں کانگریس پارٹیوں
کے تعلقات میں مضبوطی پیدا نہیں کی جاسکتی۔

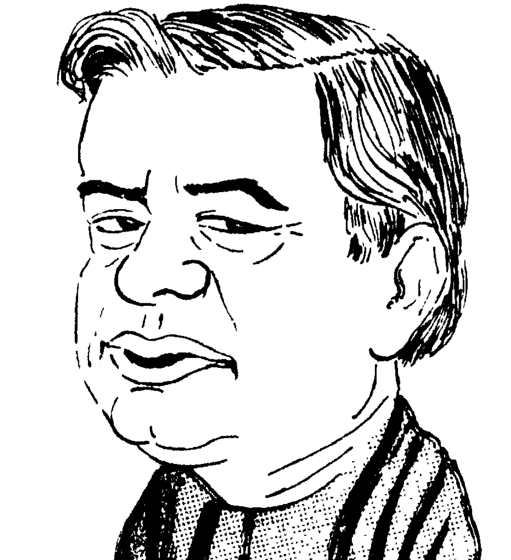
"دہلی میں بجلی کی سربراہی کے انتظام کو بہتر بنایا جائے گا۔"
ایک خبر ——— یہ اور بات ہے کہ جب ہم یہ خبر پڑھ رہے تھے تو ٹھیک
اُسی وقت بجلی فیل ہوگئی تھی۔

"یونیورسٹیوں میں تشدد کے واقعات۔" ایک عنوان ———
نصاب میں شامل ہوگئے ہیں۔



"اُردو نے ملک کو انقلاب زندہ باد کا نعرہ دیا ہے۔"

شری اٹل بہاری باجپائی



آواز ـــــــ یقین اور اعتماد کے سانچے میں ڈھلی ہوئی۔
گفتار ـــــــ سوچ اور فکر کی میزان میں تلی ہوئی۔
نگاہ ـــــــ زندگی کے نئے افق کو تلاش کرتی ہوئی۔
چہرے پر عزم و عمل کے جذبات کی کارفرمائی ـــــــ یہ ہیں ہمارے وزیرِ خارجہ ـــــــ

شری اٹل بہاری باجپائی

عزمِ محکم کے پیکر اور پہلودار شخصیت کے مالک اس انسان کو قریبی دوست "اٹل جی" کہتے ہیں ـــــ اور یہ نام ان کے کردار کی علامت بن گیا ہے۔
اٹل جی ـــــ ایک جوشیلے کوی، اٹل جی ـــــ ایک دھواں دھار مقرر، اٹل جی ـــــ ایک ماہر سیاست داں۔

شری اٹل بہاری باجپائی ہندوستان کے سیاسی افق پر اس وقت ابھرے جب مطلع گرد آلود تھا۔ شریمتی اندرا گاندھی کے دورِ اقتدار میں حزبِ مخالف کا ایک اہم نام اٹل بہاری باجپائی بھی تھا ـــــ "ایمرجنسی کی پل صراط" سے گزر کر اپنے جن سنگھی بانے اتارے اور "جنتا" کے رنگ میں رنگ گئے۔ آخر ایمرجنسی کے رنگ کو بھنگ کر کے چھوڑا۔ اب "جنتا" کے ایوانِ حکومت میں ان کی آواز گونجتی ہے تو ہندوستان کی غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی کے راز کھولتی ہے ـــــ اپنی تہذیب اور زبان سے اتنا پیار کہ یو۔ این۔ او کے اجلاس میں اپنی قومی زبان میں بولے ـــــ اور ایسے بولے کہ ہندی کی گونج اقوامِ عالم کے دلوں میں اتر گئی۔ ہندی کو یہ درجہ دلانے کا سہرا اٹل جی کے سر بندھا ـــــ ابھی عمر رسیدہ نہیں ہیں مگر جب بیرونی ممالک کے گھاگ سیاست دانوں سے ملتے ہیں تو اچھوں اچھوں کے کان کاٹتے ہیں ـــــ ان کی کامیاب خارجہ پالیسی کا ایک کارنامہ ہے "پاکستان سے راز و نیاز" ـــــ سیاست داں ہونے کے باوجود ان کا کہنا ہے۔ ع "میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے" ـــــ

اٹل جی "جنتا کے ایوان" کے معماروں میں سے ہیں۔ ماہرین کی ایک رپورٹ کے مطابق جنتا کی مضبوط دیواروں میں جگہ جگہ دراڑیں پڑنی شروع ہو گئی ہیں، اٹل جی نے گزشتہ دنوں اعلان کیا ہے کہ وہ ان ٹوٹتی دیواروں میں سیمنٹ لگائیں گے ـــــ کاش وہ اپنے مشن میں کامیاب ہوں ●●

... جو ٹوٹے دلوں کو جوڑ دے"

میرے شب و روز

فکر تونسوی

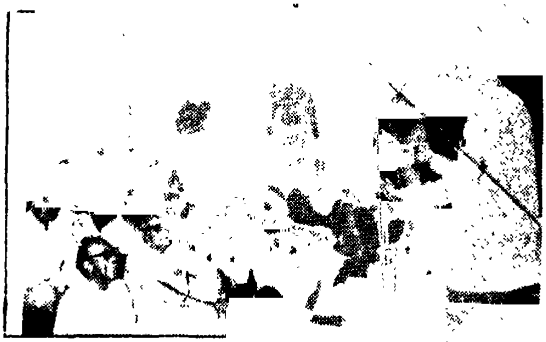


▲ بچے کے ساتھ ___ بچوں کی طرح ہنستا ہوں

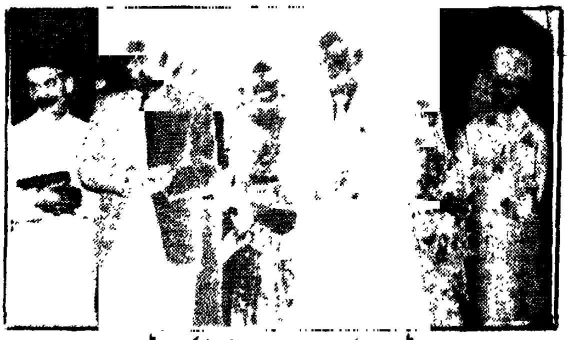
اطلاع عام ___ یہ بچہ میرا نہیں ۔ حیدر آباد کے شاہ علی کا ہے۔



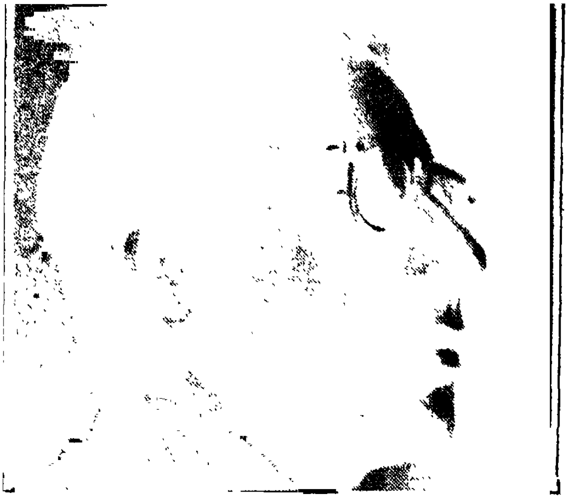
▲ قارئین کی رفاقت میں



▲ پیاز کے چھلکے ___ لکھتا ہی نہیں سُناتا بھی ہوں۔



▲ بطور ڈرامہ نگار ___ تھیٹر کی سٹیج پر



▲ آغاز ___ اچھا ہے (پچیسواں سال)

میرا

تاریخ پیدائش ___ پہلی جنگ عظیم

تاریخ (وفات) ___ تیسری جنگ عظیم

مقصدِ حیات ___

کچا

- بھوکا ننگا رہنا
- بھوکے ننگوں پر لکھنا
- خود کو رُلانا
- دوسروں کو ہنسانا
- جاہل بن کر سچ بولنا
- سچ بول کر جاہل کہلانا
- شہرت کا عروج
- عروج پر ندامت

چٹھا

ع قسمت بُری نہیں ہے طبیعت ذرا بُری ہے

▼ انجام ___ بُرا نہیں (ساٹھواں سال)





فوٹوگرافر نے حکم دیا۔ "مسکراؤ"
اور
فیض احمد فیض ، خوشتر گرامی، فکر تونسوی
اپنی اپنی سُر تال پر مُسکرا دیے۔



قتیل شفائی کے ساتھ لاہور میں محفل ناؤ و نوش
اب تو ــــــ میں نے مئے ترک کر دی ــــــ
قتیل نے محفلیں۔



افسانہ نگار رام لال کی عینک نے کہا ــــــ
"آپ کو کہیں دیکھا ہے ؟"
اور افسانہ نگار ہرچرن چاولہ یہ سوچ کر خوش ہوگیا
کہ فکر تونسوی میں بھی شک و شبہہ کی گنجائش
موجود ہے۔



◄ بیوی ـــــ چا کے ـــــ قلم



باپ ـــــ کنیا ـــــ دان ◄



پورا پریوار

◄ پریوار نیوجن سے

پہلے بھی ، بعد میں بھی

مدیر "بیسویں صدی"
کے غیر ملکی دورے کی
چند تصاویر

پاک بزمِ سخن کویت کی جانب سے عظیم شاعر ابنِ انشاؔ کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے ہوٹل شیراٹون میں ایک جلسے کا انعقاد کیا گیا ــــــ جلسے کی صدارت مدیرِ بیسویں صدی نے کی اور کویت میں مقیم برصغیر ہندوپاک کے تمام ادیب، شاعر نیز بہت سے ادب دوست حضرات اس میں شریک ہوئے۔ فیض کوثر اور عبدالحکیم شاہد نے ابنِ انشاؔ مرحوم کو منظوم نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ پنجابی کے شاعر محمد حسین صدیقی نے پنجابی نظم میں ابنِ انشاؔ کو عقیدت کے پھول پیش کیے ــــــ پروفیسر فرید قریشی اور باقی احمد پوری نے انشاؔ جی کی شخصیت اور فن کے بارے میں مقالے پیش کیے۔ آخر میں رحمٰن نیّرؔ نے پاک بزمِ سخن کی ادبی سرگرمیوں کو سراہا اور ان ریگزاروں میں ادب کی اس شمع کو جلائے رکھنے پر زور دیا۔ اور بالخصوص انجمن کے سرپرست فخرالدین جِکی والا کا شکریہ ادا کیا جن کی اصرار پر رحمٰن نیّرؔ کویت آئے۔



▲ کویت میں اپنے میزبان فخرالدین جِکی والا کی قیام گاہ پر منعقدہ غیر مقدمی جلسے میں۔



▼ بزمِ سخن کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں خواتین بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہیں۔





▲ مکۂ معظمہ میں، بابِ حرم کے سامنے



سیفیہ کالج بھوپال کی طرف سے منعقدہ کل ہند مشاعرے میں بزرگ شاعر جنابِ نشور واحدی غزل سرا ہیں۔

شبِ غم مری شبِ غم سرِ شام لوٹ آنا | نہ کہیں ترا ٹھکانا نہ کہیں مرا ٹھکانا
یہ حیات و موت کیا ہے اسے ہم نے کچھ نہ جانا | یہی زندگی حقیقت یہی زندگی فسانا
مجھے کیا ہے اس سے حاصل کہ قمر ہے تیری منزل | ترے سر پہ ہے ابھی تک وہی آسماں پرانا
تمھیں حسن و عشق دونوں ہی عطا ہوئے یہ کہہ کر | یہ چمن ہے مسکرانا، یہ ندی ہے ڈوب جانا

کوئی آج تک نہ سمجھا کہ شباب ہے تو کیا ہے
یہی عمر جاگنے کی یہی نیند کا زمانا



ڈاکٹر مظفر حنفی اپنا کلام سُنا رہے ہیں۔

طلسمِ جسم و ادا ، شعلۂ صدا کیا تھا | حواس ہوں تو بتائے کوئی ہُوا کیا تھا
بہت قریب تھا گرداب ، دیکھتے کیسے | بُلا رہی تھی ہر اک مَوج ، سوچنا کیا تھا
لرز رہی تھی مری تشنگی کنارے پر | کہ چشمِ آبِ رواں میں غبار سا کیا تھا
کوئی دبوچ کے گہرائیوں میں لایا ہے | مجھے خبر بھی نہیں، بادبان تھا، کیا تھا
غضب کیا کہ اُسے ہمسفر کیا میں نے | خود آگہی سے بڑا پیرِ تسمہ پا کیا تھا
بجا کہ موم کے پُتلے پگھل گئے لیکن | قصور اس میں ترے التفات کا کیا تھا

بھڑاس جی کی مٹانی تھی ورنہ جل بجھتے
غزل شعار نہ کرتے تو راستہ کیا تھا





▲ دلّی میں جشنِ ضیا فتح آبادی ـــــ مرکزی وزیرِ مملکت جناب عارف بیگ ضیا صاحب کو جناب مالک رام کی مرتب کردہ کتاب "ضیا فتح آبادی ـــــ شخص اور شاعر" کی پہلی جلد پیش کر رہے ہیں۔

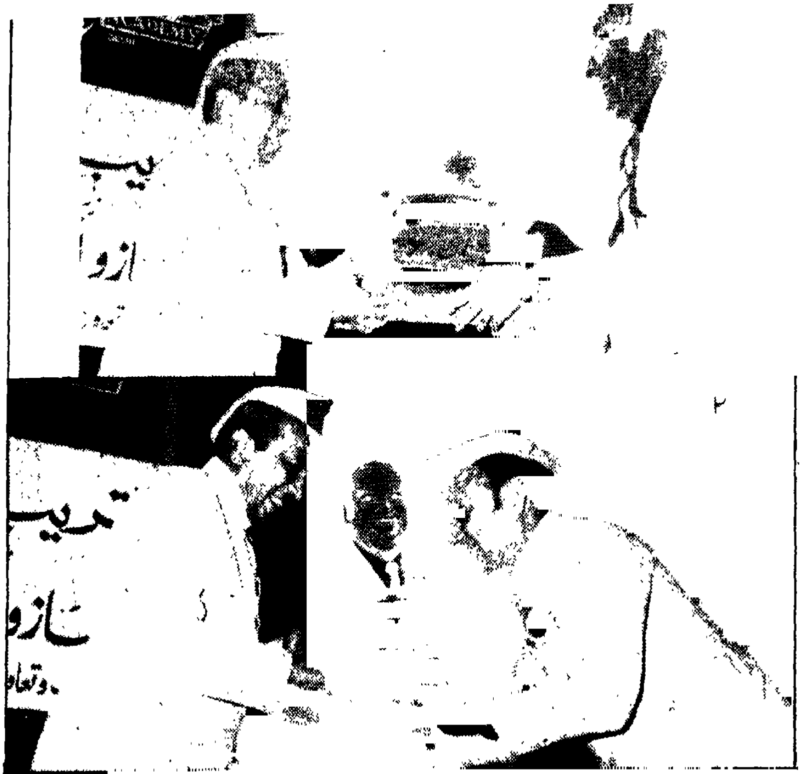
▲ "ضیا فتح آبادی ـــــ شخص اور شاعر" کے مرتب جناب مالک رام ضیا فتح آبادی کی شعری خدمات پر روشنی ڈال رہے ہیں۔



ایک ادبی تقریب میں نائب وزیرِ اعلیٰ کشمیر جناب میرزا افضل بیگ نے کچھ نئی مطبوعات کا اجرا فرمایا۔ تصویر میں بیگ صاحب جواں سال شاعر حکیم منظور کو ان کے شعری مجموعے "ناتمام" کی ایک جلد پیش کر رہے ہیں۔ راج نرائن راز کے مجموعۂ کلام "لذت لفظوں کی" کی جلد بھی حکیم منظور ہی نے حاصل کی۔



▲ ڈاکٹر جاوید اقبال، اقبال صدی تقریبات میں شرکت کے لیے نئی دلّی آئے تو یہاں کے ادبی حلقوں کی طرف سے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ تصویر میں سردار سرجیت سنگھ لامبہ اپنی مرتب کردہ کتاب "نذرِ خسرو" ڈاکٹر جاوید اقبال کو نذر کر رہے ہیں۔





بزمِ سازوادب کی طرف سے غالب اکیڈمی نئی دہلی میں جناب ساغر نظامی کی زیرِ صدارت 'تقریبِ اُردو' کا اہتمام کیا گیا۔ تقریب کے مہمانِ خصوصی نائب صدر جمہوریۂ ہند جناب بی ڈی جتی تھے۔ اِس سالانہ تقریب کا مقصد اُن شخصیتوں کی خدمات کا اعتراف کرنا ہے جو اُردو زبان وادب سے وابستگی رکھتی ہیں اور اِس کی ترویج و ترقی کے لیے کوشاں ہیں۔ اِس دفعہ بزم کی نگاہِ انتخاب جناب کرشن موہن جناب گلزار دہلوی اور محترمہ سرلا کپور پر پڑی۔ انھیں بالترتیب شاعرِ اُردو، پرستارِ اُردو اور مُطربۂ اُردو کے خطابات اور ہمدرد ٹرافیاں پیش کی گئیں۔ ٹرافیاں جناب بی۔ ڈی جتی کے ہاتھوں پیش ہوئیں۔ ●●

۱۔ نائب صدر جمہوریۂ ہند کرشن موہن کو ہمدرد ٹرافی پیش کر رہے ہیں۔

۲۔ گلزار دہلوی سپاس گزار انداز میں ٹرافی لیتے ہوئے۔

۳۔ محترمہ سرلا کپور ٹرافی حاصل کرتے ہوئے۔

۴۔ عزیز اندوری نے 'اردو' پر انشائیہ پڑھا۔ تصویر میں شری جتی کے علاوہ جناب ساغر نظامی، جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور بزم کے سیکریٹری جناب واحد سحری بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

ماضی کے جھروکے سے ——— میر ببر علی انیس

میر ببر علی انیس، میر خلیق کے بیٹے اور میر حسن کے پوتے تھے ان دونوں بزرگوں نے شاعری میں نام پیدا کیا تھا مگر انیس کے ہاتھوں تک آ کر ان کا یہ موروثی فن اپنے درجۂ کمال کو پہنچا۔ انیس ۱۸۰۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت انھوں نے گھر ہی میں رہ کر اپنی والدہ سے حاصل کی اور جب شعر گوئی کا آغاز ہوا تو اپنا کلام اپنے والد کو دکھانے لگے ——— میر انیس کی شہرت کا آفتاب لکھنؤ میں طلوع ہوا اور پھر چار دانگ عالم میں چمکنے لگا۔ خواص اور عوام سبھی ان کی قدر کرتے تھے اور ان کے کمالِ فن کے معترف تھے۔ مرثیہ گوئی کے ساتھ ساتھ مرثیہ خوانی میں بھی انیس ایک طرزِ خاص کے موجد تھے۔ قدرت نے انھیں بڑی اچھی آواز عطا کی تھی اور وہ مرثیہ اس طرح پڑھتے تھے کہ واقعات کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی تھی۔ لکھنؤ کی مجلسوں میں میرزا دبیر ان کے حریف کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔ آگے چل کر ان دونوں استادوں کا باہمی موازنہ اُردو شاعری کے ناقدین کا محبوب مشغلہ ٹھہرا۔ ان ناقدین میں علامہ شبلی نعمانی کا نام سرِ فہرست ہے جنھوں نے "موازنۂ انیس و دبیر" کے نام سے ایک مستقل کتاب تصنیف کی اور اپنے دلائل کا وزن انیس کے پلڑے میں ڈالا ——— میر انیس کے مرثیوں میں حالات و واقعات کی بہترین مرقع کشی کے ساتھ ساتھ کردار نگاری کا بھی کمال نظر آتا ہے۔ اہلِ بیت اور ان کے جاں نثاروں کا جو قافلہ کربلا کے میدان میں جا کر خیمہ زن ہوا تھا، ان کی ایمانی قوت اور ان کے کردار کی استقامت کا جو ولولہ انگیز بیان ان کے مرثیوں میں ہوا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ میر انیس نے فنِ سپہ گری کی بھی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی اور مختلف قسم کے آلاتِ حرب اور ان کے استعمال سے وہ بخوبی آگاہ تھے اس لیے جہاں جہاں انھوں نے جنگ کا نقشہ پیش کیا ہے اس میں اصلیت کا ایسا رنگ پیدا کر دیا ہے جو کبھی ماند نہیں پڑے گا ——— مرثیوں کے علاوہ انیس نے سلام بھی کہے ہیں اور رباعیاں بھی یہاں بھی ان کی استادانہ حیثیت مسلم ہے۔ ۱۸۷۴ء میں اُردو کے اس باکمال شاعر نے لکھنؤ میں انتقال کیا۔

حضرت امام حسینؓ کی مدینے سے روانگی (ایک طویل مرثیے کے چند بند) ——— میر ببر علی انیس

فرزندِ پیمبر کا مدینے سے سفر ہے　　ساداتْ کی بستی کے اُجڑنے کی خبر ہے
درپیش ہے وہ غم کہ جہاں زیر و زبر ہے　　گُل چاک گریباں ہیں، صبا خاک بسر ہے
گُل رُو، صفتِ غنچہ کمربستہ کھڑے ہیں
سب ایک جگہ صورتِ گُلدستہ کھڑے ہیں

رخصت کے لیے لوگ چلے آتے ہیں باہم　　ہر قلب حزیں ہے، تو ہر اک چشم ہے پُرنم
ایسا نہیں گھر کوئی کہ جس میں نہیں ماتم　　غل ہے کہ چلا دلبرِ مخدومۂ عالم
خُدّام کھڑے پیٹتے ہیں قبرِ نبی کے
روضے پہ اُداسی ہے رسولِ عربی کے

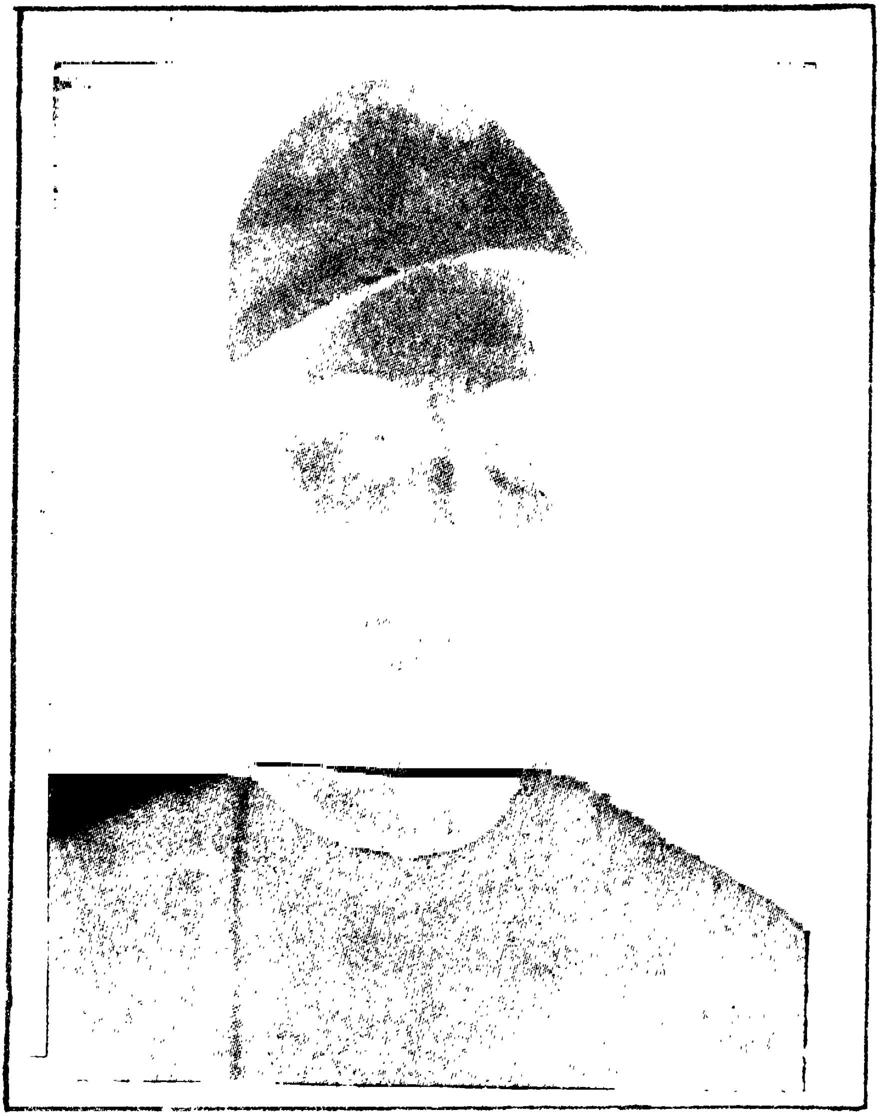
حاضر درِ دولت پہ ہیں سب یاور و انصار　　کوئی تو کمر باندھتا ہے اور کوئی ہتھیار
ہَودج بھی کسے جاتے ہیں، محمل بھی ہیں تیار　　چلّاتے ہیں درباں، کوئی آئے نہ خبردار!
ہر محمل و ہَودج پہ گھٹا ٹوپ پڑے ہیں
پردے کی قناتیں لیے فرّاش کھڑے ہیں

زینت دہِ محمل جو ہوئی دُخترِ زہرا　　ناقوں پہ چڑھے سب حرمِ سیدِ والا
آنے لگے رہ وار، کھُلا گرد کا پردا　　عباس سے بولے یہ شہِ یثرب و بطحا
صدمہ ہے بچھڑنے کا مرے، روحِ نبی پر
رخصت کو چلو قبرِ رسولِ عربی پر

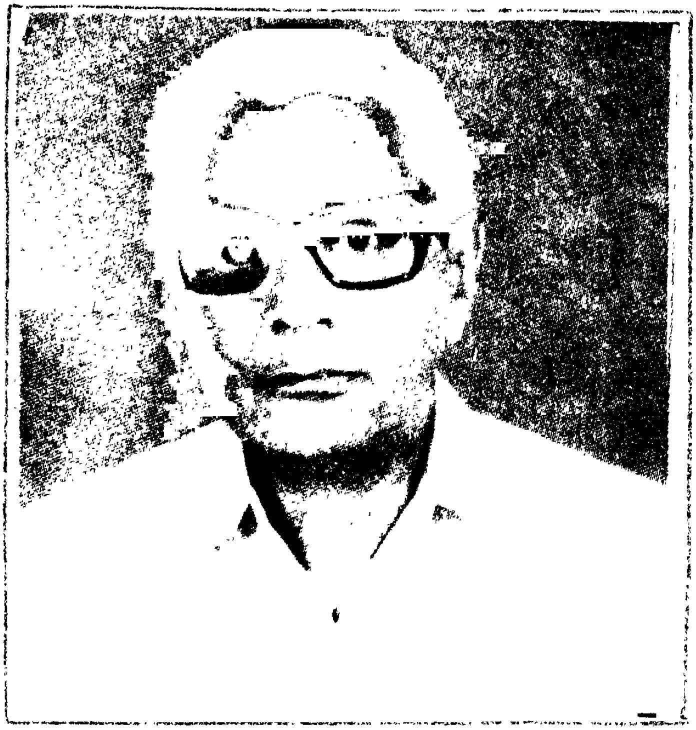
پیدل شہِ دیں روضۂ احمد کو سدھارے　　تربت سے صدا آئی کہ آ اے مرے پیارے!
تعویذ سے شبیّر لپٹ کر یہ پکارے　　ملتا نہیں آرام نواسے کو تمھارے
خط کیا ہیں، اجل کا یہ پیام آیا ہے نانا!
آج آخری رخصت کو غلام آیا ہے نانا!

میں اِک تنِ تنہا ہوں، ستم گار ہزاروں　　اِک جان ہے اور درپئے آزار ہزاروں
اِک پھول سے رکھتے ہیں خلش خار ہزاروں　　اک سر ہے فقط اور خریدار ہزاروں
واں جمع کئی شہر کے خوں ریز ہوئے ہیں
خنجر مری گردن کے لیے تیز ہوئے ہیں

میر ببر علی انیسؔ



انیسؔ دم کا بھروسا نہیں، ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے



رضا نقوی واہی —— منظوم آدمی

مجتبیٰ حسین

۸۰/۲۹ مالویہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷

ان سے ملیے۔ یہ ہیں رضا نقوی واہی۔ اردو کے مشہور طنزیہ و مزاحیہ شاعر۔ انھیں ذرا الٹ پلٹ کر غور سے دیکھیے۔ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان سے اسی وقت گھبرانا چاہیے جب ان کے ہاتھ میں قلم ہو۔ اس وقت تو یہ ہنستے بیٹھے ہیں۔ آپ کو حساب تو آتا ہوگا ان کی ذات میں سے قلم کو منہا کر دیا جائے تو جواب صفر آئے گا۔

یہ پٹنہ میں پائے جاتے ہیں۔ پٹنہ ہندوستان کا واحد شہر ہے جس کے کئی ترجمے رائج ہیں۔ پٹنہ کا فارسی ترجمہ عظیم آباد اور سنسکرت ترجمہ پاٹلی پتر ہے۔ پٹنہ خود کس کا ترجمہ ہے یہ ابھی تک پتہ نہیں چل سکا ہے۔ ہم پہلے سمجھتے تھے کہ یہ تینوں نام تین مختلف شہروں کے ہیں لیکن ایک بار خود پٹنہ گئے تو پتہ چلا کہ ہم ایک ہی ٹکٹ میں بیک وقت تین شہروں میں پہنچے ہوتے ہیں۔ ہماری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ شہر تو سیدھا سادا ہے۔ ہم یہاں کہیں نہیں بھٹکے لیکن اس کے ترجمے کی بھول بھلیوں میں کئی دن بھٹکتے رہے۔

ہم واہی صاحب کو پچھلے نو دس برسوں سے جانتے ہیں۔ اس سے پہلے ان کا کلام پڑھتے تھے اور اپنے سر کو اس زور سے دھنتے تھے کہ گردن میں درد شروع ہو جاتا تھا۔ بعد میں ڈاکٹر نے منع کیا تو سوچا ان سے شخصی ملاقات کی جائے۔ ان سے پٹنہ اور حیدرآباد میں ہماری ملاقاتیں رہی ہیں۔ لیکن واہی صاحب کے سلسلے میں

شخصی ملاقاتوں کی اتنی اہمیت نہیں ہے اس لیے کہ وہ ہمیں اکثر ایسے خط لکھتے رہے ہیں جن کے جواب دینے کی نہ ہم میں تاب ہے نہ مجال۔ آپ جانتے ہیں کہ واہی صاحب بہت اچھے منظوم خط "کہتے" ہیں۔ آپ کو ہماری گرامر پر اعتراض ہوگا کہ خط تو لکھے جاتے ہیں کہے نہیں جاتے۔ یہ ہماری گرامر کا نہیں واہی صاحب کے خطوں کا قصور ہے۔ جب نظم کہی جاتی ہے، غزل کہی جاتی ہے تو منظوم خط بھی کہے جاتے ہیں لکھے نہیں جاتے۔ ۱۹۶۸ء کے اوایل میں ان کا پہلا منظوم خط ہمیں ملا تھا۔ اس خط کو پاکر ہم کئی دن پریشان رہے کہ انھیں کیسے جواب دیں کیونکہ ہم ہمیشہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے عادی رہے ہیں اور یہاں ہمارا یہ حال تھا کہ "نہ ردیف کی خبر ہے نہ قافیہ معلوم"۔

ایک دوست کے ذریعہ زبانی پیغام ان تک پہنچایا کہ اگر طبع نازک پر گراں نہ گزرے تو ہمیں نثر میں جواب دینے کی اجازت دی جائے۔ ہم نے کہلوایا کہ آدمی کو کبھی کبھی نثر بھی لکھنی چاہیے۔ یوں اچھی بھلی زندگی کو آغا حشر کاشمیری کا ڈرامہ بنانے کا کیا فائدہ۔ انھوں نے ہمیں نثر میں جواب دینے کی اجازت تو دیدی مگر جواب دینے کا مزہ نہ آیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان کے منظوم خطوں کے جواب نہیں دیتے جس کے نتیجہ میں وہ ہم سے ناراض ہو جاتے ہیں اور ناراض ہو کر پھر ایک منظوم خط ہمیں "ارشاد" کر دیتے ہیں۔

ایک بار انھوں نے ہمیں ایک منظوم خط لکھا۔ ہم نے خط لکھ کر ان سے پوچھا کہ یہ خط جو آپ نے ہمیں بھیجا ہے وہ "مطبوعہ" ہے یا "غیر مطبوعہ"؟۔ جواب آیا "فی الحال تو غیر مطبوعہ ہے"۔ چونکہ اس خط میں ہماری تعریف تھی اس لیے ہم نے اسے ماہنامہ "صبا" میں چھپوا دیا۔ بعد میں ان کے منظوم خط کی تعریف میں ہمارے پاس کئی خط آئے۔ تعریفی خطوں کو تو ہم نے خوشی خوشی قبول کیا۔ لیکن ہمارے حلقہ کے ڈاکیے صاحب جو خود بھی شاعر واقع ہوئے تھے ایک دن شکایتاً کہنے لگے "صاحب، آپ کے ہاں واہی صاحب کے منظوم خط آتے ہیں اور ہم ہی یہ خط آپ تک پہنچاتے ہیں لیکن آپ ہمیں ان خطوں کی چاشنی سے محروم کیوں رکھتے ہیں؟" ہم نے کہا "میاں، جب بھی واہی صاحب کا خط آئے تو چلے آنا۔ ہم تمہیں سُنا دیں گے۔ واہی صاحب کے ان خطوں میں ہمارے لیے تو کچھ بھی نہیں ہوتا بڑے بے ضرر خط ہوتے ہیں۔ ان میں ہمارا خیال کم اور ردیف و قافیے کا خیال زیادہ رکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سارے خط قابل اشاعت ہوتے ہیں۔ سچے اور اصلی خط کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ ناقابلِ اشاعت ہوتا ہے۔ مرزا غالبؔ، مولانا آزاد اور جواہر لال نہرو سے لے کر واہی صاحب تک کے خطوں کی خرابی یہ ہے کہ یہ چھپنے کے ارادے سے لکھے گئے تھے۔ یہ خط تو ساری قوم کی ملکیت ہوتے ہیں۔ مکتوب الیہ تو خواہ مخواہ بدنام ہوتا ہے۔ ڈاکیے نے ہماری بات پر اس حد تک یقین کر لیا کہ جب بھی واہی صاحب کا کوئی خط ہمارے نام آیا تو اس نے قوم کی ملکیت سمجھ کر پڑھ لیا اور خود کو قوم سمجھ کر واہی صاحب کو جواب دیدیا۔ اس طرح ہمارا کام کافی آسان ہو گیا۔

آج ہم ایک راز کا افشا بھی کرنا چاہتے ہیں۔ یہ جو ہم ان دنوں خاکہ نگاری کر رہے ہیں بلکہ خود واہی صاحب کا خاکہ لکھ رہے ہیں تو اس کی اصل وجہ خود واہی صاحب کا ایک منظوم خط ہے۔ بات یوں ہوئی کہ ۱۹۶۸ء میں جب ہم نے حکیم یوسف حسین خاں پر پہلا خاکہ لکھا تھا تو اس کی توصیف میں واہی صاحب نے ایک منظوم خط بھی لکھا تھا۔ جس کے کچھ اشعار آپ کو بھی سناتے دیتے ہیں اس لیے کہ ان میں ہماری تعریف ہے۔

یوسف حسین خاں کی تصویر کھینچ کر
تم نے نشان بلند کیا اپنے آرٹ کا
ہنستے ہنساتے راز سبھی فاش کر دیے
کہتے ہیں اس کو خاکہ نگاری کا معجزا
اس درجہ خوش ہوا ہوں کہ در عالمِ خیال
کتنی ہی بار تم کو گلے سے لگا لیا
یہ تو بتاؤ سُن کے یہ مضمونِ لاجواب
یوسف حسین خان کا ردِ عمل تھا کیا

ہماری خاکہ نگاری پر یہ پہلا تبصرہ تھا بلکہ منظوم تبصرہ تو آج تک بھی پہلا ہے۔ اس ہمت افزائی نے ہمیں اس درجہ گمراہ کیا کہ آج تک خاکہ نگاری کیے چلے جا رہے ہیں۔ ذرا سوچیے واہی صاحب کتنے دور اندیش آدمی ہیں۔ اپنے اوپر خاکہ لکھوانے کے لیے دس سال پہلے حکیم یوسف حسین خاں پر لکھے ہوئے ہمارے خاکے کی تعریف کی تھی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تعریف کے اس پردہ زنگاری میں وہی معشوق بنے بیٹھے ہیں۔ اگر واہی صاحب کبھی آپ کی ہمت افزائی کریں تو ہشیار ہو جایئے کہیں آپ کو بھی خاکہ نہ لکھنا پڑ جائے۔

واہی صاحب کو ایک بار ہم نے حیدرآباد بلایا تھا۔ بڑی مشکل سے آئے عذر یہ پیش کرتے تھے کہ ان کی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی صحت کی خرابی کا اعلان کچھ اس زور و شور سے اور تفصیل سے کیا تھا کہ ہم اسٹریچر لے کر انھیں لینے اسٹیشن پہنچے۔ بلکہ ایک ڈاکٹر بھی حفظِ ماتقدم کے طور پر اپنے ساتھ رکھا۔ یہ ٹرین سے اترے تو دیکھا کہ ایک نہایت صحت مند آدمی سامنے کھڑا ہے سخت مایوسی ہوئی۔ اسٹیشن سے واپسی میں ہم اسٹریچر پر آئے اور وہ ٹیکسی میں۔ جتنے دن حیدرآباد میں رہے دھما چوکڑی مچاتے رہے۔ سمجھ میں نہیں آیا وہ کب بیمار رہتے ہیں۔ کیسے بیمار رہتے ہیں۔ کیا بیمار رہتے ہیں یکمشت

بیمار رہتے ہیں یا قسطوں میں بیمار رہتے ہیں۔
حیدر آباد میں قیام کے دوران میں ایسی صحتمندانہ حرکتیں کیں کہ ہم دنگ رہ گئے۔

ان دنوں حیدر آباد میں ایک جدید شاعر رہتے تھے۔ جدید شاعری اور افسانہ نگاری میں آج بھی وہ ایک اہم شخصیت کے مالک ہیں مگر اب پاکستان چلے گئے ہیں۔ ان کی خوبی یہ تھی کہ جیسی شاعری کرتے تھے ویسا ہی اپنے آپ کو رکھتے تھے۔ حالانکہ شاعر کے قول اور فعل میں کوئی مطابقت نہیں ہوتی۔ کئی کئی دن غسل نہیں فرماتے تھے۔ منہ دھوئے بغیر کھانا کھالیتے تھے۔ کپڑوں کو دیکھیے تو لگتا تھا پیشہ کے لحاظ سے تیلی ہیں۔ خون اور پیپ پینا تو ان کی شاعری میں روزمرہ کا معمول تھا۔ واہی صاحب کی ان سے حیدر آباد میں ملاقات ہوگئی۔ اب واہی صاحب نے ان میں دلچسپی لینی جو شروع کی تو ہم سب حیران کہ آخر واہی صاحب کو جدید شاعری سے ایسا والہانہ لگاؤ کیونکر ہوگیا۔ سارا سارا دن اپنے "موضوعِ سخن" کو ساتھ رکھتے۔ نہ یہ پٹنہ واپس جاتے تھے نہ جدید شاعر کو اپنے سے جدا ہونے دیتے تھے۔ بار خدا ایک دن تنہائی نصیب ہوئی تو عرض کیا "بندہ پرور پٹنہ میں لوگ آپ کے لیے بےچین ہوں گے۔ واپسی کا کب ارادہ ہے؟" فرمایا "آپ کے شاعر دوست کو غسل کرنے کے لیے راضی کر رہا ہوں۔ جیسے ہی غسل کی تاریخ مقرر ہوجائے گی میں اس فرض سے سبکدوش ہوکر پٹنہ واپس چلا جاؤں گا۔ آپ خاطر جمع رکھیں۔" چنانچہ واہی صاحب کے پیہم تقاضوں کے بعد "موضوعِ سخن" غسل کرنے کے لیے تیار ہوگیا مگر یہ غسل کوئی معمولی غسل نہیں تھا۔ اس کے لیے ایک باضابطہ تقریب منعقد کی گئی۔ واہی صاحب مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے اس تقریب میں شریک ہوئے بلکہ انھوں نے ہی پانی کا پہلا لوٹا "موضوعِ سخن" کے سر پر ڈال کر غسل کا باضابطہ افتتاح فرمایا تھا۔ اس کے بعد کا سارا کام غسالوں نے انجام دیا۔ جدید شاعر کو خوب رگڑ رگڑ کر نہلایا گیا۔ کسی نے واہی صاحب کو سمجھایا کہ اُپلے کو چاہے آپ کتنا ہی نہلائیں وہ اُپلا ہی رہے گا۔ مگر واہی صاحب اب ارادے کے ایسے پکے نکلے کہ شاعر کو نہلا کر ہی دم لیا۔ پھر شاعر کے خوشبوئیں لگائی گئیں۔ اسے نئے کپڑے پہنائے گئے۔ جدید شاعر کے غسل کی تقریب کے بعد واہی صاحب نے اطمینان کا لمبا سانس لے کر کہا "اب یوں لگ رہا ہے جیسے میں نے گنگا نہالی ہے۔ اب میں پٹنہ جاؤں گا۔ تاہم مجھے اطلاع دیتے رہنا کہ اس غسل کے بعد ان کی شاعری میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔" واہی صاحب نے یہ ساری حرکت کچھ ایسی سنجیدگی سے کی تھی اور جدید شاعر نے بھی اس سنجیدگی سے اپنے آپ کو ہمارے ہاتھوں نہلوایا تھا کہ کئی دنوں تک یہ پتہ نہ چلا کہ واہی صاحب مذاق کر رہے ہیں یا سنجیدہ ہیں۔ بہت دن بعد ایک دن پتہ چلا کہ مذاق کر رہے تھے۔

اس کے بعد سے ہم واہی صاحب سے کافی چوکس رہنے لگے ہیں۔ یہ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ ہمیں تو اس وقت مایوسی ہوئی تھی جب یہ اپنی بیماری کے لگاتار اعلان کے باوجود ہمیں صحت مند دکھائی دیے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ اپنی بیماریوں کا اعلان محض بیماریوں کے جراثیم کو دھوکہ دینے کے لیے کرتے ہیں۔ یعنی گلے میں بیماریوں کے سلسلے میں ہاؤس فل کی تختی لگا دی جائے تو جراثیم خود بخود کسی دوسرے جسم کی طرف رجوع کریں گے۔

ان کی اس صحت مندی کا نتیجہ تھا کہ پورے نو سال بعد پچھلے سال جب ہم پٹنہ گئے تو اسٹیشن پر واہی صاحب کو دیکھتے ہی پہچان گئے۔ بڑی بے تکلفی کے ساتھ ان سے گلے ملنے کے بعد کہا "واہی صاحب آپ نے اسٹیشن آنے کی زحمت کیوں کی۔ ہم خود آپ کے دولت خانے پر حاضر ہو جاتے۔" ہمیں جواب ملا "معاف کیجیے میں واہی صاحب نہیں ہوں۔ میں ان کا بڑا لڑکا علی ہوں۔" ہم نے کہا "واہی صاحب مذاق چھوڑیے ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ واہی صاحب ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ آپ بڑی سنجیدگی کے ساتھ علی مذاق کرتے ہیں۔"

پھر جواب آیا "خدارا یقین کیجیے۔ میں واہی صاحب نہیں ہوں بلکہ ان کا بڑا علی مذاق ہوں۔" وہ تو اچھا ہوا کہ بحث کے دوران میں شفیع مشہدی آگئے۔ انھوں نے تصدیق کی تو دل کو اطمینان آیا کہ یہ واہی صاحب نہیں ہیں۔ یوں بھی ہم ان سے نو سال بعد مل رہے تھے۔ ہوٹل میں پہنچے تو وہاں ایک اور واہی صاحب نظر آئے۔ موخر الذکر واہی صاحب چونکہ اول الذکر واہی صاحب سے خاصے کم عمر نظر آتے تھے اس لیے ہم نے سوچا کہ ہو نہ ہو یہی اصلی واہی صاحب ہوں گے۔ قریب گئے تو سچ مچ اصلی واہی صاحب نکلے پہلے سے کہیں زیادہ صحتمند اور توانا۔ پہلے جو بال سفید تھے وہ اور کچھ کالے ہو گئے تھے چہرے پر پہلے سے کہیں زیادہ چمک نظر آتی تھی۔ ہم نے ان کی صحت کی داد دینی شروع کر دی تو فوراً اپنی بیماریوں کی تفصیل سنانے پر اتر آئے۔

حیدر آباد میں واہی صاحب کو جدید شاعر کو غسل کراتے دیکھا تھا۔ پٹنہ آئے تو دیکھا کہ یہاں ان کی بڑی "اندرا لہر" چلی ہوئی ہے۔ یہاں ان کی شخصیت میں ایسا رکھ رکھاؤ نظر آیا کہ یوں لگا جیسے طنز و مزاح سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ انھوں نے نہ جانے یہ گر کہاں سے سیکھا ہے کہ

لفافے

رضا نقوی واہی

روڈ نمبر ۱۶/ ۵ محمد علی باغ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۱ (بہار)

آج میں ایک رسالے کے جو دفتر میں گیا
محوِ ترتیبِ مضامین تھے مدیرِ اعلیٰ

پوسٹ مین آگیا اتنے میں ہاں ڈاک لیے
پوسٹ کارڈ اور لفافوں کی کئی تھاک لیے

لگ گیا میز پہ اس طرح خطوں کا انبار
جس طرح شہر کی گلیوں میں ہو کوڑے کی قطار

لی ایڈیٹر نے انھیں دیکھ کے اک انگڑائی
کبھی رخسار پہ زردی کبھی لالی آئی

کر کے پھر ڈاک کا تودہ تہ و بالا جھٹ سے
کارڈ جتنے تھے انھیں چن کے نکالا جھٹ سے

ان میں جو کام کا تھا پڑھ کے الگ چھانٹ لیا
اور باقی جو بچے پھاڑ کے نیچے پھینکا

کارڈ کے بعد لفافوں کی جو باری آئی
اک عجب طرح کی چہرے پہ اداسی چھائی

دیکھتے دیکھتے رخسار کی رنگت ہوئی زرد
ایسا ظاہر ہوا جیسے کہ اٹھا پیٹ میں درد

میں نے گھبرا کے کیا حضرتِ والا سے سوال
بات کیا ہے جو طبیعت ہوئی اس درجہ نڈھال

وہ یہ بولے کہ میں کیا حالِ دلِ زار کہوں
بسکہ حالات کے شکنجے میں ہوں اک صیدِ زبوں

یہ لفافوں کا جو انبار نظر آتا ہے
اُف! اسے دیکھتے ہی منہ کو جگر آتا ہے

یہ لفافے مرے اعصاب پہ چھا جاتے ہیں
میرے ایوانِ خیالات کو ڈھا جاتے ہیں

ان میں کچھ اور نہیں صرف غزل ہوتی ہے
دیکھ کر جن کو طبیعت مری شل ہوتی ہے

دن میں دو بار اسی طرح سے ڈاک آتی ہے
اور ہر بار غزل ٹھاک کی ٹھاک آتی ہے

نہ تو خاکہ، نہ ڈرامہ، نہ کوئی افسانہ
بس جو آیا تو فقط "حالِ دلِ دیوانہ"

ان لفافوں میں نہ جب کوئی مقالہ نکلے
کیوں نہ اُردوئے معلّیٰ کا دوالہ نکلے

جس طرح سے کسی منڈی میں ہو جاپانی مال
یوں ہی بازارِ صحافت میں ہے غزلوں کا حال

چھاپنا چاہوں جو میں صرف غزل کے اشعار
آج بن جائے رسالہ مرا "قلمی اخبار"

ہر گلی کوچے میں دس بیس سخنور ہیں ضرور
جن کے افلاس کا ہوتا ہے تغزل میں ظہور

جن کا آغاز غزل، جن کا ہے انجام غزل
دن غزل، رات غزل، صبح غزل، شام غزل

ذہن مفلس ہے، مگر مشقِ سخن جاری ہے
یہ غزل گوئی بھی اعصاب کی بیماری ہے

شعر جیسے بھی ہوں، بھیجیں گے اشاعت کے لیے
زیست دشوار ہے اہلِ صحافت کے لیے

"اب تو گھبرا کے یہ کہتا ہوں کہ مر جاؤں گا"
قبر میں بھی جو یہ پہنچے تو کدھر جاؤں گا

ہرشخص سے اپنی عزت کرواتے ہیں۔ چھوٹا بڑا، دبلا، کالا، گورا ہر ایک ان کی عزت کرتا ہے کاش یہ گر ہمیں بھی آتا اور ہم بھی اپنی عزت کرانے کا مزہ لوٹتے۔ مدت ہوئی کسی سے اپنی عزت نہیں کروائی۔ ان کی شخصیت کی خوبی یہ ہے کہ شاعر ہونے کے باوجود ان میں شرافت و نفاست کوٹ کوٹ کر بھری ہے سچ تو یہ ہے کہ ان کی شرارت بھی شرافت ہوتی ہے۔ کسی کام میں جب تک شرافت کی ملاوٹ نہیں کر لیتے تب تک اس کام کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ ان سے ملنے کا ہمیں ایک فائدہ یہ ہوا کہ بہار اور بہار کے لوگوں کے متعلق ہمیں جتنی غلط فہمیاں تھیں وہ نہ صرف دور ہو گئیں بلکہ الٹی خوش فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ایک آدمی کبھی کبھی کتنا بڑا کام کر جاتا ہے۔

طنز و مزاح نگار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ زمانے کی دکھتی ہوئی رگوں کو پکڑ لیتا ہے۔ لیکن ہمارا ذاتی مشاہدہ یہ ہے کہ اکثر طنز و مزاح نگار اچھی بھلی بنا دکھ والی رگوں کو اس زور سے پکڑ لیتے ہیں کہ ان میں خود بخود درد شروع ہوتا ہے اور دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ موصوف نے دکھتی رگ پکڑ لی ہے۔ واہی صاحب کی خوبی یہ ہے کہ زمانے کی دکھتی رگوں کے پیچھے حیران نہیں رہتے بلکہ اپنی ہی دکھتی رگوں کو پکڑ لیتے ہیں۔ یہ بڑے ظرف کی بات ہے۔ ان کے طنز میں کسی کی دل آزاری مقصود نہیں ہوتی۔ واہی صاحب عرصے سے ہماری کمزوری رہے ہیں۔ اکبر الہ آبادی کی روایت کو ہندوستان میں اگر کوئی سنجیدگی سے آگے بڑھا رہا ہے تو یہ واہی صاحب ہی ہیں۔ لوگوں میں قہقہوں کی دولت بانٹنا دنیا کا شریف ترین پیشہ ہے۔ کسی مزاح نگار نے کہا ہے کہ قہقہہ لگانے سے آدمی کے سفید بال کالے نہیں ہو جاتے۔ بس یہ ہے کہ اس کے بعد یہ سفید بال برے نہیں لگتے زندگی سے ٹوٹ کر پیار کرنے کو جی چاہتا ہے

کروڑوں سال پرانی دنیا میں آدمی زندگی کے ساٹھ ستر سال کس مشکل سے گزار ہے۔ یہ اس کا دل ہی جانتا ہے۔ ایسے میں کو قہقہوں کی دولت بانٹتا ہے تو ہمیں اس احسان مند ہونا چاہیے۔ ان کا مجموعہ کلام "متاعِ واہی" صرف واہی صاحب کی متاع نہ ہے بلکہ یہ متاعِ انسانیت بھی ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد اپنے سفید بالوں پر پیار آتا ہے۔ لیک زندگی بڑی پرکشش دکھائی دینے لگتی ہے۔ واہی صاحب کا یہ احسان کیا کم ہے کہ وہ ہمیں جینے کا نیا انداز سکھاتے اور نیا حوصلہ عطا کرتے ہیں۔

غزل

ساغر نظامی

[illegible]

★

لاکھ بہلاتا ہوں فطرت کو بہلتی ہی نہیں ۔۔۔ رہ جو اک کیل سی دل میں ہے نکلتی ہی نہیں

چھائے رہتے ہیں تری یاد کے سائے شب و روز ۔۔۔ میرے آنگن سے کبھی چاندنی ڈھلتی ہی نہیں

ان کی آنکھوں میں جو مواج ہے مستی بن کر ۔۔۔ وہ مئے ناب مرے جام میں ڈھلتی ہی نہیں

جب بھی آتی ہے اندھیروں کو لیے آتی ہے ۔۔۔ روشنی اپنی روایات بدلتی ہی نہیں

عشق نے موت کو ہر موڑ پہ لوٹایا ہے ۔۔۔ کون کہتا ہے کہ آئی ہوئی ٹلتی ہی نہیں

چوٹ کرتا ہے غمِ دل بھی غمِ دوراں بھی ۔۔۔ میری وحشت کسی ضربت سے دہلتی ہی نہیں

پھسلی جاتی ہے مرے جسم سے مچھلی کی طرح ۔۔۔ وہ قبا مجھکو ملی ہے کہ سنبھلتی ہی نہیں

وعدۂ رحمت کا کسی عہد میں ایفا نہ ہوا ۔۔۔ شاخ یہ وہ ہے کسی فصل میں پھلتی ہی نہیں

سینکڑوں سورجوں کی زد میں ہے ہستی لیکن ۔۔۔ یہ مرے پاؤں کی زنجیر پگھلتی ہی نہیں

نکلی جاتی ہے مرے ہاتھ سے لمحوں کی طرح! ۔۔۔ زندگی میرے سنبھالے سے سنبھلتی ہی نہیں

[illegible]

[illegible]



[redacted]

اقبالؒ صدی پبلیکیشنز کی پیشکش

اقبالؒ کی شخصیت، ان کی شاعری اور ان کے فلسفے پر پانچ فکر انگیز کتابیں

خطوطِ اقبالؒ

اپنے عہد کی اہم شخصیتوں کے نام علامہ اقبال کے ایک سو گیارہ خطوط جواب تک مدوّن ہو کر منظرِ عام پر نہیں آئے تھے۔ اقبال کی شخصیت کے ساتھ ساتھ اُن کے عہد کو سمجھنے کے لیے بھی یہ خطوط ایک بڑا وسیلہ ہیں۔ مرتب: رفیع الدین ہاشمی جن کے حواشی نے کتاب کی افادیت اور بڑھا دی ہے۔

قیمت :- تیس روپے

اقبالؒ، ایک تجزیاتی مطالعہ

علّامہ اقبالؒ کے نظامِ فکر کے مختلف اہم پہلوؤں کا تجزیہ۔ لکھنے والوں میں پرانے اور نئے کئی اہم نقادوں کے نام شامل ہیں۔ ہر نقاد نے کسی ایک پہلو پر قلم اٹھایا ہے اور اس کے تمام مضمرات سے عالمانہ بحث کی ہے۔

مرتب: سیّد معراج نیّر۔ قیمت: پندرہ روپے

سفرنامۂ اقبالؒ

علّامہ اقبالؒ نے متعدد غیر ملکی سفر کیے تھے اور اس سیاحت نے ان کے فکر و فن پر جو اثرات مرتب کیے، اُن کی اہمیت کا اعتراف سبھی کو ہے۔ اس کتاب میں ان کے ہر سفر کی تفصیل کچھ ان کی اور کچھ ان کے قریبی دوستوں کی زبانی بیان ہوئی ہے۔ انتہائی معلومات آفریں اور انتہائی دلچسپ کتاب ——— مرتب: حق نواز۔

قیمت: پچیس روپے

قرآن اور اقبالؒ

علّامہ اقبالؒ کے افکار کا بنیادی سرچشمہ قرآنی تعلیمات ہیں — یہ کتاب اس خیال کی مدلّل توثیق کرتی ہے اور اقبالؒ کے خطوط، اُن کے خطبات اور ان کی شاعری میں جہاں جہاں قرآن مجید کے حوالے آئے ہیں وہ سب فاضل مرتب ابو محمد مُصلح نے اس میں یکجا کر دیے ہیں۔

قیمت: اٹھارہ روپے

اقبالؒ شخصیت اور شاعری

علامہ اقبالؒ کی حکیمانہ شخصیت اور شاعری پر علّامہ اقبالؒ کے سب سے بڑے قدر شناس اردو کے عظیم ناقد پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مضامین کا مجموعہ جس کی قدر و قیمت کا اندازہ آپ اسے پڑھ کر ہی کر سکیں گے۔

قیمت: بارہ روپے

ہر کتاب ڈمائی سائز میں فوٹو آفسیٹ کے ذریعے سفید خوشنما کاغذ پر شائع کی گئی ہے۔

پانچ کتابوں کا [illegible]

[illegible] منگانے پر [illegible] محصول [illegible] نہیں لیا جائیگا۔

بُک سیلرز اور ایجنٹوں کو معقول کمیشن۔

تقسیم کار:۔ بیسویں صدی بُک ڈپو، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ناول

دوسری قسط

چار یار

خواجہ احمد عباس

فلومینا لاج۔ چرچ روڈ۔ جوہو۔ بمبئی۔ ۴۰۰۰۵۴

تیسرا باب
ڈاکو

ڈاکو شیطان سنگھ کا اصل نام مہادیو سنگھ تھا لیکن وہ شیطان کے نام سے مشہور تھا۔ کیوں کہ اُس کی ساری حرکتیں شیطانی تھیں۔

کسی زمانے میں وہ ایک چھوٹے موٹے زمیندار کا بیٹا تھا لیکن اُس کے باپ کی سب زمین ساہوکار بھگوان رائے کے پاس رہن رکھی تھی۔ اُس نے کورٹ سے ڈگری لے کر مہادیو سنگھ کے باپ کی ساری جائداد پر قبضہ کر لیا اور مہادیو سنگھ کا پریوار بے جائداد اور بے گھر ہو گیا۔ اس کی ماں نے کنوئیں میں ڈوب کر خود کشی کر لی۔ باپ سنیاس لے کر ہردوار چلا گیا۔ رہ گیا مہادیو سنگھ۔ وہ نوجوان تھا۔ رگوں میں راجپوت خون تھا۔ دیکھنے میں اچھا ہٹا کٹا تھا۔ گھوڑے یا اونٹ پر بیٹھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی راجکمار ہو۔ باپ کی جائداد ہاتھ سے نکل جانے کے بعد وہ دوسروں کی جائداد پر ڈاکے ڈالنے لگا اور آہستہ آہستہ شیطان سنگھ بن گیا۔

کہتے ہیں شیطان سنگھ نے آج تک کسی غریب کو نہیں لوٹا تھا۔ غریبوں کے پاس تھا ہی کیا لوٹنے کے لیے۔ ہاں راجہ کے افسروں سے اور ساہوکاروں سے اُس کی پرانی دشمنی تھی۔ اُن کے ہاں وہ ڈاکہ ڈالتا تھا اور جب ڈاکہ ڈالتا تھا پہلے سے اطلاع دے کر۔ ساہوکار اور اُن کے کارگزار اُن کے خزانوں کی لاکھ حفاظت کرتے لیکن شیطان سنگھ اپنے ساتھیوں کو لے کر اونٹوں یا گھوڑوں پر سوار دن یا رات میں پہنچ جاتا اور چھاپہ مار کر جو ہاتھ لگتا وہ اُٹھا لے جاتا تھا۔

دو مہینے پہلے وہ ایک ساہوکار کی بیٹی کو اُٹھا لایا تھا جو اُس سے محبت کرتی تھی اور جس نے خبر بھیج کر شیطان کو بلایا تھا۔ اُس کے لیے گوری کی محبت ایک مسئلہ بن گئی تھی۔ کیوں کہ اُس نے آج تک کسی سے محبت نہیں کی تھی۔ وہ تو جہاں موقع ملتا تھا اپنے جذبات کی پیاس بجھا لیتا تھا لیکن گوری پڑھی لکھی تھی، خوبصورت تھی اور مزاج دار تھی۔ اُس کی دلیری اور بہادری کے کارنامے سُن سُن کر اُس پر فریفتہ ہو گئی تھی، اور اب بھی اُس سے عشق کرتی تھی۔ دو چار دن تک تو شیطان اپنے گھر سے نہیں نکلا۔ رات دن گوری کی خاطر و مدارات میں لگا رہا، لیکن پھر اُس نے سوچا اِس طرح تو میں بھوکا مر جاؤں گا۔ گھر سے نہ نکلوں گا تو کھاؤں گا کیا۔ دل پر جبر کر کے وہ گوری سے جُدا ہوا تھا حالانکہ گوری کہتی تھی مجھے بھی اپنی ٹولی میں لے لو اور ایک گھوڑا دے دو لیکن شیطان اپنے ساتھیوں میں اپنی جگ ہنسائی نہیں چاہتا تھا۔ وہ ہمیشہ عورتوں کو ڈاکوؤں کی ٹولی میں لینے کے خلاف رہا تھا۔ اب اگر اُس نے اپنا بنایا ہوا قانون توڑ دیا تو اُس پر سب ہنسیں گے۔ اور یہ وہ برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اِس لیے اُس نے گوری کو بتایا کہ وہ تین چار دن کے لیے جا رہا ہے اور وہ اُس کے ساتھ نہیں آ سکتی۔ گوری نے کہا۔

"لیکن دیکھنا کسی عورت پر نہ ریجھ جانا ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گی!" شیطان نے ہنس کر کہا۔

"تمہاری نظروں کے تیر سے گھائل ہو چکا ہوں۔ اب مجھ پر کسی عورت کا جادو نہیں چل سکتا۔" لیکن گوری نے پھر اُسے یاد دلایا تھا۔ "یہ ہنسی کی بات نہیں ہے، شیطان! میں ساری دنیا کو چھوڑ کر تمہارے پاس آئی ہوں۔ اگر مجھے پتہ چلا کہ تم کسی عورت کی باتوں میں آئے تو میں قسم کھاتی ہوں میں تمہیں اپنے ہاتھ سے گولی مار دوں گی!"

"اچھا بابا مار لینا!" شیطان نے ہنس کر کہا اور اپنی ٹولی کو لے کر چلا آیا۔

مہارانی پھول متی جو رات کو اتنی اچھی کار ڈرائیو کر رہی تھی اس وقت راستہ ہی نہیں بھول گئی تھی اُسے پیاس بھی لگی تھی۔ لیکن ریت کے

اُس سمندر میں پانی کہاں ؟ پانی ساتھ رکھنے کا اُسے
یا اُس کے سپوتوں کو خیال ہی نہ آیا تھا۔

دوپہر ہو جانے کے بعد بھی رانی ریگستان سے نہ نکل سکی تھی۔ جدھر بھی رُخ کرتی ہر طرف ریت کے ٹیلے کھڑے نظر آتے، لیکن ہوا اُن کی شکلیں بدل رہی تھی۔ ابھی ابھی وہ ریت کے پہاڑ تھے۔ چند ہی منٹ میں ریگستان کی تیز ہوا اُنھیں سپاٹ کر دیتی اور ٹیلے دوسری طرف بن جاتے۔

راستے میں اُسے ایک کھنڈر گاؤں بھی ملا۔ وہاں کا کنواں بالکل سوکھا پڑا تھا۔ لوگ پانی نہ ہونے کی وجہ سے گاؤں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ گاؤں کے کھنڈروں میں وہ پریشان پھر رہی تھی۔ مُنہ پر میک اپ اب پگھل رہا تھا۔ بالوں میں اُڑتی ہوئی ریت کی افشاں چھڑکی ہوئی تھی۔ موٹر کے شیشے میں اُس نے اپنی صورت دیکھی تو ڈر گئی۔ یہ کون بڑھیا ہے جس کے چہرے پر جھرّیاں پڑی ہیں اور جھرّیوں میں پسینے اور ریت سے کیچڑ ملا ہوا ہے۔ ایک رات میں اُس کے خضاب سے لگے سیاہ بال پھر سفید ہو گئے تھے۔

اب تو اُس سے چلا بھی نہ جاتا تھا۔ اتنے میں ایک گولی چلنے کی آواز آئی۔ جب بھاگ کر ٹرک کے پاس پہنچی تو دیکھا کہ ایک گولی ٹرک کے اگلے ٹائر میں لگی ہے جس میں سے ہوا نکل رہی ہے۔

"یہ گولی کس نے چلائی ؟" اُس نے ٹائر کی حالت کو دیکھ کر سوچا۔

جیسے کسی نے اُس کے ان سُنے سوال کا جواب دیا ہو۔ شیطان سنگھ کی آواز آئی۔

"شیطان سنگھ نے! تم کون ہو ؟ اور یہاں کیا کرنے آئی ہو ؟"

اُس کے سامنے گھوڑے پر سوار مشہور ڈاکو شیطان سنگھ تھا!

وہ بے حد خوبصورت تھا! مہارانی کے کانوں میں اُس کی مردانگی کے سُنے ہوئے قصے گونجنے لگے۔

لیکن ڈاکو نے مہارانی کو نہ پہچانا تھا۔

پھر وہ بولی۔ "ہم یہاں کیوں آئے ہیں اِس سے کیا غرض۔ تم کون ہوتے ہو، مہارانی پھول متی سے سوال جواب کرنے والے ؟"

"اوہو! تو آپ ہی مہارانی پھول متی ہیں؟"

شیطان ڈاکو نے مہارانی کے چہرے پر جھرّیاں پڑی دیکھیں، اُس کے سفید بالوں کو دیکھا جو اس کے سینے کے اُبھاروں کو سہارا دے رہے تھے۔

کیا یہ وہی حسین عورت ہے جسے شیطان نے گھوڑے پر سوار وجے نگر کے ایک پارک میں دیکھا تھا اور دیکھتے ہی اُس پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ اُس کے بعد کئی بار وہ اُس کے خوابوں میں آئی تھی۔ مدت تک اُس کے ذہن و احساس پر چھائی رہی

غزل

یزدانی جالندھری

دیوان بلڈنگ، کریم اسٹریٹ نمبر ۱، مولا بخش روڈ، مزنگ، لاہور (پاکستان)

کوئی جگنو بھی نہیں کوئی ستارا بھی نہیں
روشنی کا کہیں ہلکا سا اشارا بھی نہیں

جس سے کھا جائے دلِ سادہ محبت کا فریب
اُن کی نظروں میں کوئی ایسا اشارا بھی نہیں

مجھ پہ الزام ہے کیوں حُسن کی رسوائی کا
مَیں نے تو ان کو نگاہوں سے پکارا بھی نہیں

دوستو! اور گرانبارِ وفا تو نہ کرو
میں نے یہ قرض ابھی سر سے اُتارا بھی نہیں

سیلِ غم کشتیِ دل کو نہ بہالے جائے
کوئی ملّاح نہیں، کوئی کنارا بھی نہیں

تجھ کو کیا میری پریشانیِ خاطر سے کہ تُو
کشتۂ غم بھی نہیں، درد کا مارا بھی نہیں

کیوں ترا دل ہے تب و تابِ زمانہ سے تہی
سینۂ سنگ میں کیا کوئی شرارا بھی نہیں

بدگماں کیوں ہیں نہ جانے تری یادیں مجھ سے
تجھ سے غافل تو کوئی لمحہ گزارا بھی نہیں

کس طرح اُس سے ہو اُمیدِ وفا یزدانی
جو ہمارا بھی نہیں اور تمھارا بھی نہیں

تھی، لیکن جب سے گوری اُس کی زندگی میں آئی
تھی مہارانی کو سجھگانے کے خواب آنے بند ہو گئے
تھے۔ لیکن اُس وقت اُسے اِس حالت میں دیکھ
کر شیطان پر شیطان سوار ہو گیا۔ اُس وقت سوال
یہ نہیں تھا کہ مہارانی کا حُسن ناقابلِ تسخیر تھا، بلکہ اُس کا
رُتبہ، اُس کا دبدبہ شیطان کی مردانگی کو جیسے آواز دے
رہا تھا۔ "تم مجھے حاصل نہیں کر سکتے! تم میرے
قابل نہیں ہو!"

یہ شیطان کے لیے ایک چیلنج تھا جس کا
جواب اُسے دینا تھا۔

شیطان نے کہا۔ "مہارانی ہوں گی تو اپنے
گھر کی ہوں گی۔ یہ ریگستان شیطان کی راجدھانی ہے۔
یہاں جو آئے گا اُسے میرے رحم و کرم کی بھیک
مانگنی ہوگی!"

"میں اور تمہاری بھیک مانگوں؟۔
معلوم ہوتا ہے تم ہمارے غصّے سے واقف نہیں
ہو۔ میرا ایک باڈی گارڈ بھی یہاں ہوتا تو تمہیں
اِس گستاخی کا مزا چکھا دیتا!"

لیکن وہ باڈی گارڈ ہے کہاں؟ شیطان
نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی کہ کہیں مہارانی کے محافظ ریت
کے ٹیلوں کے پیچھے نہ چھپے ہوں۔ لیکن وہاں کوئی نہ
تھا۔

مہارانی نے شیطان کو ڈرانے کے لیے
آواز دی۔

"بہت سنگھ! دلاور خاں!"

لیکن آواز ریت کے ٹیلوں سے ٹکرا کر
لوٹ آئی اور کوئی نہ آیا۔

پھر تو شیطان سنگھ شیر ہو گیا!

"مہارانی! تم وہاں اُن کھنڈروں میں
جانا پسند کرو گی یا یہیں ریت کے بستر پر ہم ایک
دوسرے کے دل کی دھڑکنیں سُنیں گے!"

مہارانی نے پھر اپنا غصّہ دکھایا۔ "کیا
بکتے ہو؟"

"میں بکتا نہیں ہوں۔ تمہاری طرح
فرماتا ہوں۔ میں تو تمہیں ایک موقع دے رہا
ہوں اپنی پسند کی جگہ چن لو۔ اگر انکار کرو گی تو پھر
سمجھ لو یہیں ہوگا جو ہونا ہے!"

اب تو مہارانی کی آنکھوں میں مایوسی
کا اندھیرا چھا گیا۔ وہ سوچنے لگی۔ اگر میں نے اپنی
حفاظت کے لیے ایک بھی آدمی زندہ رکھا
ہوتا تو اِس وقت وہ اِس کی حفاظت کر سکتا تھا۔
اُس نے تو اپنی سٹین گن بھی ریت کے سمندر میں
پھینک دی تھی کہ اب اُس کا کوئی کام نہ تھا۔

وہ اُلٹے قدموں، کھنڈروں کی طرف
چلی۔

اب شیطان کے مُنہ پر مسکراہٹ کھیلنے
لگی۔

شیطان بھی گھوڑے سے اُتر آیا۔

وہ مہارانی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

لیکن اِس طرح کہ اُس کا مُنہ ایک دوسرے
کی طرف تھا۔

شیطان لمبے لمبے ڈگ بھر رہا تھا۔

اب اُن کے درمیان فاصلہ کم رہ گیا
تھا۔

شیطان کی گرم سانس مہارانی اپنے چہرے
پر محسوس کر رہی تھی۔ اُس سانس میں ہوس کی
لپک تھی۔

اُس سانس نے مہارانی کے جسم میں بھی
آگ لگا دی۔

کھنڈروں میں پہنچتے ہی پھول منی نے
دبی ہوئی آواز میں کہا۔ "دیر نہ کرو شیطان! وقت
بہت کم ہے۔"

لیکن ابھی تو شیطان کو اپنا بدلہ لینا تھا۔

"نہیں۔ اتنی آسانی سے یہ نہ ہوگا۔ تمہیں میری
خوشامد کرنی ہوگی۔ میرے پیروں کو چھُونا ہوگا!
سمجھیں؟"

مہارانی نے اپنے دل کی دھڑکنوں کو
سنبھالتے ہوئے التجا کی ——— "شیطان
پلیز! اب میری اور ہتک نہ کرو۔ پلیز!"

"نہ کروں؟ اچھا!" یہ کہہ کر شیطان نے
مہارانی کو ایک ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا ——— پھر
دو جسم ایک ہو گئے ——— دونوں کے
دلوں کی دھڑکنیں ہم آہنگ ہو گئیں ———

جب شیطان اپنے جذبات کی آگ
بجھا چکا تو اُس نے مہارانی سے کہا ——— "جب
تمہارے جیون کی پھلواری میں ایک خوبصورت
پھول مُسکرائے تو یاد رکھنا۔ یہ نہ بھولنا وہ
شیطان سنگھ کا بیٹا ہوگا!"

"مجھے اپنے ساتھ لے چلو شیطان سنگھ!
میں تمہاری داسی بن کر رہوں گی!"

لیکن شیطان نے گڑگڑاتی ہوئی پھول متی
کی درخواست کو ٹھکرا دیا۔ "چل ہٹ تو تو اب
جان کا جنجال بن گئی ہے۔ مجھے بوڑھی عورت سے
سخت نفرت ہے۔ مجھے تو تیری ہیکڑی نکالنے
میں دلچسپی تھی۔ تجھ میں نہیں۔ جا اور کوئی بوڑھا
تلاش کر! اپنی عمر کا یا اِس سے بھی بڑا۔ وجے نگر
میں ایسے بوڑھے بہت مل جائیں گے۔"

یہ کہہ کر شیطان اپنے گھوڑے پر سوار
ہو کر چلا گیا۔ لیکن اُس نے اپنے ساتھیوں کو گِنا
نہیں کہ اُن میں سے ایک آدمی کم تھا۔ وہ لایا تھا
دس آدمیوں کو اور اِس وقت صرف نو تھے۔ وہ
دسواں اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا سیدھا
اُن کے گاؤں کو چلا جا رہا تھا۔ وہ گوری کا جاسوس
تھا۔ اُس سے گوری نے کہا تھا اگر وہ شیطان
کے شیطانی کرتوتوں کو آ کر اُسے بتائے گا تو وہ

سو روپے دے گی۔

گاؤں کے پاس وہ پہنچے تو دیکھا گوری اُن کے سواگت کو پہلے سے کھڑی ہے۔ لیکن شیطان کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ گوری کے ہاتھ میں بندوق ہے!

"کیوں شیطان؟ مہارانی کیسی لگی۔ ہ؟"

شیطان نے اب اپنے ساتھیوں پر نظر ڈالی۔ یہ خبر کس نے پہنچائی گوری کو؟ اب اُسے بہادر سنگھ کی کمی محسوس ہوئی۔ اُس نے دل ہی دل میں اُسے کوسا اور جب جھوٹ بولنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو گوری سے صاف کہہ دیا۔

"ارے تیری برابری کیا کرے گی وہ بڈھی مہارانی! وہ تو ....."

"اپنا وعدہ یاد ہے نا؟ اور میرا وعدہ بھی؟"

یہ کہہ کر گوری نے بندوق اُٹھا کر لبلبی دبا دی۔ شیطان گولی کھا کر گھوڑے سے گر پڑا۔

اب گوری پاگل ہو گئی۔ اُس نے بندوق اُٹھا کر پھینک دی۔ اور دوڑی شیطان کی طرف۔ شیطان کی چھاتی ہی سے نہیں اُس کے منہ سے بھی خون نکل رہا تھا۔

گوری نے اپنے ہونٹوں کو اُس کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔

"جانی شیطان! تُو نے یہ کیوں کیا ہے بول؟ تجھے مجھ سے پیار نہیں تھا نا؟ جو کچھ مجھ سے کہتا تھا وہ جھوٹ تھا نا؟ مہارانی کی گوری چمڑی پر فریفتہ ہو گیا؟"

"نہیں گوری! پیار تو صرف تجھ سے تھا۔ اُس کی تو ہیکڑی توڑنی تھی مجھے۔ اگر تُو وہاں ہوتی تو تُو بھی مجھ سے کہتی۔ شیطان اُس کی ہیکڑی نکال دے! آخری وقت میں میں تجھ سے جھوٹ نہ بولوں گا۔"

اُس نے یہ کہا اور ایک آخری ہچکی آئی اور وہ مر گیا۔

اب گوری بندوق ہاتھ میں لے کر کھڑی ہو گئی۔

"بولو۔ ساتھیو! اب مجھے کیا سزا دینا چاہتے ہو؟"

ایک ڈاکو بولا۔ "شیطان سنگھ مر گیا۔ اب تو تم ہی ہماری سردار ہو!"

"تو اُٹھاؤ شیطان کی لاش کو۔ یاد رکھو۔ یہ تمہارا سردار تھا۔ اس کا کریا کرم بڑی شان سے کیا جائے گا۔"

چوتھا باب

بوڑھا

بوڑھا کٹھ پُتلی والا کلّو سر پر اپنی کٹھ پُتلیوں کا ٹوکرا اُٹھائے ہوئے تھا۔ اُس کی کمر کے گرد ایک پیٹی بندھی تھی۔ جس میں چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ جب وہ چلتا تھا تو گھنٹیوں کی آواز دُور تک جاتی تھی۔

مہارانی جو اب پھر اپنی موٹر میں سے سٹین گن لے کر کھڑی ہوئی تھی اُس نے جب گھنٹیوں کی آواز سُنی تو سٹین گن کا خونی منہ اُدھر کر دیا جدھر سے آواز آ رہی تھی۔ وہ گھنٹیوں کی آواز کو خطرے کا نشان سمجھتی تھی۔ کیونکہ شیطان کی ٹولی کے اونٹوں کی گردن میں بھی ایسی ہی گھنٹیاں پڑی ہوئی تھیں۔

بوڑھا کٹھ پُتلی والا جو ریگستان میں پڑی نو لاشوں کو دیکھ کر پہلے ہی ہراساں ہو گیا تھا۔ اپنے گاؤں کی طرف جلدی جلدی قدم بڑھا رہا تھا۔ اُس نے جب دُور سے مہارانی کو بندوق ہاتھ میں لیے ہوئے کھڑی دیکھا اور بندوق اپنی طرف تنی ہوئی دیکھی تو بھاگ کھڑا ہوا۔ اُس نے ایک بار راج محل میں کٹھ پتلیوں کا تماشہ مہارانی کے سامنے دکھایا تھا۔ اِس لیے وہ مہارانی کو پہچانتا تھا۔ حالانکہ اُس وقت وہ مہارانی نہیں معلوم ہوتی تھی، لیکن بوڑھے کی جہاں دیدہ آنکھوں نے دیکھ لیا تھا کہ مہارانی کے پینٹ اور پاؤڈر اور کالے بالوں کے نیچے بھی اُس کا یہی چہرہ چھپا ہوا تھا۔

وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ مہارانی نے سٹین گن سے گولیوں کی بوچھار کر دی لیکن نشانہ لگانے کے لیے فاصلہ دُور تھا۔ اِس کے علاوہ شیطان سے جُدا ہونے کے بعد مہارانی کے ہاتھ پاؤں ابتک قابو میں نہیں تھے۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کہیں سٹین گن سنبھالی جا سکتی ہے۔ بوڑھے نے اپنے قریب ہی گولیوں سے ریت اُڑتی ہوئی دیکھی اور سر پر پیر رکھ کر بھاگا۔

وہ بھاگتا ہی چلا گیا یہاں تک کہ اپنے گاؤں میں، اپنے جھونپڑے میں گر کر بے ہوش ہو گیا۔ لیکن بے ہوش ہونے سے پہلے ہی وہ اپنی بیٹی سونو کو آواز دے رہا تھا۔ بے ہوشی میں بھی اُس کے سوکھے ہونٹ سونو! سونو! پکارتے رہے۔

سونو اپنی سہیلیوں کے ساتھ دُور کے ایک گاؤں میں پانی بھرنے گئی تھی۔ جب وہ اپنے جھونپڑے میں پہنچی تو باپ کو بے ہوش پڑا دیکھا۔ اُس کے سر سے گھڑا گر کر ٹوٹ گیا۔ لیکن سارا پانی ریت میں جذب ہونے سے پہلے اُس نے تھوڑے پانی کا چھینٹا باپ کے منہ پر مارا۔ پانی پڑتے ہی بوڑھے کی آنکھیں کھلیں اور اُس کے ہونٹ ہلے۔

"سونو یہاں سے بھاگ چالاں۔ آپنی مہارانی پاگل ہو گئی ہے اور وہ تو منکا نے مار کا بھی ہے۔ میوں بھرت پور سے آئو تو راتے میں نو منکاری

ایک بہت مختصر کہانی

تین عورتیں اور ایک ریل

خواجہ احمد عباس

تین عورتیں ایک ریل کی پٹری پر چل رہی تھیں۔

ایک عورت نے (جو میلے چیتھڑے پہنے ہوئے بھکارن تھی) کہا "میں تو اس زندگی سے تنگ آگئی ہوں۔ چند منٹ میں فرنٹیئر میل آنے گی تو اُس کے نیچے آکر جان دے دوں گی۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

ماں نے کہا جس کی گود میں تین ماہ کا بچہ تھا "ہاں۔ ہاں۔ ضرور۔ بہت اچھا خیال ہے۔ اس ننھی سی جان کا بھی کام تمام ہو جائے گا۔ جس کے باپ کا ہی پتہ نہیں تو وہ جی کر کیا کرے گا۔"

مگر تیسری عورت جو جوان تھی اور جس کے بدن میں جوانی کا قہر اور آنکھوں میں جوانی کا خمار تھا بولی "اری بیوقوفو کیوں اپنی جان کی دشمن ہوتی ہو۔ زندگی جیسی قیمتی چیز کو قربان کرنا چاہتی ہو۔ میں تو زندہ رہنا چاہتی ہوں۔"

"مگر ہمارا تمہارا ساتھ تو بچپن سے ہے۔" بھکارن نے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم مر جائیں اور تم زندہ رہو؟"

"ہاں ہاں" ماں بولی "اب مرنے کی ٹھان لی ہے تو سب کو ساتھ ہی مرنا ہوگا۔"

اتنے میں دوسری طرف سے سیٹی بجائی۔ چھک چھک کرتی ہوئی فرنٹیئر میل چلی آرہی تھی۔

انجن ڈرائیور نے بڑے زور سے سیٹی بجائی۔ جوان عورت بھاگنا چاہتی تھی لیکن بھکارن اور ماں نے اُس کا دامن پکڑ لیا جسے وہ چھڑا نہ سکی۔

اگلے لمحے فرنٹیئر میل نے بریک لگانے لگاتے اُن کو کچل ڈالا۔

دفعتاً بریک لگانے کے جھٹکے سے مسافر جو اونگھ رہے تھے یا سو رہے تھے اُٹھ بیٹھے۔ جھانک کر باہر دیکھنے لگے کہ کیا ہوا ہے۔

دو چار من چلے نیچے بھی اُتر گئے کہ خود معائنہ کریں کہ ریل کیوں رُک گئی ہے۔

واپس اپنے درجے میں آکر انھوں نے کہا: "ایک عورت اور اُس کا بچہ ریل کے نیچے آگئے ہیں۔ بھکارن جیسے کپڑے پہنے ہوئے تھی مگر تھی جوان اور خوبصورت!" ●●

لاشیاں پڑی ہوئی تھیں۔ مہارانی نہارے اور بھی کوملی دے میلی۔ وہ تو جان تھی لے ناتا ملے بجائی ہو۔ مگر پاگل مہارانی کا کائیں بھروسہ۔ اُٹھے بھی آدمی تو کوئی دھرتی نہیں۔ تو سٹ کے تیار ہو لے۔ رات کے اندھیرا ماں نکل بھاگ سیں۔"

سویرا ہوتے بوڑھے نے اپنے سر پر کٹھ پتلیوں کا ٹوکرا اُٹھایا اور سونو نے اپنے اور اپنے باپ کے کپڑوں اور جھونپڑوں کا انبار اُٹھایا اور دونوں ریگستان سے پرے جدھر سے ریل کی چھوٹی لائن بھرت پور جاتی تھی اُدھر چل پڑے۔ بوڑھا کٹھ پتلی والا کلو ستاروں کے سہارے سفر کرنے کا عادی تھا۔ اُنہی پر بھروسہ کرکے چلتا رہا۔ یہاں تک کہ صبح سویرے دُور سے اُنھیں بھرت پور کا اسٹیشن اور چھوٹی لائن کی ریل دکھائی دی

ساری رات ریگستانی ہوا چلتی رہی۔ ہوا ریت کو اُڑا کر کہیں سے کہیں لے جاتی رہی۔

جہاں لاشیں پڑی تھیں اُن کے اوپر ریت کا ایک ٹیلہ بن گیا۔ اُس ریت کی قبر میں سے صرف بوڑھے جوتشی کا ایک ہاتھ دبے ہوئے خزانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نکلا رہا۔

اُس جگہ سے میلوں دُور مہارانی کی ٹرک ریت کے سمندر میں ڈوب گئی۔ پہیّوں میں گولیاں لگی تھیں۔ اب پٹرول ختم ہو چکا تھا۔ اب وہ چلنے کے قابل ہی نہ تھی۔ جب صبح ہوئی تو مہارانی کے منہ پر بالوں میں، سارے بدن پر ریت کا غازہ مل گیا تھا۔ لیکن وہ اب بھی موٹر میں اسٹرنگ وہیل پر ایسے بیٹھی تھی جیسے موٹر چلا رہی ہو۔

وہیں راجستھان پولیس نے مہارانی کو ٹرک سمیت گرفتار کر لیا۔ اب وہ بالکل پاگل ہو گئی تھی۔

لیکن جب اُس سے خزانے کے بارے میں پوچھا گیا تو وہ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگی۔ "ڈھونڈو اُسے۔ میں نے سمندر میں ڈبو دیا ہے۔ سمندر میں غوطہ لگاؤ اور نکالو اُسے؟"

مہارانی کو پکڑ کر وجے نگر واپس لایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے کہا یہ بالکل پاگل ہو چکی ہے۔ نہ کھاتی ہے نہ پیتی ہے۔ نہ خزانے کا پتہ بتاتی ہے۔ اُس کے بال سفید ہو چکے ہیں۔ چہرے پر جھرّیاں پڑ چکی ہیں۔ جب کبھی کوئی اُس سے اُس کے خزانے کا پتہ پوچھتا ہے تو خوفناک مسکراہٹ میں اُس کے ہونٹ کھُل جاتے ہیں ——— "ڈھونڈو۔ ڈھونڈو اُسے اگر ڈھونڈ سکتے ہو!"

(اگلی قسط اگلے شمارے میں)

غزلیں

حسن بھوپالی

۱۴ الف ۵/۱۳ اے ناظم آباد۔ کراچی ۱۸ (پاکستان)

★

تو کبھی خود کو بے خبر تو کر
اپنی جانب بھی اک نظر تو کر
آئینہ آئینہ ترا پرتو!
آئینہ آئینہ گزر تو کر
وقفۂ عمر ہے کہ عرصۂ حشر
اس مسافت کو مختصر تو کر
میں نے جس طرح زیست کاٹی ہے
ایک دن ہی سہی بسر تو کر
رہبری کا بھرم بھی رکھ لوں گا
مجھ کو مانوسِ رہ گزر تو کر

۸/۱۷ ولایت آباد، منگھو پیر روڈ کراچی ۲۴ (پاکستان)

★

کوئی سمجھائے چشمِ پُرنم کو
یوں نہ رو رو کے طُول دے غم کو
زندگی فرشِ راہ ہے اے دوست
دل ہے بیتاب خیرمقدم کو
جاں سے بڑھ کر عزیز ہے ترا غم
جاں ہو اپنی عزیز کیوں ہم کو
آئے تھے خود دیارِ غیر میں ہم
کچھ کسی سے گلہ نہیں ہم کو
ہم سے ہے تیری بزم کی رونق
نہ اُٹھا اپنی بزم سے ہم کو
کس محبت سے چومتی ہے نسیم
عارضِ گل بہ اشکِ شبنم کو

دفتر مارکیٹ کمیٹی گوجرانوالہ (پاکستان)

★

شاید ہو نخلِ خواب ثمر بار اس برس
اُس نے کیا ہے تیسواں سنگھار اس برس
بیلوں سے لہلہائے گھروں پہ بسنت رُت
پھولوں سے لَس اٹھیں در و دیوار اس برس
آنگن تمام رنگ سے ہوں کشتِ زعفراں
چوپال خوشبوؤں سے ہوں گلزار اس برس
پوتوں پھلے نگارِ وطن تیری سرزمیں
دُودھوں نہائیں کوچہ و بازار اس برس
کچھ اور خم کریں مرے جذبے سرِ نیاز
کچھ اور سرفراز ہوں افکار اس برس


خوش باش
بیبیاں
کھانا پکانے کے لیے بہترین ذریعہ
کو ترجیح دیتی ہیں...
اجنتا
وناسپتی
لذیذ ترین کھانا پکانے اور بہترین پکوان کی تیاری میں بے شمار عورتیں اجنتا وناسپتی
استعمال کرتی ہیں۔ کیونکہ یہ صحت کے لیے مفید ہے۔
وٹامن سے بھرپور اور حفظانِ صحت کے اصولوں کے تحت تیار کردہ
اجنتا وناسپتی کو سگھڑ بیبیاں ترجیح دیتی ہیں۔
JSV
جین شدھ وناسپتی لمیٹڈ
۱۰۱۔ آکاش دیپ بلڈنگ
بارہ کھمبا روڈ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱
AJANTA
VANASPATI
MADE FROM VEGETABLE OILS ONLY
AJANTA
VANASPATI

موت کا خواب

اظہار اثر

تو آخر میرا انجام آ پہنچا ہے۔ آج کہانی ختم ہونے والی ہے! کل رات وہ میرے خواب میں آئی تھی اور کہہ رہی تھی "کل" یعنی آج میری سالگرہ کے دن وہ مجھے لینے آئے گی۔

آج رات واقعی موت کی رات ہے۔ بھیانک ۔ خوفناک اور ہیبت ناک رات! باہر پُرشور۔ بادل گرج رہے ہیں۔ بجلی کی چمک ایک لمحہ کے لیے آگ سی لگا کر چھُپ جاتی ہے۔ موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ ٹیبل کے سرے پر رکھے لیمپ پر صرف ایک پروانہ ہے جو شیشے سے ٹکرا ٹکرا کر گرتا ہے۔ اور پھر بلب کے جلتے ہوئے ریشے تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔

بالکل ایسی ہی وہ رات تھی جب یہ کہانی شروع ہوئی تھی۔

ایسی ہی طوفانی، خوفناک ۔ بھیانک رات ۔ اُس رات بھی بادل اِسی طرح گرج رہے تھے۔ بجلی اِسی طرح آگ لگا رہی تھی۔ بادل اِسی طرح ٹوٹ کر برس رہے تھے۔

اور بالکل اِسی طرح ایک لیمپ سرائے کے اِس کمرے میں روشن تھا۔ وہ لیمپ مٹی کے تیل کا تھا اُس روز بھی ایک پروانہ لیمپ کے شعلے تک پہنچ کر جان دینے کی کوششوں میں مصروف تھا اور میں بستر پر لیٹے لیٹے اُس پروانے کے کھیل کو دیکھتے دیکھتے سو گیا تھا۔

اُس روز میرے دل میں کوئی خوف نہ تھا۔

آج میں خوفزدہ ہوں۔ کیونکہ مجھے یقین ہے وہ آئیگی۔ وہ ضرور آئے گی!

وہ اُس رات بھی آئی —— اُس پہلی رات میں جب اچانک اس کہانی کی ابتدا ہوئی تھی۔

اُس دن میں جیت گڑھ سے واپس آ رہا تھا —— رات کافی ہو چکی تھی —— میں جس دوست سے ملنے گیا تھا اُس نے بادل دیکھ کر مجھے روکنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن میں نہ مانا تھا۔ مجھے یقین تھا بارش آنے سے پہلے سندر گڑھ پہنچ جاؤں گا۔ میرے پاس ایک سیکنڈ ہینڈ کار تھی جو چلتے میں اپنی آواز سے آدھا میل آگے تک لوگوں کو ہوشیار کر دیتی تھی۔ پھر بھی مجھے امید تھی کہ راستہ میں کار دھوکا نہ دے گی۔

لیکن کار نے دھوکا دے دیا —— شکر کی بات یہ تھی کہ وہ ایک گاؤں کے قریب خراب ہوئی تھی۔ سفر ابھی سترہ اٹھارہ میل کا باقی تھا اس لیے مجبوراً مجھے گاؤں میں رات گزارنے کے لیے ٹھکانہ تلاش کرنا پڑا۔

میں خوش قسمت تھا کہ اُس گاؤں کے سرے پر ہی ایک سرائے نما ہوٹل تھا —— یا ہوٹل نما سرائے تھی۔ سرائے کا مالک لمبی لمبی مونچھوں والا ایک چھ فٹ کا ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ اُس نے مجھے ایک کمرہ دے دیا۔ مٹی کے تیل والے لیمپ کی روشنی میں مجھے کمرہ دکھاتے ہوئے اُس نے کہا تھا۔

7-5- ڈی ڈی اے کالونی
نیو رنجیت نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۸

●

محترمی نیّر صاحب!

آداب —— "بیسویں صدی" کے لیے ایک پراسرار کہانی (موت کا خواب) ارسال کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ پسند فرمائیں گے۔ میری خواہش ہے کہ "بیسویں صدی" کے قارئین اس کہانی کے بارے میں اپنی رائے دیں۔ اگر یہ کہانی پسند کی گئی تو آئندہ بھی اس طرح کی کہانیاں لکھنا چاہوں گا۔

اظہار اثر

"یہ میرے ہوٹل کا سب سے اچھا کمرہ ہے۔ اِسے بڑے بڑے افسروں ہی کو ٹھہرنے کے لیے دیتا ہوں۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ آج رات آپ اِس کمرے میں سوئیں گے۔"

اُسی خوش قسمتی سے مجھے کچھ کھانا بھی سرائے میں مل گیا جو سرائے کے مالک کی بیوی کے نہ کھانے کی وجہ سے بچ گیا تھا۔

سرائے کی عمارت پختہ تھی۔ جس کا پھاٹک بہت مضبوط تھا۔ پھاٹک اندر سے بند کرکے اُس کا مالک لوہے کی ایک موٹی سی سلاخ دروازے میں اِس طرح پھنسا دیتا تھا کہ ہاتھی بھی ٹکر مارے تو دروازہ نہ کھلے۔ میں نے اُس سے ہنس کر پوچھا تھا۔

"تم نے تو سرائے کا دروازہ اتنا مضبوط بنایا ہے جیسے یہاں خزانہ چھپا ہوا ہو!"

"یہ علاقہ خطرناک ہے بابوجی"

سرائے کے مالک نے جواب دیا تھا —— سرائے میں میں اور میری بیوی صرف دو آدمی رہتے ہیں مسافروں کے سامان کی دیکھ بھال بھی ہمارا ہی فرض ہوتا ہے۔ چاروں طرف جنگل ہے ڈاکوؤں کا گڑھ ہے یہ جنگل اِس لیے میں اپنا انتظام کرکے سوتا ہوں —— آج اتفاق سے آپ اکیلے مسافر ہیں۔

اس کے بعد وہ مجھے میرے کمرے تک چھوڑ کر اپنے رہائشی حصّہ میں چلا گیا۔

سرائے کی عمارت کافی بڑی تھی۔ پورا مکان سائیں سائیں کر رہا تھا۔ میں نے کونے میں رکھا ہوا لیمپ روشن کرکے دروازہ بند ہی کیا تھا کہ اچانک بادل اتنی زور سے گرجا کہ میرا دل دہل گیا۔

لیکن میں خوفزدہ نہ ہوا تھا۔ میں نے گھوم کر بستر کو دیکھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ بستر صاف اور بے داغ تھا۔ بانوں کی بُنی چارپائی پر ایک گدّا تھا۔ گدّے پر سفید چادر تھی تکیہ تھا۔ اوڑھنے کے لیے بھی ایک چادر پائنتی کی طرف رکھی تھی۔

میں لیٹ کر سونے کی کوشش کر رہا تھا کہ میری نظر لیمپ کے گرد گھومنے والے اُس پر وانے پر پڑ گئی۔ اور پروانے کا کھیل دیکھتے دیکھتے ہی نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

کہانی کی ابتدا یہاں سے ہوئی ——

نہ جانے کب بادل کی گرج سے میری آنکھ کھل گئی۔

لیمپ میں شاید تیل ختم ہو گیا تھا۔ کیونکہ بتّی جلتے جلتے ذرا سی رہ گئی تھی۔ اور کمرے میں پُراسرار مدّھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

اچانک بجلی چمکی۔ کھڑکی سے بجلی کی تیز روشنی اندر بھر گئی۔

اُس وقت میری نظر اُس پر پڑی۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا وہ بجلی مجھ پر گری ہو!

میرے دل کی دھڑکن چند لمحوں کے لیے رُک گئی تھی۔ خوف کی پھریری ریڑھ کی ہڈّی سے اُبھری اور سارے بدن میں پھیل گئی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے میں نے بستر پر لیٹنے سے پہلے دروازہ اندر سے بند کیا تھا۔ دروازہ اب بھی بند تھا۔ کم روشنی میں یہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ اُس کی چٹخنی کھلی تھی یا بند تھی۔

وہ دروازہ اور پلنگ کے درمیان کھڑی تھی۔

وہ —— ایک عورت —— جو سفید ساری میں لپٹی ہوئی تھی۔ اُس کے بھونرے جیسے کالے بال کاندھوں پر بکھرے ہوئے اُس کے کولھوں کو چھُو رہے تھے۔

اُس کا رنگ دودھ کی طرح سفید تھا۔ آنکھیں کالی کالی تھیں جن میں سفیدی بجلی کی طرح چمکتی تھی۔ اُس کے بائیں گال پر ایک مسّہ تھا۔ ہونٹ سُرخ تھے۔ گہرے سُرخ! لیکن یہ سُرخی لپ اسٹک کی نہیں تھی۔ نہ جانے کیوں اُس پر پہلی نظر پڑتے ہی مجھے یہ احساس ہو گیا تھا کہ یہ سُرخی لپ اسٹک کی نہیں ہے۔

شاید وہ سُرخی خون کی تھی۔

ہاں مجھے ایسا ہی احساس ہوا تھا کہ یہ خون کی سُرخی ہے۔ اور اِس احساس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اُس کے ہاتھ میں ایک تیز چمکدار خنجر تھا۔ خنجر کا دستہ اُس کی مُٹھی میں تھا۔ خنجر کا پھل سات آٹھ انچ لمبا ہوگا۔ موٹھ کا ایک سرا مُٹھی سے باہر نکلا تھا۔ شاید اُس کے دستے پر جواہرات لگے تھے۔ کیونکہ موٹھ کا سرا نیلم کی طرح نیلا نیلا چمک رہا تھا

میرے بدن میں خوف سے جیسے لہو نہیں رہا تھا۔ اُس کی نظروں سے نظریں ملتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نامعلوم شے نے میرے جسم کی ساری قوت چھین لی ہو۔ میں آنکھیں پھاڑے ساکت اُسے دیکھ رہا تھا۔ میرے اندر رگوں میں جیسے برف سی بھر گئی تھی۔

اچانک وہ آگے بڑھی —— اور میرے دل کی دھڑکن پھر شروع ہو گئی۔ دل اُچھلنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ میری طرف قدم بڑھا رہی تھی۔ اُس کا خنجر والا ہاتھ اوپر اُٹھتا جا رہا تھا —— میں نے سوچا۔

'یہ مجھے قتل کرنے آئی ہے'۔

لیکن میں بے بس پڑا تھا۔ وہ آہستہ چلتی ہوئی میرے پلنگ کے بائیں جانب سے آئی۔ میرے قریب آکر رُک گئی۔ اُس کا اوپر اُٹھا ہوا ہاتھ تیزی سے نیچے آیا۔

شاید یہ موت کا خوف تھا کہ اچانک میرے جسم میں حرکت پیدا ہو گئی۔ میں پھرتی سے دائیں طرف سرک گیا۔ اُس کا خنجر مجھ سے صرف ایک انچ کے فاصلے پر بستر میں گھس گیا۔

صرف دیکھ سکتا تھا کوئی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے بڑے اطمینان سے خنجر بستر سے نکالا۔ اور دروازہ کی طرف واپس چلی گئی۔ میرا خوف ذرا کم ہوا لیکن دروازے کے پاس پہنچ کر وہ پھر رُک گئی وہ پلٹی اور اس بار دائیں طرف سے میری طرف آئی۔ اُس کا خنجر والا ہاتھ پھر اُٹھنے لگا تھا۔ اس بار بجھتے ہوئے لیمپ کی مدھم روشنی اُس کے کھلے بازو پر پڑی تو میں نے دیکھا اُس کی کہنی سے ذرا اوپر گہرے لال رنگ کا ایک داغ سا تھا۔

وہ پھر میرے قریب تھی۔ باہر سے میرا جسم ساکت تھا۔ لیکن اندر دل بُری طرح اُچھلنے لگا تھا۔

اُس کا ہاتھ پھر تیزی سے نیچے آیا۔ اور پھر عین وقت پر میرے جسم میں حرکت ہو گئی۔ اس بار میں بائیں طرف سرک گیا اور خنجر پھر دو انچ کے فاصلے پر بستر میں گھس گیا۔

اُسی وقت اچانک لیمپ بجھ گیا۔

ساتھ ہی میرے مُنہ سے تیز چیخ نکلی۔ میں اُچھل کر بستر پر کھڑا ہو گیا۔ اور چھلانگ لگا کر دروازہ تک پہنچا۔

میرے مُنہ سے مسلسل چیخیں نکل رہی تھیں۔

"بچاؤ ـــ! بچاؤ ـــ!!"

میں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ گھبراہٹ میں مجھ سے دروازہ بھی نہ کھل سکا۔ گھبراہٹ میں میں یہ بھی نہ دیکھ سکا کہ دروازہ اندر سے بند ہے اور یہ بھی نہ سوچ سکا کہ دروازہ بند ہے تو وہ عورت اندر کیسے آئی تھی۔

اُسی وقت سرائے کے مالک کی آواز سُنائی دی۔

"بابو جی کیا بات ہے ـــ دروازہ کھولو!"

اُسی وقت بجلی چمکی اور میں نے خوفزدہ نظروں سے اُدھر دیکھا جدھر وہ عورت کھڑی تھی۔ کمرے میں میرے علاوہ کوئی نہ تھا۔

میں اور زیادہ خوفزدہ ہو گیا۔ سرائے کے مالک کی آواز سُن کر مجھ میں کچھ ہمت آ گئی تھی اس لیے میں دروازہ کھول کر باہر نکل گیا اور سرائے کے مالک کا بازو تھام کر بولا۔

"وہ ـــ وہ ـــ وہ مجھے قتل کرنے آئی تھی!"

"کون ـــ؟" سرائے کے مالک نے حیرت سے پوچھا۔

"پتہ نہیں کون ہے۔ اُس کے ہاتھ میں خنجر ہے اُس نے دو بار مجھ پر خنجر چلایا ہے۔ لیکن میں بچ بچ گیا ہر بار خنجر بستر میں گھس گیا۔"

"مگر بابو جی سرائے میں میرے اور میری بیوی کے سوا کوئی نہیں۔" سرائے کے مالک نے حیرت سے کہا۔

"لیکن وہ میرے کمرے میں ہے۔ اس نے مجھ پر حملہ کیا تھا ـــ" میں نے احتجاج کیا۔

"جبکہ آپ کا دروازہ اندر سے بند تھا!" سرائے کے مالک نے طنز بھری آواز میں کہا۔

"آپ نے یقیناً خواب دیکھا ہے ٹھہریے میں لیمپ لاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلا گیا۔ دو ہی منٹ بعد وہ ایک روشن لیمپ لایا اور میرے کمرے میں چلا گیا۔ ایک منٹ بعد اندر سے بولا۔

"یہاں تو کوئی بھی نہیں۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ میں جھانکا اور ہکلاتے ہوئے کہا۔

"م ـــ م ـــ مگر وہ یہیں تھی جہاں آپ کھڑے ہیں۔"

"آپ کہتے ہیں اُس نے آپ پر دو بار خنجر چلایا تھا ـــ سرائے کے مالک نے مجھے دیکھتے

"جی ہاں ـــ"

"اور وہ خنجر دونوں بار بستر میں گھس گئے تھے ـــ؟"

"جی ہاں ـــ"

"تو بستر میں خنجر کے سوراخ ہونے چاہئیں۔ آئیے دیکھ لیجیے بستر بالکل ٹھیک ہے۔ ضرور آپ نے کوئی خواب دیکھا ہے۔"

"میں قسم کھانے کو تیار ہوں وہ خواب نہیں تھا۔" لیکن واقعی بستر پر کوئی نشان نہیں تھا جبکہ میرے سامنے دو بار خنجر بستر میں گھسا تھا۔

"میں اب اس کمرے میں نہ سوؤں گا۔" میں نے کہا۔ معاملہ واقعی پُراسرار تھا۔ ایک طرف میں نے جاگتے میں وہ سب منظر دیکھا تھا۔ دوسری طرف اُس کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ یہ بات بھی سمجھ میں نہ آتی تھی کہ دروازہ اندر سے بند تھا پھر وہ عورت اندر کیسے آ گئی ـــ؟

"شاید میرا خواب ہی ہو گا۔"

میں نے خود کو تسلی دی اور سرائے کے مالک کو مجبور کیا کہ آج کی رات وہ مجھے اپنے کمرے میں سُلا لے۔ سرائے کا مالک شریف آدمی تھا۔ اُس نے اپنی بیوی کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ اور مجھے اپنے کمرے میں سُلا لیا۔

یہ اُس کہانی کی ابتدا تھی۔

دوسرے دن مجھے یاد آیا کہ وہ میری سالگرہ کی رات تھی۔

میرے پورے خاندان میں صرف میری ماتاجی زندہ ہیں۔ نور پور میں ہمارا مکان تھا۔ یہ ہمارا آبائی مکان نہیں تھا۔ پتاجی کی موت کے بعد ماتاجی نے اپنا بڑا مکان بیچ کر ایک مکان خریدا تھا۔ پتاجی کی اچانک موت

پھول اور کانٹے

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کیے جا رہا ہوں میں
— جگر

ٹھہر کے پاؤں سے کانٹے نکالنے والے
یہ ہوش ہے تو جنوں کامیاب کیا ہوگا
— راز

ہم نے کانٹوں کو بھی نرمی سے چھوا ہے لیکن
لوگ بے درد ہیں جو پھولوں کو مسل دیتے ہیں
— مخمور سعیدی

اس وقت اُٹھاؤ نہ گل و خار کے جھگڑے
تہذیبِ چمن کیا ہے بہاروں میں کہیں گے
— اختر

تم نے پھولوں کو نوازا میں نے کانٹوں کو چنا
غالباً دونوں ہی تھے ناآشنا انجام سے
— انجم فوقی

مرسلہ: عبدالرشید رضا، راجوری ضلع بلڈانہ

ے سات مہینے بعد اور اُس مکان میں نے کے ایک مہینہ بعد میں پیدا ہوا تھا میرے ہوا ہونے کے تین ہی مہینے بعد ماتاجی نے وہ کان بیچ کر ایک اور چھوٹا سا مکان خرید لیا تھا جس میں اب وہ رہتی ہیں ماتاجی نے مسلسل مکان کیوں بدلے تھے اس کا مجھے کوئی علم نہ تھا کیونکہ یہ میرے سمجھ دار ہونے سے پہلے کی باتیں ہیں۔

سرائے میں وہ پُراسرار واقعہ ہونے کے ایک سال بعد میں ماتاجی سے ملنے گیا۔ ماتاجی اپنی دیکھ بھال کے لیے ایک بوڑھی عورت کو نوکر رکھے ہوئے تھیں۔ ایک دن رات کے کھانے کے بعد جو خوابوں کا ذکر چل آیا تو میں نے ماتاجی کو سرائے کا وہ واقعہ سُنایا۔

اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس عورت کا ذکر سُن کر ماتاجی خوفزدہ ہوگئی ہوں اُن کا چہرہ کاغذ کی طرح سفید پڑ گیا۔ اور آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔ میں چپ ہوا تو ماتاجی نے کہا۔

"ذرا اُس عورت کا حلیہ پھر بتانا۔"

میں نے بتایا "اُس کا دودھ جیسا سفید رنگ تھا۔ اُس نے سفید ہی ساڑی پہن رکھی تھی۔ کالے کھلے بال کاندھوں پر پڑے تھے۔ ہونٹ سُرخ تھے۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ ہاتھ میں خنجر تھا۔ خنجر کی موٹھ نیلی تھی۔ اُس کے دائیں ہاتھ کی کہنی کے اوپر گہرا لال داغ تھا۔"

"ہے بھگوان!" میری ماتاجی کے مُنہ سے نکلا "یہ کیسا سپنا تھا۔؟"

"کیوں ماتاجی! آپ اتنی پریشان کیوں ہوگئی ہیں؟ وہ واقعی سپنا تھا۔؟"

"ہاں۔ ہاں سپنا ہی تھا" ماتاجی نے جلدی سے کہا "اب تو رات کو کبھی اُس سرائے میں مت ٹھہرنا۔"

"اچھا ماتاجی۔"

بات آئی گئی ہوگئی۔ میں پھر سُندر گڑھ آگیا جہاں میرا جواہرات کا چھوٹا سا بزنس تھا۔

اس بات کو سات سال ہوگئے۔ اور سرائے والا وہ واقعہ میرے ذہن سے بالکل نکل گیا میں تو اُس عورت کے نقوش بھی بھول گیا۔

سات سال بعد پھر ایک عجیب واقعہ پیش آگیا۔

ایک رات مجھے نیند نہیں آرہی تھی اس لیے ٹہلنے کے لیے نکل گیا۔ سُندر گڑھ ایک پہاڑی پر آباد ہے۔ میرے مکان سے کچھ فاصلے پر ایک پہاڑی ندی بہتی ہے تقریباً سو فٹ گہرائی پر ہے۔ میں چاندنی رات میں ندی کا نظارہ کرنے کے لیے اس چٹان کی طرف چلا گیا جہاں سے ندی کا منظر مجھے ہمیشہ پیارا معلوم ہوتا تھا۔

میں کچھ ہی دور گیا تھا کہ مجھے چٹان پر کوئی کھڑا نظر آیا۔ یہ ایک انسانی سایہ تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کوئی خودکشی کرنا چاہتا ہے۔

یہ سوچ کر میں گھبرا گیا۔ اور میں نے دُور ہی سے چلاّ کر کہا۔

"ٹھہرو!"

سایہ نے پلٹ کر حیرت سے میری طرف دیکھا۔ میں تیزی سے اُس کی طرف بھاگنے لگا۔

قریب جانے پر میں نے دیکھا وہ ایک لڑکی تھی۔

نوجوان اور خوبصورت لڑکی! اُس کے جسم پر پھٹا پرانا لباس تھا۔ اُس کی آنکھوں سے اداسیاں جھانک رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ لڑکی بیمار ہے یا کئی دن کے فاقے سے ہے۔ میں نے پوچھا۔

"تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہی ہو۔؟"

"میں مرنا چاہتی ہوں!" لڑکی نے گمبھیر آواز میں کہا۔

"تم آتم ہتھیا کرنے آئی تھیں؟" میں نے حیرت سے کہا۔ کیا تم نہیں جانتیں آتم ہتھیا کرنا پاپ بھی ہے اور جرم بھی!

"میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔" لڑکی نے جواب دیا۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"کیا تمہارا کوئی نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

یامیں میراکوئی نہیں۔ میں چار دن کے فاقے سے
وں۔ میں نوکری کی تلاش میں نکلی تھی۔ جہاں
اتی ہوں مردوں کی بھوکی اور ہوس کار نگاہیں
ھ سے ایک ہی چیز مانگتی ہیں۔
میری عزّت!
دو روٹی کے بدلے میری عزّت!!"
یہ کہہ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
وہ بے خوبصورت تھی۔ نہ جانے کیوں
سے دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے
سے کہیں دیکھا ہے۔ جیسے میں اُس سے جنم جنم سے
پیار کرتا ہوں۔
ماتاجی برسوں سے کہہ رہی تھیں مجھے
شادی کر لینی چاہیے۔ لیکن مجھے کوئی لڑکی پسند ہی
نہ آئی تھی۔ اُس لڑکی میں نہ جانے کیا بات تھی کہ
سے پہلی ہی نظر دیکھ کر میرے دل میں خواہش
پیدا ہوئی کہ کاش وہ میری جیون ساتھی بن سکے!
یہ خیال مجھ پر اتنا غالب ہوا کہ میں نے آگے
بڑھ کر اس کی کلائی تھام کر کہا۔
"کیا تم مجھ سے شادی کرو گی۔؟"
"شادی؟"۔۔ اس کے چہرے پر پہلے
حیرت کے آثار پیدا ہوئے پھر شرم سے اس کا چہرہ
سُرخ ہو گیا۔
"ہاں شادی۔!" میں نے کہا۔ "دوسرے
مرد تمہاری عزّت کے خریدار تھے۔ میں تمہیں جیون
ساتھی بنا کر تمہیں عزت دینا چاہتا ہوں۔ بولو مجھ
سے شادی کرو گی؟"
"م۔ م۔ مگر میں اناتھ ہوں۔" لڑکی نے
کہا۔ "میرا کوئی نہیں اور پھر آپ مجھے جانتے بھی
تو نہیں۔"
"تو کیا ہوا۔" جو عورت دنیا کی ہوس کار
نظروں سے بچنے کے لیے اور اپنی عزّت بچانے

اچھا جیون ساتھی مجھے نہیں مل سکتا۔ بولو مجھ سے
شادی کرو گی۔؟"
جواب میں وہ چند لمحے میری آنکھوں
میں آنکھیں ڈال کر مجھے دیکھتی رہی۔ پھر اُس نے
میرے کاندھے پر سر رکھ دیا۔ اور پھوٹ پھوٹ
کر رونے لگی۔
اُس واقعہ کے ایک ماہ بعد ہم دونوں
نے کورٹ میرج کر لی۔
کورٹ میرج ہم نے شوبھا یعنی اپنی بیوی
کی خواہش پر کی تھی۔ وہ کوئی ہنگامہ نہیں چاہتی
تھی۔ شادی کے بعد ہی وہ میری ماتاجی سے بھی
ملنا چاہتی تھی۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں ماتاجی اُسے
گمنام اور اناتھ جان کر اُسے اپنی بہو بنانے سے
انکار نہ کر دیں۔
چند ہی ملاقاتوں میں شوبھا نے مجھے
اپنا اتنا گرویدہ بنا لیا تھا کہ میں اُس کی ہر خواہش
کے آگے سر جھکا دیتا تھا۔
شادی کے بعد کا ایک مہینہ پلک
جھپکتے میں گزر گیا۔ ایک مہینہ بعد شوبھا نے کہا۔
"وجے ڈیر! اب تم اپنی ماتاجی کو لے آؤ۔
میں اُن سے ملنا چاہتی ہوں۔"
میں نے ماتاجی کو سُندر گڑھ لانے کے
بجائے یہی مناسب سمجھا کہ شوبھا کو ساتھ
لے کر ماتاجی کے پاس چلا جاؤں۔ نورپور سندر گڑھ
سے تیس میل دُور تھا۔
میں نے ایک دن پہلے جا کر ماتاجی کو
اپنی شادی کی خبر سُنائی اور اُن کے پاؤں
پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ماتاجی مجھ سے بہت محبت کرتی
تھیں، انھوں نے مجھے معاف کر دیا اور اجازت
دے دی کہ میں بہو کو گھر لے آؤں۔
میں شوبھا کو گھر لے گیا۔

دامن

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں
—— میر تقی میر

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں
—— میر درد

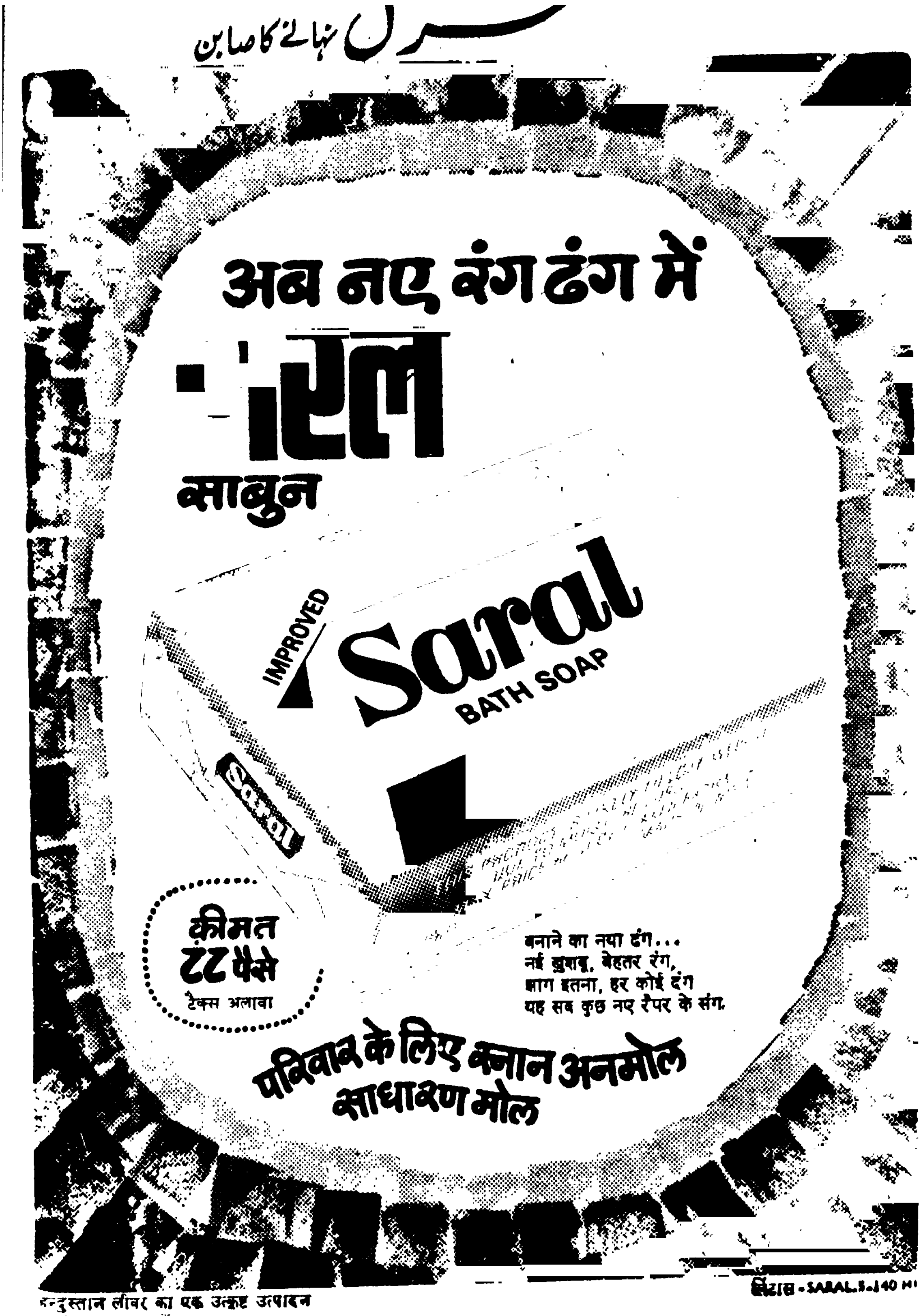
دامن اس کا جو ہے دراز تو ہو
دستِ عاشق رسا نہیں ہوتا
—— مومن دہلوی

عجیب جامۂ ہستی ملا ہے انساں کو
کہ جس کی جیب نہ دامن نہ آستیں پیدا
—— علامہ اقبال

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن
لیکن اپنا اپنا دامن
—— جگر مرادآبادی

مرسلہ: آشکار احمد قمر۔ سمستی پور

جب شوبھا اور ماتاجی ملیں تو مجھے
ایسا محسوس ہوا ماتاجی نے شوبھا کو پسند نہ کیا ہو۔
شوبھا پر نظر پڑتے ہی ماتاجی چونکی تھیں، لیکن
وہ کچھ بولیں نہیں، انھوں نے میری خاطر شوبھا کو
سینے سے لگا لیا۔
اُسی شام ماتاجی نے کہا۔
وجے بیٹا! تمہیں آلو کے پکوڑے بہت
پسند ہیں لاؤ میں پکوڑے تل دیتی ہوں۔"
شوبھا فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔
"ماتاجی آپ بیٹھیے۔ پکوڑے میں تلتی ہوں۔
کیا آلو گھر میں ہیں؟"
"ہاں رسوئی میں ہیں۔" ماتاجی نے کہا۔
(بقیہ صفحہ ۵۹ پر)


سرل نہانے کا صابن
अब नए रंग ढंग में
सरल
साबुन
IMPROVED
Saral
BATH SOAP
Saral
क़ीमत
८८ पैसे
टैक्स अलावा
बनाने का नया ढंग...
नई खुशबू, बेहतर रंग,
झाग इतना, हर कोई दंग
यह सब कुछ नए रैपर के संग.
परिवार के लिए स्नान अनमोल
साधारण मोल
हिन्दुस्तान लीवर का एक उत्कृष्ट उत्पादन
SARAL.5.140 HI

غزلیں

آسی رام نگری

مغلسرائے۔ وارانسی (یوپی)

★

جگمگاتے ہیں گلستاں میں بہاروں کے چراغ
ہوگئے روشن چمن میں لالہ زاروں کے چراغ

میری خلوت ہے حسیں عکسِ رُخِ محبوب سے
بجھ گئے گو آسماں پر چاندتاروں کے چراغ

کوئی حاجت ہی نہیں قندیل کی، فانوس کی
بزم میں روشن ہیں جب سیمیں عذاروں کے چراغ

پھر بہار آئی اڑاتی رنگ و نکہت کا گلال
ہوگئے صحرا میں روشن لالہ زاروں کے چراغ

بجھ گیا ہو دل ہی جب سارا جہاں تاریک ہے
لاکھ روشن ہوں فلک پر چاندتاروں کے چراغ

نو بہار صابر

ٹریا آشرم۔ راگھو ماجرا۔ پٹیالہ

★

اِس درجہ پیچ و تاب کی کیا بات ہے میاں
بے حاصلی تو وقت کی سوغات ہے میاں

ہر لمحہ ایک اجنبی منظر ہے سامنے
کس درجہ تیز گردشِ حالات ہے میاں

چہرہ تو اُس کا صبح کی صورت ہے تابناک
سینے میں آدمی کے سیہ رات ہے میاں

اِس شہر میں نہ شیشۂ احساس لے کے گھوم
ہر سمت سنگِ درد کی برسات ہے میاں

عشرت کدہ لگے کبھی وحشت سرا لگے
یہ زندگی بھی طرفہ طلسمات ہے میاں

صابر! جو خار بوئے گا کاٹے گا خار ہی
دُنیا تو کِشت زارِ مکافات ہے میاں

مولانا حفیظ الرحمان واصف

۲۱۷۰۔ اُردو بازار۔ دہلی

★

بیاں اے ہمنشیں! غم کی حکایت اور ہو جاتی
ذرا ہم خستہ حالوں کی طبیعت اور ہو جاتی

ستم، آفت، مصیبت، ابتلا، ایذا و رسوائی
میسّر دمِ آخر شہادت اور ہو جاتی

بہت اچھا ہوا آنسو نہ نکلے میری آنکھوں سے
بپا محفل میں اک تازہ قیامت اور ہو جاتی

شرف بخشا ہے تم نے آج مجھ کو ہم کلامی کا
کہوں کچھ دل کی بات اتنی اجازت اور ہو جاتی

زہے قسمت نوازا ہے جوابِ خط سے واصف کو
دکھائے اک جھلک اتنی عنایت اور ہو جاتی

کرشن چندر

نہ صرف اُردو کا بلکہ دُنیا کا ایک عظیم مصنّف ہے۔ اس کی ہر تصنیف سدابہار ہے ——— اس کی ہر تصنیف عالمی ادب کا ایک قیمتی سرمایہ ہے۔

——— اور ———

بیسویں صدی اس عظیم مصنّف کی مندرجہ ذیل کتابیں شائع کرچکا ہے۔

ایک عورت ہزار دیوانے

کرشن چندر نے اس ناول میں پھول کی پنکھڑی سے زیادہ نازک لیکن پتھر سے زیادہ سخت ایک خانہ بدوش لڑکی کا کردار پیش کیا ہے ——— جو زندگی کے نشیب و فراز کو جھیلتی ہوئی ایک ایسے مقام پر پہنچتی ہے جس کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا ——— چھٹا ایڈیشن تیار ہے ——— قیمت : -/۵ روپے۔

دل کی وادیاں سو گئیں

طنز کے زہر میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ
خاموش محبت کے کرب سے لبریز

آنسوؤں اور آگ برساتی آہوں کی ایک انوکھی داستان ——— جو صرف کرشن چندر ہی لکھ سکتے تھے ——— قیمت : -/۷ روپے

کتاب کا کفن

کرشن چندر کے وہ افسانے جن میں حسن و جوانی کی انگڑائیاں بھی ہیں جوان دلوں کی دھڑکنیں بھی ہیں اور آج کے معاشرے کے رنگین اور بھیانک روپ بھی ہیں۔

قیمت : -/۶ روپے

● کرشن چندر کی مندرجہ ذیل تصنیفات بھی ہم سے طلب کرسکتے ہیں۔

زندگی کے موڑ پر	۷ روپے	لال تاج	۵ روپے
اُس کا بدن میرا چمن	۱۵ روپے	ہونولولو کا راجکمار	۸ روپے
سپنوں کی وادی	۹ روپے	آسمان روشن ہے	۶ روپے
فلمی قاعدہ	۶ روپے	محبت بھی قیامت بھی	۱۲ روپے
چندا کی چاندنی	۷ روپے	پانچ لوفر ایک ہیروئن	۴ روپے ۵۰ پیسے
دیوتا اور کسان	۱۰ روپے	ان داتا	۶ روپے

ملنے کا پتہ :- بیسویں صدی بک ڈپو، دریا گنج ـ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

واجدہ تبسّم کی مقبول ترین یہ کتابیں ہم سے طلب کریں

واجدہ تبسّم کے افسانوں پر ہر گھر میں بحث ہوتی ہے کچھ لوگ افسانوں کی تعریف کرتے ہیں اور کچھ مذمت کرتے ہیں۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ واجدہ تبسّم کا افسانہ پوری دلچسپی کے ساتھ نہ پڑھا جائے۔

واجدہ تبسّم کے شعلہ خیز افسانوں کے
دو نئے مجموعے

روزی کا سوال

قیمت : ۱۲ روپے

اور

کیسے سمجھاؤں

قیمت : ۱۰ روپے

● ہر سطر انوکھی ● ہر صفحہ نرالا ● روشنیوں اور اندھیروں کی ہمراز کہانیاں۔

واجدہ تبسّم کے بے خوف، بے باک اور روایت شکن قلم کا شاہکار

کیسے کاٹوں رین اندھیری

دن کٹ جاتا ہے لیکن اندھیری رات کاٹے نہیں کٹتی۔

واجدہ تبسّم نے ایسی ہی کٹھور راتوں سے ایک سوال کیا ہے اور اور خود ہی اس سوال کا جواب بھی دیا ہے ایک انتہائی دلچسپ ناول۔

——— قیمت : دس روپے ———

● نفیس کتابت، معیاری طباعت، عمدہ سفید کاغذ مضبوط جلد۔

★ اُردو کی ہر لائبریری ان تصنیفات کے بغیر ادھوری رہے گی۔

اپنا آرڈر اس پتہ پر بھیجیں:

بیسویں صدی بک ڈپو ـ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

سمندر اور ایک لڑکی

موہن یاور

میں آج بھی سمندر کے کنارے ریت پر اُس کے قدموں کے نِشان ڈھونڈ رہا ہوں۔ جو ایک عرصہ سے نہ جانے کہاں گُم ہو گئے ہیں۔ مِٹ گئے ہیں۔ ریت پر قدموں کے نشان! سمندر، ساحل اور نقوش! سارے دن کا تھکا ماندہ سُورج، سمندر میں ڈُوب رہا ہے۔ وہ اِس وقت ہمیشہ ڈوبنے لگتا ہے۔

بھوکا پیاسا سمندر اور تھکا ماندہ سوُرج۔

میں ایک مُدّت سے یہ منظر دیکھ رہا ہوں۔

"—— کیا ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ سورج سمندر میں نہ ڈوبے۔ نہ سورج تھکا ماندہ ہو اور نہ سمندر بھوکا پیاسا۔"

سمندر کی لہریں اب طوفان برپا کر رہی ہیں۔

ریت پر قدموں کے نئے اور پُرانے سارے نقوش مِٹ گئے ہیں۔

شیتل!

شیتل، ایک لڑکی تھی۔ خوبصورت سی، دُبلی پتلی سی، معصوم سی، نازک سی۔ جو میری زندگی تھی۔ میری دُنیا تھی۔

اور اب ——

اُس کی یاد میری زندگی۔ میری دُنیا۔ کِتنا تضاد ہے۔ کِتنا فرق ہے۔ تب اور اب میں۔ اِس جیتی جاگتی دُنیا کا ہر زندہ کردار یادوں کے سہارے زندہ ہے۔ یادیں جو ہمیشہ میٹھی ہوتی ہیں اور دِل کش بھی۔

سمندر کی سطح پر سات رنگ کا جہاز ہچکولے کھا رہا ہے۔

شیتل قوسِ قزحی ساڑی میں ملبوس مُسکرا رہی ہے۔

"تھک گئے؟"

"نہیں تو ——"

"اِنتظار میں مزہ آتا ہے کیا؟"

"ہاں ——"

"اور مجھے تڑپانے میں!" شیتل ہنستی ہے اور اُس کی نقرئی ہنسی میرے ارد گرد پھیل جاتی ہے۔ ہنسی جیسے گھنگھرو بجتے ہوں۔

راج تلک روڈ۔ جمّوں

•

نیّر صاحب۔ تسلیم۔

آپ کا محبّت نامہ مِلا۔ یاد آوری کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ آپ کے حکم کی تعمیل میں، ایک افسانہ بہ عنوان "سمندر اور ایک لڑکی"، ارسال کر رہا ہوں۔

نیّر صاحب! آپ نے "بیسویں صدی" کو مزید چار چاند لگا دیے ہیں۔ مبارک باد قبول کیجیے گا۔ بھگوان سے ایک ہی پرارتھنا ہے آپ اِسی طرح اُردو ادب کی بے لوث خدمت کرتے رہیں۔

مخلص:

موہن یاور

داستان ایمان فروشوں کی - ۱

نیا ایڈیشن (تصحیح شدہ)

تاریخ اسلام کے مردِ مجاہد صلاح الدین ایوبی کے دور کی یہ داستان ان داستانوں میں سے ایک ہے جنکی طوالت کے لیے تاریخ کا دامن تنگ ہوتا ہے۔ بیان سازشوں کی داستان ہے جو ایمان فروش مسلمانوں نے صلیبیوں کے ساتھ ملکر صلاح الدین ایوبی کے خلاف کیں اور سلطنت اسلامیہ کی جڑیں کاٹیں۔

یہ داستان محترم التمش نے بارھویں صدی کے وقائع نگاروں کے ان کاغذات سے اخذ کی ہے۔ جو مصر اور مراقش کی سرکاری لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔

عمدہ سفید کاغذ، نفیس کتابت اعلیٰ طباعت۔ قیمت : جلد بیس روپے

ملنے کا پتہ: بیسویں صدی بک ڈپو۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

[illegible]

اپنی نوعیت کی پہلی لغت

انسانی علوم و فنون کی بے کرانی کا مدار زبان اور ذخیرۂ الفاظ کی وسعت پر قائم ہے۔ دوسری طرف روزمرہ کی زندگی کے سادہ اور سچے جذبات کے برملا اظہار کے لئے زبان پر بھرپور قدرت، وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہی نہیں ثقافت و شائستگی کی پہچان بھی ہے۔ ان تقاضوں سے شناسائی لغت کے بغیر ممکن نہیں۔ اردو داں حلقہ کی اسی ضرورت اور اہمیت کے پیشِ نظر انگریزی اُردو کی سب سے انوکھی، نئی اور معیاری لغت کی اشاعت کی طرف قدم اٹھایا گیا ہے۔ یہ تقریباً پچاس ہزار سے زائد الفاظ و محاورات کا مستند مجموعہ ہے۔ انگریزی سے انگریزی اور خطِ نستعلیق سے آراستہ اردو الفاظ کو حسنِ ترتیب سے مرتب کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی کی نظرِ ثانی و اضافے کے ساتھ طلبا کے لئے خاص رعایتی قیمت کے ساتھ پیش کی جارہی ہے۔ سائز ۲۰×۳۰/۸ صفحات ۸۰۸ قیمت پچیس ۲۵ رُوپے۔

ملنے کا پتہ: بیسویں صدی بک ڈپو۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

---

۱۹ ماہ کے سیاہ دَور کی خونچکاں داستانیں

ایمرجنسی کی قیامت

نامور سیاسی مبصر اور بیباک صحافی سلامت علی مہدی کے آتشیں قلم سے نکلی ہوئی ایک تاریخی دستاویز جس میں "اندرا شاہی" کے دور میں ہوئے سیاسی ہنگاموں اور مظالم کی روداد بیان کی گئی ہے۔ اُردو میں پہلی اور آخری کتاب۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ختم ہوچکا ہے۔ دوسرا ایڈیشن چھپ رہا ہے۔ فوراً طلب کریں۔

قیمت :- ۵/- روپے

سنجے گاندھی، وِدّیا چرن شکلا اور دھریندر برہمچاری کی مبیّنہ رنگین مزاجی پر روشنی ڈالنے والی بیباک تحریر

ایمرجنسی کے

جنسی اسکینڈل

ایک ایسی کتاب جس میں ایمرجنسی کے عیّاش حکمرانوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔

قیمت صرف پانچ روپے

منگانے کا پتہ :- ہفت روزہ عوام ۱۸ ا۔ انصاری روڈ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

یس ں پی! ہم سے بن بن نے بدلے نہ
انام کبھی راجیش نہیں!"

سمندر کی ایک لہر میرے قدموں کے نیچے
ہوئی دُور تک چلی گئی ہے۔ ریت پر سارے
ٹ گئے۔

سمندر کا کبھی جواب نہیں! دِن کو چُپ
رہتا ہے اور رات کو چنگھاڑنے لگتا ہے۔
شیتل کو سمندر کا یہ انداز بہت پسند تھا۔
کا یہ شور، یہ ہنگامہ، یہ طوفان۔ شیتل کو خاموشی
ے سے سخت نفرت تھی۔

خاموشی اور اندھیرے کی سازش کا نتیجہ۔
ہو گئی۔

اور میں اندھی دُنیا کے اندھے لوگوں سے
کا پتہ پوچھتا ہوں۔

"شیتل کہاں ہے؟"

لیکن کوئی جواب نہیں ملتا۔ اِس بھری
میں کسی کو شیتل کا اتا پتہ معلوم نہیں۔

ایک لہر اُبھری!

"شیتل۔ تُم!"

"ہاں ——— میں شیتل"

"کہاں کھو گئی تھیں تُم۔ کہاں چلی گئی
"

کہیں بھی نہیں۔ تمہارے پاس ہی
تمہارے سامنے۔ تمہارے دِل کی
میں! کیا تُم نے کبھی اپنے دل کی
نہیں سُنیں؟"

سُنی ہیں ———"

"تو پھر ——— مجھ سے کیوں پوچھتے
ں چلی گئی تھی۔"

شیتل یہ شیتل!"
شیتل میری بہو'

سامنے سمندر ہے۔ جنم جنم کا پیاسا
سمندر۔ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر۔ جو محبت
بھی نِگل جاتا ہے۔ قہقہے بھی ——— اور
آنسو بھی ——— لیکن پھر بھی پیاسا ہے۔ بھوکا
ہے۔

شیتل ہیر تھی اور میں رانجھا!
شیتل لیلیٰ تھی اور میں مجنوں!
شیتل سسّی تھی اور میں پنوں!
شیتل سوہنی تھی اور میں مہینوال!

اِس بھرے پُرے شہر میں ہیر کھو گئی ہے۔
میں اُسے کہاں تلاش کروں۔ لیلیٰ گُم ہو گئی ہے۔
کس سے پوچھوں۔ سسّی لاپتہ ہے، کون کھوجے
گا اُسے۔ سوہنی غائب ہے۔ اور سب کچھ دیکھنے
والے اندھے کہہ رہے ہیں۔

"ہم تو اندھے ہیں۔ ہم شیتل کو کیسے
پہچانتے۔ کیسے جانتے ———"

لو ——— وہ بھی پوچھتے ہیں کہ شیتل
کون ہے۔؟

——— ارے چلو! اِسی دھرتی کی
بیٹی ہیر، جس نے رانجھا سے پیار کیا اور اِسی
دھرتی میں گُم ہو گئی۔

شیتل نے کئی روپ دھارے۔
کئی رنگ بدلے۔

کبھی شیتل نے ہیر کا روپ دھارا۔ اور
کبھی لیلیٰ کا۔ کبھی سسّی بن گئی۔ اور کبھی سوہنی۔
اور پھر نہ جانے کن پہنائیوں میں ڈوب گئی۔ اور
آج تک نہ مِل سکی۔ نہ میں اُسے پا سکا۔ وہ کہاں
چلی گئی۔ سونے اور چاندی کے ٹھیکیداروں نے
شیتل کو سونے اور چاندی کے پنجرے میں بند
کر دیا اور وہ ہیرے جواہرات میں گُم ہو گئی ہمیشہ
ہمیشہ کے لیے!

——— اور راجیش، اُس کے لیے صرف

ایک بھولی بِسری کہانی بن کر رہ گیا۔

سمندر کے ساحل پر اب بھی کتنے حسین
لوگ پیار کی دِلکش دُنیا میں ڈوبے ہوئے ہیں۔
کل کیا ہو گا، یہ لوگ نہیں جانتے۔ اُن کی شیتلائیں
کہاں گُم ہو جائیں گی۔ یہ اِس سے بے خبر ہیں۔ ریت
پر کل انھیں اپنے قدموں کے نقوش ملیں گے اور
نہ یہ خوشبودار ہوائیں ہی۔ محبت میں سونے اور چاندی
کی دیوار حائل ہو گی۔ سونے اور چاندی کی جیت
ہو گی۔ پھر صرف کسک باقی رہ جائے گی۔ یاد باقی
رہ جائے گی۔

شیتل سے پہلی مُلاقات باندرہ کے بس
سٹاپ پر ہوئی تھی۔

مجھے یاد ہے۔ اچھی طرح یاد ہے۔ اُس دن
قیامت کی بارش ہو رہی تھی۔ اور اِس قیامت
خیز بارش کی وجہ سے بسیں بھی الہ دین کے چراغ کی
طرح غائب ہو چکی تھیں۔

بس سٹاپ پر میں اکیلا ہی تھا ——— اور
سڑک بھی ایک چھوٹی سی ندی کی شکل اختیار کر گئی
تھی اچانک ایک خوبصورت سی کار آ کر رُکی ———
دروازہ کھلا اور جادو بھری آواز آئی ———

"اندر آ جائیے!"

اور میں اِس مقناطیسی آواز کی کشش
سے کار میں بیٹھ گیا۔

میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ سیٹھ
گنگا پرشاد کی بیٹی تھی۔

"آپ کو کہاں جانا ہے؟" ایک جادو
بھری آواز لہرائی۔

"جی ——— میں آپ کی مِل میں کام کرتا
ہوں"

"ہماری مِل میں۔ یہ بھی اچھا ہوا"
میں بھی وہیں جا رہی ہوں ———"

حسین کار سڑک پر دوڑتی رہی۔ بارش کا
طوفان اور وہ خاموش ــــ نہ جانے وہ کیا سوچتی
رہی ــــ اور میں بھی چپ رہا ــــ
دوسری ملاقات، پھر تیسری ملاقات اور
پھر چوتھی ملاقات ــــ بس پھر ملاقاتوں کا تانتا
بندھ گیا۔

میں گنگا پرشاد ملز میں کلرک سے منیجر بن گیا۔
سیٹھ گنگا پرشاد کو ہم دونوں کی یہ ادائیں
پسند نہ آئیں۔ وہ سیٹھ تھا۔ ہیرے اور جواہرات
میں کھیلتا تھا۔ اور میں ایک مفلس قلاش سیٹھ
کے رحم و کرم پر پلنے والا۔ صرف ایک کلرک، یہ ترقی
کی سیڑھیاں صرف شیتل کی بدولت طے کی تھیں۔
سیٹھ گنگا پرشاد اپنی بیٹی کی شادی
سیٹھ گوپال داس کے بیٹے اجیت سے طے کر چکے
تھے۔

جب داستان تھی!
شیتل۔ اجیت! ــــ شیتل اور راجیش۔
کہیں پل اور کہیں دو متوازی خطوط ــــ!
شیتل میری زندگی تھی ــــ اور اجیت
میری زندگی کو چھین رہا تھا ــــ مجھے اندھیرے
غار میں پھینک رہا تھا ــــ
"ڈیڈی ــــ میں کئی بار کہہ چکی ہوں۔
میں شادی راجیش سے کروں گی۔ اگر آپ نے میری
مرضی کے خلاف قدم اُٹھایا تو ــــ ڈیڈی ــــ
آپ کی قسم۔ سمندر میں ڈوب کر مر جاؤں گی!"
مجھے نوکری سے برطرف کر دیا گیا۔
سیٹھ گنگا پرشاد کا پہلا وار ــــ!!
"سیٹھ جی ــــ اِس مہربانی کا شکریہ!
دوسرا وار ــــ
دھمکی ــــ "شیتل کے راستے میں نہ آؤ۔

"سیٹھ جی ــــ میں اب زندہ
میں تو کب کا مر چکا ہوں۔ آپ مجھے کیا کچلیں
اب تو میں صرف ایک زندہ لاش بن کر رہ گیا
زندہ لاش!"
اور پھر ایک دن شیتل کا بیاہ ہو گ
شہنائی کی آواز میں نے بھی سُنی ــــ
دُلہن کے رُوپ میں، میں نے بھی دیکھا ــــ
پژمُردہ، مری مری سی، بُجھی بُجھی سی۔ ہیر
سونا چاندی، قیمتی ملبوسات، نفیس کار اور
ایک دُلہن کو وہ رنگ رُوپ، وہ خوشی نہ
سکے، جو وہ چاہتی تھی۔ اُسے وہ خوشی سیٹھ
دے سکے اور نہ وہ رنگ روپ اجیت
اب میں سمندر کے ساحل پر اکیلا گھ
شاید کسی دن سمندر کی کوئی لہر شیتل کو باہر ک

غزلیں

...اہی

، دستگیر کالونی، فیڈرل بی ایریا کراچی (پاکستان)

★

فلس کا رنگ ہے دُنیا
دلی کی ترنگ ہے دُنیا

دا سے جو ہراساں ہو
، ناداں پہ تنگ ہے دُنیا

ل اس سے ہوشیار رہیں
ہے آئینہ ، زنگ ہے دُنیا

ن کی ہے دستِ قدرت ہیں
اُڑتی پتنگ ہے دُنیا

ہی دن بہار اس کی ہے
ہروں کی امنگ ہے دُنیا

یہاں آبرو کسی کی بچے
ن نام و ننگ ہے دُنیا

شاعر صدیقی

8-56 بلاک سی شمالی ناظم آباد کراچی ۳۳ (پاکستان)

★

پلکوں پہ یادوں کی گھٹائیں آنکھوں میں برسات بہت
چاند سے چہرے یاد آتے ہیں ظالم ہے یہ رات بہت

آنکھوں میں لاکھوں منظر ہیں دل میں ہزاروں یادیں ہیں
انکی محفل سے آئے ہیں لے کر ہم سوغات بہت

تم کو کیا معلوم تمہاری خاطر ہم معتوب رہے
جو کہنا ہو سوچ سمجھ کے نازک ہیں جذبات بہت

رسم وفا ایک طرفہ کب تک رنگِ زمانہ بھی دیکھو
تم بھی تو کچھ ساتھ نبھاؤ ہم نے دیا ہے ساتھ بہت

عہد کرو تم ہر حالت میں دل کو بچائے رکھو گے
دل اپنا زندہ تو شاعر ہونٹوں پر نغمات بہت

باقی احمد پوری

۱۹۲-اے، بلاک نمبر ۳ کریم پارک لاہور (پاکستان)

★

تُو نہیں تو تیرا دردِ جاں فزا مل جائے گا
زندہ رہنے کا کوئی تو آسرا مل جائے گا

اے مری چشمِ پشیماں، اپنے آنسو روک لے
رات کی تنہائی میں رونے سے کیا مل جائے گا

زندگی کے کارواں پر کچھ اثر پڑتا نہیں
اِک مسافر کھو گیا تو دوسرا مل جائے گا

ساری بستی میں فقط میرا ہی گھر ہے بے چراغ
تیرگی سے آپ کو میرا پتا مل جائے گا

سوچتے رہنے سے تو منزل کبھی ملتی نہیں
چلتے جاؤ راستے سے راستا مل جائے گا

کوئی تو میرا بھی ہوگا منتظر باقی یہاں
اِک نہ اِک تو دل کا دروازہ کھلا مل جائے گا

درد کا رشتہ

مسرور جہاں

کراؤن گیٹ۔ جگت نرائن روڈ۔
لکھنؤ-۲۲۶۰۰۲ (یو۔پی)

●

محترم رحمٰن بھائی! تسلیم

ایک طویل عرصے کے بعد آپ سے ہمکلام ہوں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ "بیسویں صدی" سے بھی دُور رہی۔ جی نہیں، مطالعہ پابندی سے کرتی ہوں۔

ایک کہانی "درد کا رشتہ" ارسالِ خدمت ہے۔ پسند آجائے تو کسی قریبی اشاعت میں جگہ دے کر ممنون فرمائیں۔

شکریہ!

خلوص کیش،

مسرور جہاں

اُن کی شادی کو چھ مہینے گزر گئے تھے۔ اِس طویل عرصے میں یاسمین نے اُسے ایک بار بھی شکایت کا موقع نہ دیا تھا۔ اُسے اگر یاسمین سے کوئی شکایت تھی تو بس یہی کہ وہ چُپ چُپ اور خاموش رہتی ہے۔ کبھی کبھی وقت تو اُسے یہ خاموشی بہت ناگوار گزرتی تھی۔ اُس وقت اور بھی زیادہ جب وہ ہنسنے ہنسانے کے مُوڈ میں ہوتا۔ لیکن وہ اپنی خاموشی سے اُس کے سارے مُوڈ کا ستیاناس کر دیتی تھی۔ ایسے میں وہ اُسے کچھ تلخ و تُرش بھی کہہ جاتا تھا۔ لیکن وہ اُس کی کسی بات کا جواب نہ دیتی تھی اور اُسے بس اپنی سیاہ معصوم آنکھوں سے دیکھ کر رہ جاتی تھی۔ اُس کی اِس ادا پر اُسے بیساختہ پیار آجاتا۔ وہ اُس وقت ایک معصوم اور سہمی ہوئی فاختہ نظر آتی اور وہ اُسے بے اختیار اپنی باہوں میں بھر لیتا۔ اپنی بے پناہ محبّت کا اظہار کر کے ایک بار پھر وہی انور بن جاتا جو اُس کے عشق میں دیوانہ ہو کر اُسے بیاہ لایا تھا۔

پہلی بار اُس نے یاسمین کو نینی تال میں دیکھا تھا۔

وہ اکتوبر کا مہینہ تھا۔ نینی تال میں یہ موسمِ بہار کا زمانہ تھا۔ اُن دنوں دُور دُور سے سیّاح آئے ہوئے تھے۔ اُسے یہ موسم مئی اور جون سے بھی زیادہ خوشگوار معلوم ہو رہا تھا۔ رنگ رنگ کے پھولوں کی مہک ساری فضا میں بسی ہوئی تھی۔ ہر سمت خوشنما پھول مُسکراتے نظر آتے تھے۔ مُسکراتے ہوئے گلاب کے پھول تو سیّاح کو اپنی طرف متوجّہ کر کے اور بھی مغرور اور مسرور تھے۔ فلیٹ پر بھی شام کے وقت خاصی چہل پہل ہو جاتی تھی۔ بوٹ ہاؤس کا کلب اور اسکیٹنگ ہال کی رونقیں بھی شباب پر تھیں۔

اِتنے حسین موسم اور اِتنی چہل پہل میں وہ جھیل کے کنارے پتّھر کی ایک بنچ پر تقریباً سُنسان سی جگہ تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ سفید بے داغ لباس میں اُس کا حُسن حوروں کو شرما رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا، کوئی جل پری پانی سے نکل کر آ بیٹھی ہے۔ ایسے میں اگر وہ بے اختیار اُس کی طرف کھنچ گیا تو قصور اُس کا نہیں ــــ یاسمین کے حُسن کا یا پھر موسم کی دلکشی ہی کا ہو سکتا ہے۔

"معاف کیجیے گا ــ کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟"

اُس نے قدرے ہمّت کر کے کہا۔ یہ بھی خوف تھا کہ کہیں وہ سچ مچ جھپاک سے نیلے پانیوں میں غوطہ مار کر غائب ہی نہ ہو جائے۔ اُس نے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اُٹھا کر اُسے دیکھا اور کھڑی ہو گئی۔

"اوہ! میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ آپ کو اُٹھا کر خود بیٹھ جاؤں۔ اِتنی بڑی بنچ ہے، ہم دونوں بہت آرام سے بیٹھ سکتے ہیں۔ بیٹھیے نا؟"

وہ اُس کے لہجہ میں شرافت محسوس کر کے بیٹھ گئی۔ اُس سے تھوڑے سے فاصلے پر وہ بھی بیٹھ گیا۔

"مجھے انور کہتے ہیں۔ ایک دوست کے بہکاوے میں آکر تنہا ہی موسمِ بہار کا لُطف اُٹھانے

چلا آیا۔ یاسمین یہاں آکر محسوس ہوا کہ تنہا انسان کو جنت میں
بھی رکھا جائے تو بور ہوگا۔ شاید اسی لیے اللہ میاں
نے وہاں بھی حوروں کا انتظام کر رکھا ہے!"
اُس نے گفتگو میں پہل کی۔ اُس کی باتوں پر
وہ آہستہ سے مسکرادی۔
"کیا میری طرح آپ بھی تنہا ہیں؟"
"میں اپنی فیملی کے ساتھ ہوں۔" اُس نے
مختصر سا جواب دیا۔
"تب تو آپ بہت خوش نصیب ہیں۔" اُس
نے اپنی بدقسمتی پر سرد آہ بھری۔
"اب میں چلوں گی۔" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔
شاید اس تنہائی میں ایک اجنبی اور باتونی مرد کے
کے قریب بیٹھنا اُسے پسند نہ تھا۔ انور کا جی چاہا اُسے
روک لے اور کچھ اُس کے متعلق پوچھے لیکن وہ کچھ
نہ کہہ سکا اور وہ چلی گئی۔ چند پل کی ملاقات میں اُسے
اس کا حق ہی کب پہنچتا تھا کہ وہ ایک اجنبی اور حسین
لڑکی کو روک لے۔

دوسری بار وہ اُسے مال روڈ کی ایک دوکان
میں نظر آئی۔ وہاں وہ اپنے لیے چند رسائل خریدنے
گیا تھا اور دوسرے کاؤنٹر پر اُس کے سامنے روزمرہ
کی ضروریات کا چھوٹا موٹا سامان رکھا تھا۔ رسائل کی
قیمت ادا کرکے وہ اُس کے قریب چلا گیا۔
"ہیلو!" اُس نے وش کیا۔ وہ چونک پڑی۔
پھر اُسے دیکھ کر اُس کے لبوں پر پہچان مسکراہٹ
بن کر اُبھر آئی۔
"ہیلو!" اُس نے آہستہ سے کہا اور سیلزمین
سے سامان لے کر اپنے نائیلان کے خوبصورت سے بیگ
میں رکھنے لگی۔ پھر وہ ساتھ ہی دوکان سے باہر نکلے۔
سہ پہر کا وقت تھا اس لیے اُس وقت مال روڈ پر بھیڑ
تھی۔ وہ چند منٹ خراماں خراماں چلتے رہے۔ خاموشی
سے اُکتا کر انور بولا۔

"اگر زحمت نہ ہو تو میرے ساتھ ایک کپ چائے
یا کافی پی لیں۔"
"جی ـــ؟" اُس نے عجیب نظروں سے دیکھا۔
"یہ سوچ کر انکار نہ کیجیے گا کہ تنہائی کا ستایا
ہوا ہوں۔"
وہ مسکرادی اور خاموشی سے اُس کے ساتھ
کیفے میں داخل ہوگئی۔ وہ آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ بیرہ
آرڈر لینے آیا تو اُس نے پوچھا۔
"چائے یا کافی؟"
"جو آپ پسند کریں۔"
"ڈو کافی!" اُس نے بیرہ سے کہا۔ پھر اُس کی
طرف گھوم گیا۔
"میں نے آپ کا نام نہ پوچھ کر جس بدتہذیبی کا
ثبوت دیا ہے اُسے معاف کیجیے گا۔" انور نے بہت
خوبصورتی سے اُس کا نام پوچھا۔
"یاسمین۔" مختصر سا جواب ملا۔
"جب ہی آپ اور آپ کا نام پھولوں سے بھری
اس وادی سے پوری طرح ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔" انور
نے اُس کی اور اُس کے نام کی تعریف کی۔
کافی سپ کرتے ہوئے بھی وہ خاموش رہی اور
انور اس کے صبیح چہرہ کا بنظر غائر جائزہ لیتا رہا۔ حسن
اور اُداسی کا اتنا حسین امتزاج اس نے آج تک نہ
دیکھا تھا۔ سونے پر سہاگہ اُس کی سنجیدگی، متانت اور
خاموشی ـــ ان سب چیزوں نے مل کر اُس میں شاہزادیوں
جیسا وقار اور رکھ رکھاؤ پیدا کردیا تھا۔ عام لڑکیوں کے
مقابلے میں یاسمین اُسے بہت پسند آئی تھی۔ وہ دل ہی
دل میں اُس کا موازنہ زینتا کپور، ڈیزی، رشمی وغیرہ سے
کر رہا تھا۔ یقیناً یاسمین کا اور اُن لڑکیوں کا کوئی مقابلہ
نہ تھا۔
کافی ختم ہوئی تو یاسمین نے اُس کا شکریہ
ادا کرکے رخصت مانگی۔

"یاسمین! ایک درخواست کرسکتا ہوں؟"
یاسمین نے نظریں اُٹھا کر اُسے دیکھا اور پھر سر
جھکا کر اثبات میں گردن ہلادی۔
"آپ جب تک یہاں ہیں کبھی کبھی مل لیا کریں۔
نینی تال بہت چھوٹی سی جگہ ہے۔ یہاں ہر صورت کہیں
نہ کہیں روز ہی نظر آجاتی ہے۔ پھر یہ ساری صورتیں شہر
کے جنگل میں غائب ہوجاتی ہیں اور اگر ہم چاہیں بھی
تو انھیں تلاش کرنا ناممکن ہوجاتا ہے۔"
یاسمین نے آہستہ سے کہا۔
"واقعی انور صاحب آپ نے سچ ہی کہا۔ کھوئی
ہوئی صورتوں کو تلاش کرنا ناممکن ہوجاتا ہے۔"
یہ اُن کی چند ملاقاتوں میں سب سے طویل جملہ
تھا جو یاسمین نے اُس سے کہا۔ کیونکہ اُس کے بعد بھی اُن
کی کئی ملاقاتیں ہوئیں اور انور صرف یاسمین کی خاطر پروگرام
سے کئی دن زیادہ رک گیا اور جب یاسمین چلی گئی تو نینی تال
کی پھولوں بھری وادی اپنی ساری دلکشی اور گہما گہمی کے
باوجود انور کو سنسان اور بے کیف نظر آنے لگی۔ دوسرے
دن اُس نے بھی اُسے الوداع کہہ دیا۔
انور نے یاسمین کا پتہ لے لیا تھا۔ دلی پہنچ کر اُس
نے یاسمین کو خط لکھا اور پھر یہ سلسلہ چل پڑا۔ یاسمین بہت
باقاعدگی سے اُس کے ہر خط کا جواب دیتی تھی بہت سادہ
سا خط ہوتا تھا۔ سلجھا ہوا انداز تحریر، سیدھی سادی باتیں۔
یقیناً وہ بے داغ کردار کی تعلیم یافتہ اور سمجھدار لڑکی تھی۔
انور کو محسوس ہوا کہ اُسے اپنی تنہائی کا ساتھی بنانے کے
لیے یاسمین ہی جیسی لڑکی کی ضرورت ہے۔ اُس نے اُسے
صاف الفاظ میں لکھ دیا کہ وہ اُسے اپنی شریکِ حیات
بنانا چاہتا ہے۔ ساتھ ہی اُسے یقین دلادیا کہ وہ اُسے
ہر طرح خوش رکھنے کی امکانی کوشش کرے گا۔
انور کو یاسمین کے جواب کا بے چینی سے انتظار
تھا لیکن یاسمین کے بجائے اُس کی بڑی بہن صبیحہ کا خط
آگیا۔ انہوں نے اُسے ساری گفتگو کے لیے آگرہ بلایا تھا

اور صاف لکھ دیا تھا کہ شادی بیاہ کی بات چیت خط و
کتابت کے ذریعہ مناسب نہیں ہے۔
اگلے دن وہ آگرہ کے لیے روانہ ہو گیا۔ یاسمین
کی طرح اُس کے والدین بھی بے حد سُلجھی ہوئی طبیعت کے
تھے۔ بڑی بہن صبیحہ نے بھی اُس کا مقدور بھر خیال کیا۔
چند ضروری باتوں کے متعلق دریافت کر کے یاسمین کے
والد نے رشتے کی منظوری دیدی اور دو ہی ہفتے کے
بعد انور اور یاسمین کی شادی بہت سادگی سے ہو گئی۔
انور کے والدین بمبئی میں رہتے تھے اور یاسمین کے والد
لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور حال ہی میں تبادلہ کے بعد
آگرہ آئے تھے، اِس لیے دونوں طرف سے شادی میں
شریک ہونے والے دوست اور ملنے والے ہی تھے۔ دو
دن آگرہ میں رُک کر انور یاسمین کو ساتھ لے کر دہلی آ گیا۔

انور کا چھوٹا سا فلیٹ یاسمین کے سلیقہ مند ہاتھوں
سے سج کر چھوٹی موٹی جنّت بن گیا اور اُن کی زندگی کے
شب و روز سکون سے گزرنے لگے۔ انور نے بارہا سوچا
کہ اُس نے یاسمین سے شادی کر کے یقیناً اچھا کیا۔ ورنہ
جب تک یاسمین اُس کی زندگی میں شامل نہ ہوئی تھی
اُس کے شب و روز بالکل بے کیف گزرتے تھے آفس
اور ہوٹل اور کسی کسی شام کو ایک لڑکی جو اپنے لبوں پر
مسکراہٹوں کا نقلی خول چڑھائے رہتی تھی۔ بس یہی اُس
کی زندگی کے مشاغل تھے اور اب صبح کی بیڈ ٹی سے
لے کر ۔۔ رات کے سونے تک۔ ایک ایک لمحہ، ایک
ایک پل کتنا خوشگوار گزرتا تھا۔ یاسمین اُس کا بے حد
خیال کرتی تھی اور وہ اُس کی محبت کو عبادت کا درجہ
دیتا تھا۔ یہ عبادت یاسمین کے بے داغ کردار اور اعلیٰ
صفات کو دیکھتے ہوئے کچھ بھی نہ تھی۔ بس ایک حقیر سا
نذرانۂ عقیدت ہی تو تھی۔ اُس کی کم گوئی، سنجیدگی اور
خاموشی بھی اُسے پسند تھی۔ صرف اُن لمحوں کے سوا
جب وہ ہنسنے ہنسانے کے موڈ میں ہوتا اور یاسمین سے
بھی ایسے ہی برتاؤ کی توقع کرتا۔ لیکن یہ کوئی اتنی اہم بات
نہ تھی جسے لیکر وہ اپنی اچھی بھلی زندگی کو روگ لگا لیتا۔ یہ
خاموشی تو یاسمین کی فطرت تھی۔ اُس کی ادا تھی۔ اُس کے کردار
کا ایک جزو تھی جسے اگر یاسمین سے علیحدہ کر دیا جاتا تو
شاید پھر یاسمین "وہ" نہ رہ جاتی جو تھی۔ اُسے اپنی یاسمین
کا یہ رُوپ بہت عزیز تھا۔

اتوار کا دن تھا۔ انور بستر میں کاہلی سے لیٹا ہوا
کروٹیں بدل رہا تھا۔ یاسمین کئی بار آ کر اُسے اُٹھنے کے
لیے کہہ چکی تھی۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ یہ تو ہر چھٹی
کے دن ہوتا تھا۔ انور دس بجے سے پہلے بستر نہ چھوڑتا
تھا۔ انور نے ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل سے سگریٹ کی
ڈبیا اٹھائی تو یاسمین کی کتاب پھسل کر نیچے گر پڑی۔
انور نے لیٹے ہی لیٹے کتاب اُٹھالی۔ کتاب سے نکل کر
ایک تصویر بھی گر پڑی تھی۔ اُس نے اُسے بھی اُٹھالیا۔
رات میں سونے سے پہلے یاسمین یہی کتاب پڑھ رہی
تھی۔ پھر وہ تو سو گیا، یاسمین خدا جانے پڑھتے پڑھتے
کب سوئی تھی؟

انور نے کتاب میز پر رکھ دی اور تصویر دیکھنے
لگا۔ اُس نے سوچا تھا کہ یہ اس کا اور یاسمین کا گروپ
فوٹو ہوگا کیونکہ یاسمین کی اکیلی تصویر کوئی بھی نہ تھی۔ ہر
تصویر میں وہ اُس کے ساتھ تھا۔ لیکن ۔۔ لیکن یہ تصویر
اُس کے ساتھ کی نہ تھی۔ یاسمین کے ساتھ کوئی اور
نوجوان تھا جس کا ایک ہاتھ اُس کی کمر کے گرد حمائل تھا
اور یاسمین چند ماہ کے ایک بچے کو گود میں لیے ہوئے
بیٹھی تھی۔

انور ایکدم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ تصویر اُس کی نظروں
کے سامنے تھی۔ لیکن جو کچھ سامنے تھا، اس پر یقین
کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اُسی وقت یاسمین اندر
آگئی اور اُس نے چھوٹی سی ٹی پائی پر رکھ کر ایک
پیالہ چائے کا بنا کر انور کی طرف بڑھایا۔ معاً اُس کی
نظر تصویر پر پڑی اور وہ کانپ اُٹھی۔ چائے چھلک گئی۔
اُس کا ہاتھ جل گیا۔ انور نے کپ تھامنے کے لیے ابھی
تک ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔ اُس نے خاموشی سے کپ
ٹرے میں رکھ دیا اور مجرم کی طرح کھڑی رہ گئی۔

"یہ ۔۔ یہ ۔۔ تصویر کس کی ہے؟"

انور نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر بے حد
سنگین لہجہ میں کہا۔

یاسمین خاموش رہی۔

"میں پوچھتا ہوں تمہارے ساتھ اِس تصویر
میں کون ہے؟ اِس مرد سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟
اور ۔۔ اور یہ بچہ ۔۔ کون ہے تمہارا؟"

یاسمین اب بھی خاموش تھی۔ اُس کے ہونٹ
کانپ رہے تھے اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں آنسوؤں
سے لبریز ہو کر چھلکنے کے لیے تیار تھیں۔ انور کو اُس کی
خاموشی پر پہلی بار اتنا زیادہ غصّہ آیا تھا۔ اس نے زنّاٹے
سے ایک تھپڑ یاسمین کے گال پر رسید کر دیا اور چیخ
کر بولا ۔۔

"بولو ۔۔ یہ سب کیا ہے؟ کیا تم نے اپنے
گناہوں کا راز چھپانے کے لیے مجھ سے شادی کی تھی؟
یہ بچہ تمہارے گناہ کی نشانی ۔۔ ؟ تمہاری ناجائز اولاد
ہے ۔۔ اور یہ مرد ۔۔ یہ ۔۔ یہ ۔۔!" ایک شوہر
اور ایک مرد کے سارے شکوک و شبہات سر اُٹھا کر
چیخ پڑے۔

"ایسا نہ کہو ۔۔ خدا کے لیے یہ سب نہ کہو!"
یاسمین نے تڑپ کر کہا ۔۔ "اتنا بڑا الزام نہ لگاؤ انور!"
وہ سِسک اُٹھی۔

"پھر یہ کس کی تصویر ہے؟" انور کا چہرہ سُرخ
ہو رہا تھا، جیسے وہ ابھی جھپٹ پڑے گا اور یاسمین کا
گلا دبا دے گا۔

"یہ ۔۔ یہ میرے شوہر اور بچے کی تصویر ہے۔"
یاسمین نے گویا اعترافِ جرم کیا اور پھر پھوٹ پھوٹ
کر رو دی۔

"تمہارا شوہر ! کہاں ہے اب وہ ؟"

"اُن کا انتقال ہوگیا — ڈیڑھ سال پہلے"

"اور بچہ — ؟"

"جمی میرا بچہ ہے۔ آپا نے اُسے پالا ہے۔ شہزاد کے انتقال کے بعد میری حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ اس لیے جمی کو آپا نے لے لیا۔"

"مجھ سے کیوں چھپایا ؟"

انور نے پژمردہ لہجہ میں پوچھا۔

"ڈیڈی کا خیال تھا کہ شاید آپ حقیقت کا علم ہوجانے کے بعد شادی نہ کریں۔ اور — اور انہیں معلوم تھا کہ میں — میں آپ سے —" یاسمین نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"اوہ !" انور کسی سوچ میں ڈوب گیا اور پھر اُس نے ہاتھ بڑھا کر یاسمین کا بازو تھاما اور اُسے اپنے پہلو سے لگا لیا۔

"یاسمین ! تمہاری ممتا کو مصلحت کے پردے میں چھپا کر تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی گئی۔ ورنہ — ورنہ جمی اس وقت تمہارے پاس ہی ہوتا۔ میں تمہارا درد سمجھتا ہوں — بلکہ — بلکہ ہمارا درد مشترک ہے۔ رضیہ کے انتقال کے بعد مجھے بھی اپنے جگر گوشہ سے دُور رہنا پڑا۔ میں نے تو سوچا تھا کہ اب شادی ہی نہ کروں گا لیکن تمہیں دیکھا تو اپنا عہد توڑنا پڑا۔"

یاسمین اُس کے کاندھے سے لگ کر سسک اُٹھی۔

"پگلی، یہ رونا دھونا بند کرو! اور ناشتے کے بعد فوراً تیاری کرلو۔ ہم پہلی گاڑی سے آگرہ چل رہے ہیں۔ اپنے جمی کو ساتھ لے آئیں گے اور جلد ہی کسی لمبی چھٹی میں کہیں بھی چلیں گے۔ تم پنّو سے مل لینا اور اگر اُس کی دادی نے اجازت دی تو پھر دونوں بیٹے ہمارے ساتھ ہی رہیں گے۔"

یاسمین کی آنکھیں ایک بار پھر چھلک اٹھیں۔ اُس وقت یاسمین انور کو سب دن سے زیادہ پیاری اور اپنی لگی۔ درد کے رشتے نے انہیں ایک دوسرے سے بے حد قریب کر دیا تھا۔ انور نے اس کے گال کو چوم لیا جس پر اُس کی انگلیوں کے سُرخ سُرخ نشان اُبھر آئے تھے۔ ●●

غزلیں

شاہد احسن مُرادآبادی

پرنس روڈ مغل پورہ دوئم - مرادآباد (یوپی)

★

اُلجھ رہا تھا تلاطم مرے سفینے سے
بچالیا اُسے تم نے بڑے قرینے سے

سیہ لباس میں وہ ایک مرمریں پیکر
اتر گیا مرے دل میں نظر کے زینے سے

کسی نے دل پہ مرے ہاتھ رکھ دیا تھا کبھی
ابھی تک آگ نکلتی ہے میرے سینے سے

شفق کے پھول ترے حُسن سے ہوئے شاداب
مہک گلاب میں آئی ترے پسینے سے

وہ میری گود میں سر رکھ کے رو دیے احسنؔ
بکھر گئے مرے دامن پہ کچھ نگینے سے

اقبال ماہر

۲۲۷-نخاس کہنہ - الہ آباد (یو-پی)

★

اس سوچ پر ہے کتنا تجھے اختیار سوچ
نازک ہے یہ سوال اسے بار بار سوچ

لمحوں کے خار زار میں بکھری ہے ہر طرف
دامن کی دھجیوں کی طرح تار تار سوچ

تیری عنایتوں کا بہت شکریہ مگر
کس کو مفر ہے غم سے مرے غمگسار سوچ

بیباکیِ نظر کا یہ ردِّ عمل ہوا
محتاط اور ہو گئی اک شرمسار سوچ

اک لمحۂ طرب بھی بڑی چیز ہے مگر
اندیشۂ مآل سے ہے سوگوار سوچ

شرقیؔ خالدی

اتوارہ - بھوپال (ایم-پی)

★

اجل آئے سر آنکھوں پر وہ مجھ سے اجنبی ک
وہ خود شاہد ہے میری زندگی ہی زندگیؔ

یہ کیوں دورِ تبسم لے کے آیا ماجرا کیا
زمانے او زمانے میری تیری دوستی کب

سلیقہ ہی نہ آیا مانگنے کا ہم کو سچ یہ
تری رحمت کے گنجینوں میں رحمت کی کمی

خزاں آئی تو آئی صرف میرے ہی نشیم
بہاروں کی شکایت کیا بہاروں میں کمی ک

مرا عالم بہت آباد ہے شرقیؔ جو عالم
اگر برباد ہے دُنیا تو یہ آباد ہی کب

روبی

کا آئندہ شمارہ

خواتین نمبر

ہوگا

اس شمارے میں

سرورق پر زینت امان کی دیدہ زیب اور رنگین تصویر کے ساتھ — **زینت کا چونکا دینے والا خصوصی انٹرویو**

دلچسپ ترین مستقل تصاویر فیچرز کے ساتھ ——— فلم ساز، کہانی نویس و ہدایت کار کیدار شرما کے یہ حیرت انگیز

ملاقات ۔ فلم اور فحش ادب پر عصمت چغتائی سے چاند گل کا چونکا دینے والا انٹرویو

- جب یوگیتا بالی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی • مالا سنہا کو صفِ اوّل کی اداکارہ بننے کے لئے کیا کرنا پڑا۔
- کاکروچ ——— ایک حقیر کیڑا ۔ جس نے ایک بڑی فلمی ہستی کو زندہ رہنے کا سبق دیا ———
- چیندو لال شاہ کی کامیابی کا راز ——— ؟

یہ چونکا دینے والی باتیں پہلی بار روبی میں پڑھئے اس کے علاوہ

اردو ادب کی مقبول ترین خاتون افسانہ نگاروں کے افسانے ——— غزلیں اور نظمیں

خواتین نمبر

یکم جون ۱۹۷۸ کو آپ اپنے شہر کے ہر بک اسٹال سے خرید سکتے ہیں

قیمت صرف : **ڈھائی روپے**

ایجنٹ حضرات آج ہی اپنے اضافہ شدہ آرڈر روانہ کریں۔

سرکولیشن منیجر **روبی میگزین** دریا گنج، نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰

سمبندھ

ہربنس لال،

۲۲-سیکٹر ۲۳-ہاؤسنگ بورڈ کالونی
فریدآباد (ہریانہ)

●

برادرم رحمٰن صاحب

آداب وخلوص

بیسویں صدی" کی اشاعت کے بیالیسویں سال پورے ہونے کی خوشی میں مبارکباد قبول فرمائیں۔ آپ نے خصوصی شمارہ میں شرکت کی دعوت دی تھی صدق دل سے شکرگزار ہوں افسوس کہ کہانی ارسال نہ کرسکا اور آپ کے نوازش نامہ کا جواب بھی نہ لکھ سکا۔ معافی چاہتا ہوں، اپنے گناہ کے کفارہ کی ادائیگی میں تازہ کہانی "سمبندھ" ارسالِ خدمت ہے۔ امید ہے کہانی آپ کو اور قارئین کو پسند آئے گی۔

نیازمند

ہربنس لال ساہنی

کچن کی کھڑکی کی سلاخوں میں اٹکا ہوا گہرے نیلے رنگ کا لفافہ دیکھ کر وہ گیس جلاکر وہ سبزی بنانے والی تھی لیکن اب وہ پہلے اُس لفافہ کو کھول کر دیکھنا چاہتی تھی گیس کا سوئچ آف کیا اور لفافہ لیے ڈرائنگ روم میں آگئی۔ دونوں بچے رومی اور نینٹو اسکول تھے۔ اُس نے دروازے کی چٹخنی لگائی اور صوفے پر بیٹھ کر لفافہ کھولنے لگی۔ اُس کے دل تیز ہوگئی۔ وہ بُری طرح ڈری ہوئی تھی۔ "نہ جانے اُس لفافہ میں کیا تھا؟" وہی ہوا جس کا اُ کسی انجانے چاہنے والے کا محبت نامہ تھا۔ نہ جانے کب کس وقت وہ باہر سے کچن کی اس لفافہ کو اٹکا گیا تھا۔" شکر ہے بھگوان کا ونود کی نظر نہیں پڑی اس پر۔ حالانکہ آفس پہلے کچن ہی میں کھڑے کھڑے ناشتہ کیا تھا۔

وہ محبت نامہ پڑھ چکی تو اُسے محسوس ہوا لکھنے والا ہندوستانی فلموں سے متأثر کیونکہ اُس نے ابتدا میں ایک فلمی گیت کے مکھڑے کا سہارا لے کر اُس کے حُسن کی تعریف جگہ جگہ بودی اور بے اثر زبان میں فلمی ڈائیلاگ کی سی طرزِ تحریر میں جان تک دے دینے اور ساری عمر اِس کی چاہت میں کنوارے رہنے کا عہد و پیماں کیا تھا اس نے لکھا تھا وہ شادی شُدہ ہے اور دو ننھے ننھے بچّوں کی ماں ہے لیکن دل کے ہاتھوں اُس کے لیے مجبور ہوگیا ہے۔ اپنی محبّت کے اظہار کو زوردار اور پُراثر بنانے کے لیے کس چھپی غزلوں کے اشعار جگہ جگہ اپنے طور پر موقع محل سے استعمال کیے تھے۔ شاید وہ جا اسے شعروشاعری سے بھی لگاؤ ہے۔ اور اسی لیے وہ جب پُورا خط پڑھ چکی تو اُس کے ذ بات یہی اُبھری کہ اس کا مذاق کتنا پست اور ناپختہ ہے۔ اُس نے آخر میں اس طرح پریم جُرأت کرنے کے لیے معافی چاہی تھی لیکن ساتھ ہی استدعا کی تھی کہ وہ کم از کم ایک بار کمرے کے دروازے میں کھڑی رہ کر اُسے محض دیکھ لینے کا موقعہ ضرور دیا کرے۔ اپنی پہچ اُس نے لکھا تھا کہ آج شام وہ چھ بجے اُس کے گھر کے سامنے والی سڑک پر اُسے دیکھتا آج وہ سُرخ بوشرٹ اور سیاہ پینٹ پہنے ہوگا اُس کے ہاتھ میں کوئی میگزین ہوگا۔

اُس نے محسوس کیا جیسے وہ بہت بڑی ہوئی ہے۔ اُس نے اپنے آپ کا جائزہ لی ابھی تک دھک دھک کر رہا تھا۔ اُس کے ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمکنے لگی تھ ہوئی تو سامنے آئینے میں اپنی صورت زرد ہوتی نظر آئی۔ اس نئی آفت سے یقیناً اُسے ڈر لگنے لگا۔

حضرت احمد حضرویہؒ وفات سے قبل ستر ہزار دینار کے مقروض
تھے تمام قرضہ صرف خیرات و صدقات کرنے کی وجہ سے ہوا تھا۔ چنانچہ
جب قرض خواہوں نے تقاضا کیا تو آپ نے دعا کی کہ یا اللہ میں تو
اس وقت حاضر ہو سکتا ہوں جب ان کے قرض سے سبکدوش
ہو جاؤں کیونکہ میری حیات تو ان کے پاس گروی ہے۔
ابھی یہ دعا ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ دروازے پر سے آواز
آئی کہ لوگ اپنا قرض لے لیں۔
اور جب سب نمٹ گئے تو آپ کا انتقال ہو گیا۔

حضرت ابوالعباس السیاریؒ ایک مرتبہ اخروٹ خریدنے
دکان پر پہنچے اور اس کو اخروٹ کی رقم دی۔ دکاندار نے
اپنے ملازم سے کہا کہ آپ کو بہت نفیس اخروٹ چھانٹ کر دے دو۔
آپ نے پوچھا کہ کیا یہ تم ہر خریدار کے ساتھ یہی طریقہ اختیار کرتے ہو؟
اس نے جواب دیا۔ "نہیں، لیکن آپ کو عالم ہونے کی وجہ سے خراب
اخروٹ دینا پسند نہیں کرتا۔ آپ نے فرمایا: میں اپنے علم کو اخروٹ
کے عوض میں فروخت کرنا معیوب سمجھتا ہوں" اور یہ فرما کر
اخروٹ واپس لیے بغیر چلے آئے۔

میں مبتلا ہو گئی کہ یہ لفافہ ونود کو دکھا دے
یا نہ دکھائے۔ دونوں صورتیں پریشانی کا باعث
تھیں۔ ونود لفافہ دیکھتے ہی اور خط پڑھتے ہی
بجلی ہی کی طرح برس پڑے گا۔ وہ پھر
یہی الزام عائد کرے گا "یہ سب تمہارے ہی ساتھ
کیوں ہوتا ہے اور بھی تو کالونی میں عورتیں رہتی ہیں۔
پاس پڑوس میں تم سے بھی زیادہ حسین عورتیں
ہیں لیکن اُن پر آئے دن لوگ اسی طرح عاشق
ہو کر پیار اور محبت بھرے خطوط لکھتے ہیں؟"
ان باتوں کا جواب وہ کیا دے سکتی ہے۔
آج وہ سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ
آخر کیا خاص بات ہے کہ اس کی جوانی کے
ابتدائی عرصہ میں اُس پر فریفتہ ہونے والوں
اور محبت کا اظہار کرنے والوں کی فہرست
لمبی ہے۔ بہت دن پہلے کے واقعات کو یاد نہ
بھی کرے، ابھی حال ہی میں ہوئی دو تازہ واردات اُس
کے ذہن میں تازہ ہیں ــــــ اب اس کا بی
پٹھان سیف زادہ ہی کو دیکھیے۔ اُس واقعہ
کے بعد اس کی اتنی اچھی دوست آشا سے تعلق
ختم ہو گیا۔ مسز سیف زادہ کو آشا نام اُسی نے
دیا تھا ــــــ آشا کو کابل گئے دو ماہ ہوئے
تھے اُس کی غیر حاضری میں دو ایک بار سیف زادہ
کو کھانے پر آشا کی دوستی ہی کی وجہ سے بُلایا
تھا لیکن اُسے جو غلط فہمی ہوئی خطرناک صورت
اختیار کر گئی۔ وہ اُس کے مارکیٹ اور سلائی اسکول
جانے آنے کے اوقات میں راستے میں ہر روز ملنے لگا۔
اُس کی نگاہوں میں ناچتی ہوئی ہوس سے اُسے
ڈر لگنے لگا۔ ایک روز وہ دن ہی میں گھر آگیا۔
دروازہ اندر سے بند تھا۔ دستک ہونے پر اُس نے
پُوچھا تھا کون ہے؟ جب یہ معلوم ہوا باہر سیف زادہ
ہے، اُس نے دروازہ نہیں کھولا تھا۔ اُس نے
اُسے بُرا بھلا ہی نہیں کہا تھا بلکہ نہایت درشتگی
سے پھٹکارا بھی تھا۔ اتفاق سے بڑا لڑکا نیٹو گھر
ہی میں تھا۔ شام کو جب ونود آیا۔ اِس سے پہلے
کہ سیف زادہ کے بارے میں کچھ بتاتی نیٹو نے
سارا واقعہ سُنا دیا۔ ونود نے وہ طوفان کھڑا کیا۔
جیسے سیف زادہ کو اُسی نے بُلایا تھا۔

اُس واقعہ کے بعد آشا کے ہاں آنے
جانے کا سوال ہی نہ تھا۔ سیف زادہ سے چھٹکارا
مِلا تو اپنے ہی کوارٹر کی دوسری منزل میں رہنے
والے گلاٹی صاحب کی نگاہوں میں پتلیاں
ناچتی ہوئی دکھائی دیں۔ شام کو آتے ہی اکثر
زینے کے پاس کھڑا کرتے۔ پُر اشتیاق نگاہوں سے
اِدھر دیکھتے۔ نمستے کہتے اور اپنی سمجھ میں دلآویز
مُسکراہٹ پھینکتے ہوئے اپنے گھر چلے جاتے۔
کئی دنوں تک یہ عمل جاری رہا شاید اس لیے کہ
وہ شام کو اُن کے آنے پر اتفاق سے باہر ہی ملتی
رہی تھی۔ گلاٹی صاحب کی غلط فہمی کی وجہ بھی
یہی تھی۔ وہ صاحب ہمت کر کے ایک شام جب
اُن کی بیوی گھر میں نہیں تھی اُس کے ہاں پہنچ گئے۔
آتے ہی اُس کے شانوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر
بہت پیار سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
مُسکرانے لگے۔ یہ سب اِس عجلت سے ہوا کہ وہ
گھبراہٹ میں پسینہ پسینہ ہو گئی۔ ایک جھٹکے
سے وہ پیچھے ہٹ گئی اور روہانسی آواز میں
کہنے لگی "آپ شاید بُرا مان گئیں۔ میں پوچھنے
آیا تھا وہ کہیں گئی ہیں کیا؟"، یہ واقعہ بھی اُس
نے ونود کو بتا دیا تھا۔ ونود غصّے سے کانپنے لگا
وہ ڈر گئی کہ آج وہ کہیں گلاٹی صاحب کا خون نہ
کر دے! لیکن اُسے بے حد صدمہ ہوا، جب
ونود نے اُسے بدچلن کہہ کر اُسے دوسری صُبح
میکے چلی جانے کے لیے کہہ دیا۔ اُس نے خودکشی
تک کر لینے کی بات سوچی تھی۔ ہندوستانی
عورت کے لیے شوہر ہی سب کچھ نہ ہوتا تو وہ
ونود سے نفرت کرنے لگتی لیکن اِس کے بعد
اُس کے دل میں ساری مردذات سے نفرت
سی ہونے لگی تھی۔ وہ سوچتی تھی مرد شوہر ہو
یا عاشق دونوں صورتوں میں عورت کو حقیر
اور ذلیل سمجھتا ہے۔ شوہر جب اپنی بیوی کی
حفاظت نہیں کر سکتا تو اُسے بدچلن کہہ کر ذلیل
کرتا ہے سیف زادہ اور گلاٹی کا عشق عورت
کو بدچلن سمجھنے کی غلط فہمی میں جا گِرتا ہے۔

آج وہ اپنے آپ سے جواب چاہتی
تھی کہ آخر اِس طرح کے واقعات اِس کی زندگی
سے کیوں وابستہ ہیں وہ طے کر چکی تھی کہ یہ لفافہ
ونود کو نہ دکھائے گی۔ وہ خود ہی اپنے طور پر
اِس نئی مصیبت سے نپٹ لے گی۔ سب سے
پہلے اُس نے اپنے دل میں اِن چند باتوں کا فیصلہ
کیا۔ وہ کسی دوسرے مرد سے بہت سوشل بن کر
بات نہ کرے گی چاہے وہ کتنا ہی فیملی فرینڈ کیوں

کے لیے بھی ونود سے کہے گی اور خود بہت زیادہ آنے جانے سے گریز کرے گی۔ یہ سب طے کر لینے کے بعد وہ اپنے گھر کے کام میں لگ گئی۔ کام سے فارغ ہوتے ہی وہ پھر اُس لفافہ کو کھول کر خط پڑھنے لگی۔ اُس کی تحریر اور اُس میں لکھے ہوئے اشعار اُسے پھر لیست اور بچکانہ معلوم ہوئے، لیکن شام ہونے تک ایک آدھ بار اور اُسے پڑھ لینے سے اپنے آپ کو نہ روک سکی۔ شام ہوئی تو جیسے کا انتظار کرنے لگی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی وہ کون ہے جس نے یہ خط لکھا ہے۔ کھڑکی کا پردہ ایک طرف ہٹا کر وہ چھپ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کی نگاہیں سڑک پر ہر آنے جانے والے پر ٹِک کر رہ گئیں کہ کس نے سیاہ پینٹ اور سُرخ بوشرٹ پہن رکھی ہے اور ہاتھ میں میگزین ہے ——

آخر اُسے اس نے پہچان لیا۔ اپنی پہچان کے لیے اُس نے اپنا بتایا ہوا ہی لباس پہن رکھا تھا اور ہاتھ میں میگزین بھی تھا۔ وہ اُس کے کوارٹر کی طرف بار بار دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر مایوسی تھی کہ وہ باہر نہ آئی تھی۔ اُس نے ضرور محسوس کیا ہو گا کہ اُس کا اظہارِ محبت بیکار گیا —— یہ سوچ کر اُسے اطمینان ہوا "چلو بلا ٹل گئی ——"، وہ کھڑکی وہ کھڑکی کی اوٹ میں تھوڑی دیر تک یُوں ہی کھڑی رہی اور اُسے دُور تک جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اُس کے ذہن میں اُس کی پُرکشش قد و قامت، اُبھری۔ چہرہ وہ اچھی طرح اتنی دُور سے دیکھ نہ سکی تھی۔ البتہ اُس نے دیکھا تھا اُس کا رنگ ہلکا سا نولا تھا اور اُس نے باریک باریک مونچھیں رکھی ہوئی تھی۔ اُس کے سر کے بال بھی ماڈرن اسٹائل کے تھے۔ اُس کے

گھبرا گئی۔ وہ یہ سب کیوں سوچ رہی ہے؟ اُسے اس سے کیا دلچسپی ہے؟ وہ کھڑکی سے دُور ہٹ گئی۔

رات کے لیے کھانا بناتے ہوئے بھی وہ اُسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ اس لفافہ کا بوجھ اُس کے ذہن پر مستقل سوچ بن گیا تھا۔ وہ ونود کے ردِعمل سے واقف نہ ہوتی تو وہ لفافہ اُس کے حوالے کر کے اپنے ذہن کا بوجھ اُتار دیتی۔ لیکن اب اُسے خود ہی اُس سے نپٹنا تھا۔ ونود آیا۔ اُس نے حسبِ معمول بچّوں کے ساتھ اور ونود کے ساتھ کھانا کھایا۔ سب کچھ نارمل ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ میں وہ نارمل نہ تھی وہ شخص مسلسل اُس کے ذہن میں تھا۔ اُس کی بات ونود سے وہ کہہ نہ پائی تھی۔ شاید اسی لیے وہ اُس کے ذہن میں کسی نہ کسی طرح وہ جما بیٹھا تھا۔ وہ اِس واقعہ کو ونود سے چھپائے رکھنے کے لیے اپنے میں ہمّت نہ رکھتی تھی۔ وہ ہر لمحہ محسوس کرتی کہ وہ شاید ابھی ونود سے اُس کے بارے میں بتانے والی ہے لیکن ایک دم وہ چونک پڑتی۔ یہ اُسے نہ بتائے گی! اس کے اس رویّہ کو ونود نہ سمجھ سکا تھا کیونکہ یہ سب اُس کی ذہنی کشمکش تھی جس کا اظہار اُس پر نہ ہو سکا تھا۔ پھر بھی ونود اُس کی ذہنی کیفیت کو معمولی سے شک کی حد تک محسوس کر رہا تھا۔ شاید اسی لیے اُس رات اُس وقت اُس نے اس سے پُوچھا تھا۔ کیا بات ہے؟" نیند کیوں نہیں آ رہی ہے؟" جب ونود کی یوں ہی آنکھ کھُل گئی تو پاس لیٹی ہوئی بیوی کے بارے میں اُسے محسوس ہوا، وہ سو نہیں پا رہی ہے —— اُس نے جواب میں "یوں ہی"، کہہ کر کروٹ بدل لی تھی۔

خلیفہ ہارون رشید نے ایک مرتبہ حضرت منصور عمارؒ سے پوچھا کہ مخلوق میں سب سے زیادہ عالم کون ہے اور سب سے زیادہ جاہل کون ہے؟

آپ نے فرمایا کہ سب سے زیادہ عالم تو وہ ہے جو فرماں بردار اور خوف رکھنے والا ہو اور سب سے زیادہ جاہل وہ ہے جو منڈر اور گناہ گار ہو۔

حضرت ابوتراب بخشیؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ جنگل میں مجھے انڈا روٹی کھانے کی خواہش ہوئی اور میں راستہ بھول کر ایک ایسی جگہ جا پہنچا جہاں کچھ اہلِ قافلہ شور و غل مچا رہے تھے اور مجھے دیکھتے ہی لپٹ کر کہنے لگے کہ اسی نے ہمارا سامان چرایا ہے اور یہ کہہ کر مجھ پر چھڑیوں سے حملہ آور ہو گئے۔ لیکن ایک بوڑھے نے مجھے شناخت کر کے لوگوں سے کہا کہ یہ چوری نہیں کر سکتے۔ یہ تو بہت بڑے بزرگ ہیں۔ یہ سن کر جب سب معافی کے خواستگار ہوئے تو میں نے کہا: مجھے تکلیف کا شکوہ اس لیے نہیں کہ آج میرے نفس کو خوب ذلت کا سامنا ہوا۔ پھر اس بوڑھے نے اپنے گھر لے جا کر میرے سامنے انڈا روٹی پیش کیا۔ اور جب مجھے کھانے میں کچھ تامل ہوا تو ندائے غیبی آئی کہ تجھے خواہش کی سزا مل گئی اب کھانا کھا لے۔

اُسے گھر سے باہر نکلے ہوئے کئی دن ہو گئے تھے وہ سبزی اور گھر کے چھوٹی موٹی چیزوں کے لیے نیٹو کو مارکیٹ بھیجنے لگی تھی۔ ونود نے بھی محسوس کیا تھا کہ وہ اب بہت کم باہر جاتی ہے۔ یُوں بھی وہ اُسے کبھی باہر ساتھ لے جانے کا بہت عادی نہ تھا۔ اور اسی لیے اُس کی اس تبدیلی سے اُسے کچھ پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ اُس کی عادت کی اِس تبدیلی پر اُس کے شکّی مزاج کو یک گونہ تسلّی ہی ہوتی تھی۔ اس تسلّی کے ساتھ ساتھ وہ کبھی کبھی یہ سوچ کر فکرمند ضرور ہوا تھا کہ اُس میں اب وہ پہلے والی گرمجوشی نہیں ہے۔ وہ اب بجھی بجھی سی کھوئی کھوئی سی رہتی ہے۔ اُس نے کئی بار کُرید کُرید کر پوچھا بھی تھا۔ اپنی عادت کے خلاف بے تکی باتیں بنا بنا کر اُسے ہنسانے کی سعی بھی کیا کرتا تھا لیکن سب بے سود ثابت ہوا۔

پاس کھڑی پر اکھڑی ہوجاتی۔ پردہ کی اوٹ سے اُسے ہر روز گھر کے پاس سے نکلتے ہوئے دیکھتی۔ وہ سوچتی تھی جب وہ اُس کے کہنے کے مطابق اُس روز باہر نہ آئی تھی تو وہ اب تک مایوس کیوں نہ ہوا۔ وہ کیوں اسی مقرّرہ وقت پر ہر روز اُس کی تلاش میں اِس کوارٹر کے بند دروازے کو گھورتا ہوا نکل جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو کبھی ملامت کرتی کہ وہ غیر ارادی طور پر اُسے ہر روز چھپ کر دیکھنے پر مجبور ہے۔ وہ اپنے آپ کو فوراً یہ کہہ کر خاموش کر دیتی۔ ”مجھے اُس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، میں تو صرف یہ دیکھتی ہوں کہ وہ مصیبت ابھی ٹلی ہے یا سر پہ اُسی طرح منڈلا رہی ہے؟“ وہ پریشان تھی کہ یہ مصیبت ابھی ٹلی نہیں۔ وہ ابھی تک گھر کے باہر بھی اُسے گھیرے ہوئے تھی اور گھر کے اندر بھی وہ اپنے آپ کو اُس کے ذہنی گھیراؤ سے نکل نہیں پا رہی تھی۔

اُس نے اپنے اِس فیصلے کو بدل دیا کہ وہ گھر سے باہر نہ نکلے گی۔ وہ آج پہلے ہی کی طرح بن سنور کر مارکیٹ جائے گی۔ خود سبزی لائے گی اور سردار ناول سینٹر سے اپنی پسند کا کوئی ناول لائے گی۔ وہ چھ بجے سے پہلے ہی جب مارکیٹ میں ناول والی دوکان کے پاس پہنچی تو اُس نے دیکھا وہ اُس کے ساتھ ساتھ اُسے دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ اُس نے نظر ملتے ہی اُس نے اسے نمستے کہی اور بہت پیار سے ساتھ بھاگتے ہوئے رومی کو اپنی گود میں اُٹھا لیا۔ وہ دل ہی دل میں سٹپٹا کر رہ گئی۔ لیکن بیچ سڑک میں اتنی بھیڑ میں اپنے شدید ردِّ عمل سے کوئی ہنگامہ کھڑا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ایسے کسی ہنگامے کی خبر ونود تک پہنچ جاتی۔ وہ اِس خیال ہی سے کانپ کانپ گئی۔ ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اُس نے اُس سے بہت نرمی سے پرارتھنا کی ”بھگوان کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو۔ میرے گھریلو جیون کو نشٹ نہ کرو۔ میں ایک بیاہتا بال بچے والی استری ہوں۔ آپ کو یہ شوبھا نہیں دیتا۔“ اُس نے یہ سب سُنا۔ چہرے پر جذبات سمٹ آنے سے جو گہری سُرخی آجاتی ہے وہ اُس نے محسوس کی۔ وہ سوچنے لگی شاید اِس کی پرارتھنا کا اُس پر گہرا اثر ہوا ہے۔ وہ ابھی تک رومی کو گود میں لیے ہوئے تھا۔ وہ ذرا تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھا اور ٹافیوں والی دوکان پر پہنچ گیا۔ مٹھی بھری ٹافیاں خرید کر رومی کی جیب میں بھرنے لگا۔ اب وہ بھی دکان پر پہنچ گئی تھی۔ رومی کو اپنی گود سے اُتارتے ہوئے بولا —— ”آپ نے یہ سب کہہ کر ایک عرصہ سے قائم ہوا سمبندھ ہی توڑ دیا ہے۔ لیکن میری اتنی التجا اگر آپ مان لیں تو آپ کا کچھ نہ بگڑے گا کہ آپ شام چھ بجے کے آس پاس مجھے باہر دکھائی دے جائیں تاکہ میں آپ کو دیکھ سکوں —— اِس سے زیادہ میں آپ سے کچھ نہیں مانگتا۔“

رومی کی اُنگلی پکڑ کر وہ اُسے جواب دیے بغیر آگے بڑھنے لگی تو اُس نے راہ روکتے ہوئے پوچھا —— ”آپ نے اپنے فیصلے سے مجھے آگاہ نہیں کیا؟“

وہ گھبرا گئی۔ اُس نے چور نظروں سے چاروں طرف دیکھا پھر ایک لمحہ کے لیے اُس کی نظریں اُس پر جم گئیں۔ وہ بھی منتظر نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ آہستہ سے یہ کہہ کر آگے بڑھ گئی —— ”ٹھیک ہے میں ہر شام آپ کو باہر دکھائی دوں گی۔“

●●

افسانہ نگار واجدہ تبسّم پر مقدمہ

میٹرو پولیٹن مجسٹریٹ دہلی سردار رگھبیر سنگھ کی عدالت میں رحمٰن نیّر ایڈیٹر ”بیسویں صدی“ دہلی نے دفعہ ۵۰۰ تعزیرات ہند کے تحت واجدہ تبسّم، ٹیپو سلطان، اشفاق احمد، سراج الدولہ ساکنان بمبئی اور رحیمی پریس بمبئی پر مقدمہ دائر کیا۔ دعویٰ کے بموجب افسانہ نگار واجدہ تبسّم نے اپنے ایک مضمون میں شری رحمٰن نیّر کے خلاف انتہائی توہین و ہتک آمیز الفاظ کا استعمال کیا تھا۔ گواہوں کے بیانات اور مدعی کے وکیل مسٹر ارجن داس کوہلی کی مدلل بحث کے بعد فاضل مجسٹریٹ نے تمام ملزمان کو زیرِ دفعہ ۵۰۰/۳۴ تعزیراتِ ہند کے تحت بطور ملزم طلب کیا ہے اور مقدمہ کی آئندہ سماعت اور تمام ملزمان کی حاضری کے لیے ۵ رجون ۱۹۷۸ء مقرر کی ہے۔

شوبھا اٹھ کر چلی گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ ایک تھالی میں آلو رکھے واپس آگئی اور سامنے بیٹھ کر آلو چھیلنے لگی۔ شوبھا اُس وقت بہت پیاری معلوم ہو رہی تھی۔ میں اُسے دیکھے جا رہا تھا۔ اچانک میری نظر ماتاجی پر پڑی تو میرے دل کو بڑے زور سے دھچکا لگا۔

ماتاجی کا چہرہ سفید تھا۔ اُن کی نظریں شوبھا کے اُس ہاتھ پر تھیں جس میں اُس نے چھری لے رکھی تھی جس سے وہ آلو چھیل رہی تھی۔

چھری تیز تھی۔ اُس کی موٹھ پر شاید نیلا پلاسٹک لگا تھا جو شوبھا کی مٹھی کے باہر نیلم کی طرح چمک رہا تھا۔

یکایک ماتاجی اٹھ کھڑی ہوئیں اور بولیں۔

"وجے بیٹا ذرا میرے ساتھ آؤ۔"

میں حیران تھا کہ ماتاجی کو اچانک کیا ہو گیا ہے۔ میں اٹھ کر اُن کے ساتھ چل دیا۔ شوبھا آلو لے کر رسوئی کی طرف چلی گئی۔

ماتاجی مجھے مکان کے اوپر بنے ایک کمرے میں لے گئیں اور دروازہ بند کر کے بولیں۔

وجے! تم نے سات آٹھ پہلے ایک سپنے کی بات مجھے بتائی تھی جس میں کسی عورت نے تم پر چھری سے حملہ کیا تھا۔"

"ہاں ماتاجی۔"

"کیا تمہیں اُس عورت کا چہرہ یاد ہے۔؟"

"ہاں ماتاجی! اُس کا رنگ دودھ کی طرح سفید تھا۔ اُس کے بال کالے تھے۔ آنکھیں کالی تھیں ہونٹ سُرخ تھے۔ اُس کے ہاتھ میں چھری تھی جس کے دستے میں شاید نیلم لگا تھا......"

اچانک میرے الفاظ حلق میں گھٹ گئے اور پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ شوبھا اُس عورت سے بہت ملتی جلتی تھی۔

"ہے بھگوان یہ کیا بھید ہے؟" میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ اب میں نے غور کیا تو مجھے شوبھا بالکل اُس عورت کی طرح نظر آئی۔ ویسی ہی خوبصورت!۔ اور عجیب بات یہ کہ اُس کے ہاتھ میں ویسا ہی خنجر تھا۔

اُسی لمحہ ایک نیا خیال میرے ذہن میں آیا۔ یہ چھری جس سے شوبھا آلو چھیل رہی تھی۔ ماتاجی کی رسوئی میں تھی، شوبھا کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔

میں نے بلند آواز میں کہا۔

"ماتاجی اس میں شک نہیں کہ شوبھا میں سات سال پہلے نظر آنے والے اُس سپنے کی عورت کی شباہت ہے۔ لیکن یہ چھری تو آپ کی رسوئی ہی کی تھی۔ یہ محض اتفاق...."

"نہیں وجے! یہ چھری میرے گھر کی نہیں ہے" ماتاجی نے گمبھیر آواز میں جواب دیا۔ یہ چھری میں نے آج پہلی بار دیکھی ہے۔ جبھی تو مجھے خیال آیا۔ اس کی صورت دیکھ کر مجھے اس کا چہرہ مانوس ضرور لگا تھا۔ لیکن جب وہ چھری لے کر آلو چھیلنے بیٹھی تو فوراً مجھے تمہارا وہ سپنا یاد آ گیا۔ یہ عورت انسان نہیں بیٹا۔ کوئی ڈائن ہے۔ کوئی بھوت پریت ہے!"

"اوہ ماتاجی آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ میرا خیال ہے یہ محض اتفاق ہے کہ وہ اُس سپنے والی عورت سے ملتی جلتی ہے اور اس کے ہاتھ میں چھری بھی اُس سے ملتی جلتی آگئی ہے۔"

"بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔" ماتاجی نے کہا، "تم میرے ساتھ ذرا اسٹور میں آؤ۔" میں ماتاجی کے ساتھ اسٹور میں گیا۔ اسٹور میں ماتاجی کاٹ کباڑ بھر کر رکھتی تھیں۔ ماتاجی ایک پُرانا بڑا سا بکس کھول کر کچھ دیر اُس کے کباڑ کو الٹ پلٹ کرتی رہیں۔ پھر انھوں نے ایک تصویر نکالی اور اُسے کپڑے سے صاف کرتے ہوئے بولیں "یہ دیکھ۔ کیا یہ تیری بیوی سے ملتی جلتی تصویر نہیں ہے؟"

وہ تصویر چھ انچ آٹھ انچ کے فریم میں تھی اور آئل پینٹنگ تھی۔ تصویر میں ایک عورت سفید ساڑی میں لپٹی کھڑی تھی اُس کے کالے بال کھلے ہوئے کاندھے پر پڑے تھے۔ اُس کے ہاتھ میں ایک چمکتا خنجر تھا جس کی نیلی موٹھ مٹھی سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ وہ عورت بالکل شوبھا جیسی نہ تھی لیکن وہ جس پوز میں تھی وہ بالکل وہی پوز تھا جس پوز میں سات سال پہلے خواب میں وہ عورت مجھے نظر آئی تھی۔"

اسرار لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے کچھ دیر تصویر دیکھنے کے بعد پوچھا۔

"یہ تصویر آپ کے پاس کہاں سے آئی ماتاجی؟"

"تیرے پتا کے مرنے کے بعد میں نے بڑا مکان بیچ کر ایک چھوٹا مکان خریدا تھا۔ تیری پیدائش اسی مکان ہوئی تھی۔ میں اُس مکان میں چار پانچ مہینہ رہی تھی۔ جس رات تو پیدا ہوا تھا اُسی رات میں نے سپنے میں اسی عورت کو دیکھا تھا۔ بالکل اسی طرح چھری لیے۔ یہ تصویر اس مکان میں کاٹ کباڑ میں پڑی ملی تھی جس کو صاف کر کے میں نے دیوار پر لگا دیا تھا۔

اس کے بعد یہ عورت ہر دوسرے تیسرے دن میرے سپنوں میں آنے لگی تو مجھے کچھ ڈر محسوس ہوا میں نے پاس پڑوس کی عورتوں سے ذکر کیا تو ایک بوڑھی عورت نے مجھے بتایا کہ اس مکان میں ایک عورت کا بھوت رہتا ہے جس نے کسی زمانے میں اپنے شوہر کو چھری سے قتل کر کے اُس کا خون پی لیا تھا۔ کیونکہ اُس کا شوہر کسی دوسری عورت سے محبت کرنے لگا تھا۔ بعد میں اُس عورت نے

بھی خود تو سہا سی دے لی تھی۔ اس لیے بیٹا میرا دل کہہ رہا ہے شوبھا وہی عورت ہے!"

مجھے بھوت پریت پر یقین نہیں تھا۔ ماتا جی کی بات میرے دل میں تو جمی نہیں۔ ماتا جی نے میرے چہرے سے میرے خیالات بھانپ کر کہا۔

"اچھا وجے آج تو اس سے پوچھ کر وہ یہ چھُری کہاں سے لائی ہے جبکہ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ چھُری اس گھر کی نہیں ہے۔"

"اچھی بات ہے ماتا جی میں! آج پوچھ لوں گا۔ مجھے یقین ہے ضرور ان باتوں کا کوئی معمولی سا جواب ہوگا۔ آپ ناحق پریشان ہو رہی ہیں۔"

یہ کہہ کر میں ماتا جی کو سمجھا بجھا کر نیچے تو لے آیا۔ لیکن خود میرے دل میں بھی ایک نامعلوم خوف سر اُبھارنے لگا تھا۔ اور طرح طرح کے وسوسے دل میں آنے لگے تھے۔ ہم نیچے آئے تو دیکھا شوبھا باورچی خانہ سے ٹرے میں گرم گرم پکوڑوں کی پلیٹ لیے چلی آرہی ہے۔ اُس نے پلیٹ میز پر رکھ دی تو میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے کہا "شوبھا تم بیٹھو۔ میں ابھی آیا۔"

یہ کہہ کر میں باورچی خانہ میں آیا۔ باورچی خانہ میں آلو کے چھلکے ابھی تک رکھے تھے۔ لیکن آپ میری حیرت کا اندازہ نہیں کرسکتے جب میں نے دیکھا تھالی میں وہ نیلے دستے والی چھُری نہیں تھی ایک پُرانا سا چاقو پڑا تھا جسے میں پہچانتا تھا۔

"ہے بھگوان یہ کیا اسرار ہے۔" میں نے دل ہی دل میں کہا اور واپس آکر شوبھا سے پوچھا۔

"شوبھا وہ چھُری ہے کہاں جس سے تم ابھی آلو چھیل رہی تھیں؟"

"وہیں باورچی خانہ میں تھالی میں پڑی ہے۔" شوبھا نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"وہاں تو نہیں۔ تھالی میں تو ماتا جی کا پُرانا چاقو پڑا ہے۔"

"اسی چاقو سے تو میں نے آلو چھیلے ہے۔" شوبھا نے میری طرف پلکیں جھپکا کر دیکھتے ہوئے جواب دیا اُس کے جواب پر لاشعوری طور پر میری اور ماتا جی کی نظریں ملیں۔ ہم دونوں کے دل میں ایک ہی خیال آیا۔

"شوبھا جھوٹ بول رہی ہے!

کیوں کہ ہم دونوں نے صاف طور پر وہ چھُری اور اُس کے نیلے دستے کا سرا دیکھا تھا۔

میرا خوف اچانک ہزار گنا بڑھ گیا۔ اور لاکھوں شکوک سنپولیوں کی طرح دماغ میں کُلبلانے لگے۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تو ماتا جی نے سر ہلا کر اشارے سے منع کر دیا کہ میں اب کچھ نہ کہوں۔

پکوڑے ختم ہوگئے تو شوبھا چائے بنانے چلی گئی۔ اکیلے رہ جانے پر ماتا جی نے کہا۔

"چھُری یقیناً شوبھا کے سامان میں چلی گئی ہوگی۔ بیٹے تو اس ڈائن کو وہیں چھوڑ آ جہاں سے لایا ہے۔ اور پھر کبھی اس کی صورت نہ دیکھنا!"

مجھے شوبھا سے محبت تھی اُس سے جُدائی کے خیال سے مجھے اپنے کلیجہ میں برچھیاں سی گھُستی محسوس ہونے لگیں۔ لیکن دوسری طرف ایک نامعلوم خوف مجھ پر چھانے لگا تھا۔

ماتا جی کی بات کا جواب دیے بغیر میں اُٹھ کر اندر کمرے میں گیا۔ ہم صرف ایک اٹیچی ساتھ لائے تھے جس میں میرے اور شوبھا کے کپڑے تھے۔ میں نے اٹیچی کھول کر ایک ایک چیز دیکھ ڈالی۔

لیکن وہ چھُری کہیں نہ تھی۔

اُس رات جب ہم دونوں سونے کے لیے لیٹے تو میں نے شوبھا سے کہا۔

"شوبھا جب تم آلو چھیل رہی تھیں تمہارے ہاتھ میں نیلے دستے کی چھُری تھی۔"

"نہیں تو۔ میرے ہاتھ میں تو پُرانا چاقو تھا۔" شوبھا نے جواب دیا۔

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔" میں نے [...] سے کہا۔ "میں نے اور ماتا جی نے اچھی طرح سے دیکھا ہے تم چھری سے آلو چھیل رہی تھیں۔"

اُس نے پُرسکون لہجہ میں جواب دیا۔

"مجھے معلوم ہے تمہاری ماں نے مجھے پسند نہیں کیا ہے وجے! وہ میرے خلاف تمہیں بھڑکا کر مجھے تم سے الگ کرانا چاہتی ہے۔"

"لیکن بات چھُری کی ہو رہی ہے۔ ماتا جی کا اس سے کیا تعلق ہے۔" میں نے کہا۔

"میرے پاس کوئی چھُری نہیں تھی۔" شوبھا نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دے کر جواب دیا۔ اب مجھے یقین آگیا کہ ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ شوبھا کے اس جھوٹ میں ضرور کوئی راز ہے! میں خاموش ہوگیا۔ میں فوری طور پر کوئی فیصلہ نہ کرنا چاہتا تھا۔ کچھ سوچنا چاہتا تھا۔

دوسرے دن ہم سُندر گڑھ واپس آگئے۔

ایک مہینہ ذہنی کشمکش میں گزر گیا۔ میں کوئی فیصلہ نہ کر پا رہا تھا۔ میں شوبھا سے پیار بھی کرتا تھا اور اُس سے ڈرنے بھی لگا تھا۔ میں اس درمیان شوبھا کی نظر بچا کر پورے گھر کی تلاشی لیتا رہا تھا۔ مجھے نیلے دستے والی اُس چھری کی تلاش تھی مجھے یقین تھا اگر شوبھا کوئی پُراسرار عورت ہے تو وہ چھُری اس کے سامان میں گھر میں کسی جگہ ضرور ہوگی۔

لیکن چھُری نہ ملی، میں نے گھر کا کونا کونا چھان مارا۔ سامان کئی کئی بار دیکھ لیا آخر مایوس ہو کر میں نے سوچ لیا کہ ضرور یہ کسی طرح کا نظری دھوکا تھا۔

لیکن اس واقعہ کے اڑتیسویں دن حالات نے ایک بالکل غیر متوقع موڑ لے لیا۔

میں سالگرہ منانے کا عادی نہیں ہوں۔ لیکن جانے کیسے اُس دن مجھے یاد آگیا کہ آج میری

پیدائش کا دن ہے۔ پہلی بار میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں سالگرہ مناؤں۔ لیکن بھگوان جانے یہ خوف تھا یا کچھ اور میں شوبھا کو اپنی سالگرہ میں شامل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے فون کر کے پانچ چھ قریبی دوستوں کو کلب میں دعوت دیدی اور شوبھا سے بہانہ کر دیا رات کو ایک دوست نے دعوت کی ہے اس لیے دیر سے آؤں گا۔

پارٹی رات کو ایک بجے تک چلتی رہی۔ میں نے بھی اُس دن وہسکی ذرا زیادہ پی لی۔ ڈیڑھ بجے گھر پہنچا۔ میرے پاس باہری دروازے کی چابی تھی۔

شوبھا سو گئی تھی میں نے اُسے جگانا مناسب نہ سمجھا۔ اس لیے ڈرائنگ روم میں صوفہ ہی پر لیٹ گیا۔ اور وہیں سو گیا۔

عجیب بات یہ تھی کہ اُس رات بھی بادل چھائے ہوئے تھے۔ فضا میں گھٹن سی تھی جیسی کسی طوفان کے آنے سے پہلے ہوتی ہے لیٹتے ہی میری آنکھ لگ گئی۔ نیں پہر رات کو نہ جانے کس وقت اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ باہر طوفان آ گیا تھا۔ میری نظریں کھڑکی پر تھیں جہاں سے باہر کا منظر بجلی کی چمک میں صاف نظر آتا تھا۔

اچانک میری نظر اُس دروازہ پر پڑ گئی جو میرے بیڈ روم تک جاتا تھا۔

میری نس جہاں تھی وہیں رک گئی۔

دروازہ میں شوبھا کھڑی تھی۔ سفید ساڑی میں ملبوس۔ اُس کے کھلے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اُس کے ہونٹ سُرخ تھے۔ اُس کے ہاتھ میں وہی چھُری تھی جس کے دستے کا نیلا سرا اُس کی مٹھی کے باہر چمک رہا تھا۔

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھتا رہا۔ وہ پہلے خواب کے منظر کی طرح آہستہ آہستہ بائیں جانب سے میری طرف بڑھی۔ اُس کا خنجر والا ہاتھ اوپر اُٹھتا چلا گیا۔ وہ اس طرح چل رہی تھی جیسے خواب میں چل رہی ہو یا اپنا ترنم کے اثر میں ہو۔ میرا جسم جیسے مفلوج ہو چکا تھا۔

اُس نے میرے قریب آتے ہوئے کہا۔

"تم میرے شوہر ہو۔ جنم جنم سے تم میرے شوہر ہو۔ تمہارا جسم تمہاری آتما میری ہے۔ میرے ہوتے تم کسی دوسری عورت کو پیار نہیں کر سکتے! میں تمہارا خون پی جاؤں گی! میں تمہارا خون پی جاؤں گی! میں تمہارا۔۔۔"

وہ قریب آ چکی تھی۔ اچانک اُس کا چھُری والا ہاتھ تیزی سے نیچے آیا اور پھر نہ جانے کیسے میرے اندر زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے خود کو صوفہ سے نیچے گرا دیا۔ میں نے صاف طور پر دیکھا چھُری عین اُس جگہ صوفہ میں دستے تک گھُس گئی جہاں میرا سینہ تھا۔

شوبھا واپس پلٹ گئی۔ دروازہ کے پاس جا کر مُڑی اور پھر دائیں طرف سے میری طرف آتے ہوئے بولی۔

"تم اس دھرتی پر جس رُوپ میں آؤ گے میں تمہیں پہچان لوں گی۔ تم مجھ سے بچ کر نہیں جا سکتے۔ تم مجھ سے بے وفائی نہیں کر سکتے۔ میں تمہاری آتما کی مالک ہوں۔"

وہ پھر میرے قریب آ گئی تھی، اور اِس بار عجیب بات یہ تھی کہ میرا جسم مفلوج نہیں ہوا تھا۔ شاید یہ موت کے خوف کا اثر تھا۔ اِس بار میں تیار تھا۔ وہ جیسے ہی میرے نزدیک آئی، اُس کا ہاتھ نیچے آنے سے پہلے میں اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور میں نے اُس کی گردن دونوں ہاتھوں میں دبوچ لی۔

اُس وقت جان کے خوف سے میں اپنے ہوش میں نہ رہا تھا۔ میں پوری قوت سے اُس کا گلا دباتا رہا۔ اُس کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔ میں نے اُس کا چھُری والا ہاتھ نیچے گرتا ہوا دیکھا اُس سے خنجر چھوٹ کر نیچے گرتے دیکھا۔ اور پھر اُس کا جسم بے جان ہو کر میری باہوں میں جھول گیا۔

اُسی وقت میری آنکھ کھل گئی۔

لیکن اس بار ہوش میں آنے پر منظر اور بھی زیادہ خطرناک اور عجیب تھا۔ باہر کوئی طوفان نہ تھا۔

عجیب بات یہ تھی کہ میں صوفہ کی جگہ اپنے بستر پر تھا۔ میرے برابر میں شوبھا پڑی تھی۔ میرے ہاتھ شوبھا کی گردن پر تھے۔

اور شوبھا مُردہ تھی!

اس سے بھی عجیب بات یہ تھی کہ وہ نیلے دستے والا خنجر ہمارے درمیان پڑا تھا۔

شوبھا کو مُردہ دیکھ کر ایک بار تو میری جان ہی نکل گئی۔ میں نے اسے قتل کر دیا تھا پھانسی کا پھندا مجھے اپنے گلے میں کستا ہوا محسوس ہونے لگا۔

یہ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں کلب سے واپس آکر صوفہ پر سویا تھا۔

بہت دیر تک میں ساکت پڑا سوچتا رہا کہ یہ میں نے کیا کیا؟۔ اور اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔؟

قتل کے الزام سے بچنے کی اب ایک ہی صورت تھی۔ اور وہ یہ کہ شوبھا کی لاش کو کہیں پھینک دیا جائے۔ جہاں سے وہ کبھی نہ مل سکے۔ اور صبح کو اچانک شوبھا کے غائب ہونے کی رپورٹ درج کرادی جائے۔ اُس وقت مجھے شوبھا کی موت کا کوئی افسوس نہ تھا صرف اپنی جان بچانے کی فکر تھی یہ فیصلہ کر کے میرا خوف کچھ دُور ہو گیا۔ میں جلدی سے اٹھا۔ پہلے میں نے ڈرائنگ روم میں آکر اُس صوفہ کو دیکھا جس پر میں سویا تھا

صوفہ اُسی طرح تھا اس میں چھُری لگنے

کا کوئی نشان نہ تھا۔

اِس کا مطلب ہے دوسری بار پھر میں نے ویسا ہی خواب دیکھا تھا۔ جیسا سرائے میں دیکھا تھا میں نتو بھا کی لاش کار میں ڈال کر اُسی پہاڑی پر لایا جہاں ہم ملے تھے کچھ دُور لاش کو کاندھے پر بھی لادنا پڑا۔ پھر میں لاش کو دریا میں ڈال کر آ گیا۔

دوسرے دن میں نے بڑی صفائی سے جھوٹ بول کر پولیس کو یقین دلا دیا کہ میری بیوی اچانک غائب ہو گئی ہے۔

اِس بات کو آج ایک سال بیت چکا ہے۔ پولیس کو مجھ پر کوئی شک نہ ہوا۔ میں قتل کے الزام سے تو بچ گیا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ میرا انجام آ پہنچا ہے۔ کہانی ختم ہو چکی ہے۔ آج میری سالگرہ ہے۔ باہر ویسا ہی خوفناک طوفان ہے۔ اور میں جانتا ہوں وہ آنے والی ہے۔ کل رات وہ خواب میں آئی تھی اور کہہ گئی تھی۔ کل میری سالگرہ پر وہ مجھے لینے آئے گی۔ اور اِس بار مجھے اُس کے ساتھ ضرور جانا پڑے گا۔۔"

ڈاکٹر جاوید نے خط ختم کرنے کے بعد انسپکٹر جسونت کی طرف دیکھ کر کہا۔

"عجیب خط ہے۔ کیا یہ خط یہیں لاش کے پاس ملا تھا؟"

"ہاں۔ اور حیرت ناک بات یہ ہے کہ دروازہ اندر سے بند تھا" انسپکٹر نے جواب دیا۔ کیا یہ ممکن ہے ڈاکٹر کہ اُس نے خودکشی کی ہو۔ ہو سکتا ہے اِس نے سینے پر یہ دونوں زخم اپنے ہاتھ سے لگائے ہوں۔ نیلی موٹھ والی چھری اِس کے پیروں کے پاس ہی پڑی تھی۔"

"یہ ناممکن ہے۔" ڈاکٹر جاوید نے سر ہلا کر کہا۔ اِن دونوں زخموں میں سے ہر زخم اتنا مہلک ہے کہ پہلے زخم کے بعد دوسرا زخم اپنے آپ لگانا ناممکن تھا۔"

"پھر آپ کے خیال میں اِس شخص کی موت کیسے واقع ہوئی۔ جبکہ کمرہ اندر سے بند تھا؟"

"میں بھوت پریت کا قائل نہیں۔" ڈاکٹر نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ لیکن اِس کیس نے مجھے بھی اُلجھن میں ڈال دیا ہے۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر کمرے سے باہر نکل گیا۔

●●

غزلیں

حضورؔ سہسوانی

راز منزل، سہسوان ۲۴۳۶۳۸ بدایوں (یو۔پی)

★

غم ہی بنے خود غم کا درماں، ایسا بھی ہو سکتا ہے
چارہ گر رہ جائیں حیراں، ایسا بھی ہو سکتا ہے

اپنی وفا پر ہم نہ ہوں نازاں یہ تو ہماری بات رہی
اپنی جفا پر وہ ہوں پشیماں، ایسا بھی ہو سکتا ہے

ہر آسانی دشواری کا روپ بدل سکتی ہے کبھی
ہر مشکل ہو جائے آساں، ایسا بھی ہو سکتا ہے

ان کے تغافل کے پیچھے کچھ ہو سکتی ہے مجبوری
بھول گئے ہوں عہد و پیماں، ایسا بھی ہو سکتا ہے

لے ڈوبے ساحل ہی سفینہ، ممکن تو ہے ایسا بھی
پار اُسے پہنچا دے طوفاں، ایسا بھی ہو سکتا ہے

دل میں ہمارے آئے تو ہیں مہماں کی صورت وہ حضورؔ
ہم ہوں ان کے دل میں مہماں، ایسا بھی ہو سکتا ہے

گوہرؔ عثمانی مرادآبادی

نئی بستی۔ مُرادآباد (یو۔پی)

★

دُنیا کو محبت کی ہوتی ہے خبر پہلے
دل بعد کو لُٹتا ہے ملتی ہے نظر پہلے

انجام کی تلخی کا احساس نہ کر پہلے
پھولوں کی طلب ہے تو کانٹوں سے گذر پہلے

آنسو نہ نکل آئیں افسانۂ غم سُن کر
پتھر کا بنا لیجے آپ اپنا جگر پہلے

پھر ذوقِ نظر کا بھی ہوگا تجھے اندازہ
جلوؤں کو ذرا اپنے تو عام تو کر پہلے

ہیں آج تو کچھ گوہرؔ مائل بہ کرم وہ بھی
دل نذر کروں پہلے یا ہوشِ نظر پہلے

حافظ نور علی نورؔ

معرفت خورشید افسر بسوان ضلع سیتاپور (یو۔پی)

★

غربت میں اک رفیقِ سفر بھی دکھائی دے
صحرا میں سایہ دارِ شجر بھی دکھائی دے

محوِ کرم اگر وہ نظر بھی دکھائی دے
آسان غم کی راہ گذر بھی دکھائی دے

ساحل تک آئے ہو تو اٹھا لو یہ سیپیاں
شاید کسی میں کوئی گہر بھی دکھائی دے

بازارِ علم و فن میں ہے بازیگروں کی بھیڑ
اے کاش کوئی اہلِ ہنر بھی دکھائی دے

میرا یہ حال ہے مجھے اپنا ہی گھر لگے
جلتا ہوا جو غیر کا گھر بھی دکھائی دے

نورؔ اس دلِ شکستہ کی کرچیں لیے چلو
شاید کہیں وہ آئینہ گر بھی دکھائی دے

روزگار

سرجیت

۴۴/سی۔ سدرشن پارک، موتی نگر
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۵

●

نیّر صاحب! سلام خلوص۔ "بیسویں صدی" کے لیے افسانہ "روزگار" بھیج رہا ہوں میں ایک تلخ حقیقت کو افسانہ کا رُوپ دینے میں کسی حد تک کامیاب ہو سکا ہوں۔ یہ آپ کی فن شناس نظر اور بلند ذوق قارئین ہی بتا سکیں گے۔

خلوص کار
سرجیت

میں نے بہت تلاش کیا لیکن مجھے اپنا بیگ نہ ملا۔ تکان سے چُور۔ اپنی آنکھیں زمین پر جھکائے میں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ اُس وقت سڑک پر سینکڑوں کاریں آجا رہی تھیں۔ میں آنکھیں اُٹھانے کی کوشش کرتا تو اُن کاروں کے نمبر دُھند کی طرح میرے سامنے اُبھرتے اور سر چکرانے لگتا۔ کاروں کے اُس ہجوم سے گھبرا کر میں کافی دیر تک چوک کے قریب کھڑا رہا۔ وہیں آخر کار ایک ٹرک والے نے مجھے اپنے ٹرک میں بٹھا کر اسٹیشن تک چھوڑ دیا۔

ڈھائی بجے میں پہنچا۔ بہت دیر تک کھٹکھٹانے کے بعد بھی کسی نے دروازہ نہ کھولا۔ شاید شنکر دوپہر کی نیند لے رہا ہوگا۔ باہر کھڑے کھڑے میں سوچتا رہا۔ کافی دیر بعد جب دروازہ کھلا تو شنکر میرے سامنے تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بہت تپاک سے اُس نے میرا استقبال کیا۔

شنکر نے اچھی خاصی زندگی بتائی ہے۔ اُس کی ماں بہت خوش قسمت ہے۔ اچھا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اسکول میں جا کر بہت پڑھ لکھ جاتے ہیں اور کچھ لوگ آگے بڑھ نہیں پاتے؟ اب دیکھیے نا۔ کستوری بھی تو اپنے گاؤں ہی کے اسکول میں شنکر کے ساتھ پڑھتی تھی لیکن اُس نے اسکول کیوں چھوڑ دیا؟

خیر۔ اسے چھوڑیے۔ میں کہہ رہا تھا شنکر خاصی زندگی بسر کرتا ہے۔ بہت سارا فرنیچر اُس نے اپنے چھوٹے سے کمرے میں سجا رکھا ہے۔ جب میں نے پوچھا کہ وہ اتنے چھوٹے کمرے میں کیوں رہتا ہے تو اُس نے بتایا کہ اتنی جگہ ملنا بھی قسمت کی بات ہے۔ شہر میں تو سونے کے لائق جگہ بھی مشکل سے ملتی ہے۔

اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد شنکر نے مجھ سے پوچھا، میں شہر کیوں آیا ہوں اور میں نے ساری باتیں بتا دیں۔ کس طرح اُس کے ساتھ پڑھنے والی میری بہن کستوری نے تیسری کلاس کے بعد اسکول جانے سے انکار کر دیا تھا اور کس طرح میری ماں نے اُسے زبردستی بھیجنے کی کوشش کی تھی...

اب تم بیچ میں مت ٹوکو ماں! سب لوگ جانتے ہیں کہ تم نے اُسے اسکول میں بھیجنے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔

ہاں۔ تو میں نے بتایا کہ جب کستوری نے آخر کار اسکول جانے سے انکار کر دیا تو کس طرح ہم لوگ اُسے اس عورت کے پاس لے گئے۔ جس نے کہا تھا کستوری کو گھر کا کام کاج

کس طرح پہلی دیوالی پر تو وہ وہاں سے لوٹی۔ لیکن اب پچھلے بارہ سالوں سے اس کا کوئی پتہ نہیں ہے۔

"تو تم شہر میں اپنی بہن کو ڈھونڈنے آئے ہو؟"

"ہاں" میں نے جواب دیا۔

اس پر وہ ہنسنے لگا۔ "تمہارا دماغ پھر گیا ہے! اس جگہ ایک عورت کا پتہ لگانا کیا کوئی آسان بات ہے؟ تمہیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کہاں رہتی ہے۔ نہ تمہیں یہی معلوم ہے کہ اُس نے شادی کرلی ہے یا وہ اکیلی ہے۔ فرض کرو کسی بڑے آدمی نے اُس سے شادی کرلی ہو اور اب وہ شہر سے دس میل دُور کسی بڑے بنگلہ میں رہتی ہو۔ تو تم اُسے کہاں ڈھونڈو گے؟

چونکومت ماں! اُس کی شادی کی بات سُن کر تعجب کرنے کی کیا ضرورت ہے! پہلی بار میں نے سُنا تھا۔ تو مجھے بھی دھچکا لگا تھا۔ لیکن سوچو تو سہی۔ لڑکیوں کو بڑی ہونے میں کتنا وقت لگتا ہے! اور پھر تم نے تو اُسے بارہ سال پہلے دیکھا تھا جب وہ دس سال کی چھوٹی بچی تھی۔"

شنکر نے مجھے بتایا کہ کستوری اب اتنی بڑی ہوگی کہ شادی کیا۔ چاہے تو اور بھی کچھ کرسکتی ہے۔

"یعنی تمہارا مطلب ہے..." میں پھر چونکا۔ کہیں تمہیں معلوم تو نہیں ہے کہ وہ کہاں ہے؟ اُس کے بچے بھی ہوگئے ہیں کیا؟"

"بچے؟" شنکر زور سے چلّایا اور پھر بہت کھونڈے سے انداز سے ہنسنے لگا۔

لیکن مجھے پتہ ہونا چاہیے کہ یہ کام کتنا بڑا اور مشکل ہے!

میں نے کہا کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر کستوری مر بھی گئی ہوگی تو کم از کم اُس کی روح کو یہ تو معلوم ہو ہی جائے گا کہ ہم نے اُسے اجنبی شہر میں اکیلے نہیں چھوڑا۔ اُسے گھر واپس لے جانے کی سر توڑ کوشش کی۔

اب تم فضول آنسو کیوں بہا رہی ہو ماں؟ میں نے یہ کب کہا کہ کستوری مرگئی ہے؟"

شنکر اور میں تلاش کرنے کے منصوبے بناتے رہے۔ پھر اُس نے مجھے غسل کے لیے پانی دیا اور کھانا تیار کیا۔ کھاتے ہوتے وہ مجھ سے گھر کی نئی پرانی باتیں پوچھتا رہا۔ میں نے بتایا کہ اس کی ماں نے دوسری شادی کرلی ہے۔ اور کسی طرح بے موقع برسات ہونے سے پچھلے سال ساری فصل خراب ہوگئی۔ کھانا کھا کر میری آنکھیں جھپکنے لگیں اور میں وہیں پیر پھیلا کر سوگیا۔ جب اُٹھا تو باہر اندھیرا تھا۔ میں نے غور کیا کہ کمرہ میں شنکر کے ساتھ کوئی عورت ہے۔

"یہ میری دوست ہے!" اس نے مجھ سے اُس کا تعارف کرایا۔ لیکن میرے خیال سے وہ وہی لڑکی تھی جس کے ساتھ وہ گھر والوں کی مرضی کے خلاف شادی کرنا چاہتا تھا۔

ہم تینوں نے ایک ساتھ کھانا کھایا۔

"چونکومت چچا! شہر میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ عورت مرد کے لیے کھانا بناتی ہے اور اُس کے ساتھ بیٹھ کر کھاتی بھی ہے۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟"

جوار اور مکئی کے آٹے کی تھی، لیکن اُس کا ذائقہ نہ جانے کیسا تھا۔ کسی طرح تھوڑا سا کھانا کھا میں اُٹھا تو شنکر نے مجھے بتایا کہ ہم لوگ باہر جارہے ہیں۔ مجھے اپنا کھویا ہوا بیگ یاد آیا جب میں نے اُس سے کہا کہ میرے پاس تبدیل کرنے کے لیے کپڑے نہیں ہیں تو اُس نے جواب دیا کہ شہر میں آکر ہفتہ کی رات باہر نہ گزارنے سے بڑی حماقت کوئی نہیں ہوسکتی۔ اس لیے میں اُنھیں کپڑوں میں چلوں۔ کوئی حرج نہیں ہے۔

"ایک گلاس مجھے دینا۔ میرا حلق بالکل خشک ہو رہا ہے۔"

ہاں! تو ہم لوگ گھر سے نکل کر باہر سڑک پر آگئے۔ ساری سڑک یہاں سے وہاں تک خوبصورت روشنیوں سے آراستہ تھی۔

کئی سڑکیں پار کرنے کے بعد ایک بڑی سی عمارت کے سامنے آگئے۔ اس کے اندر بینڈ بج رہا تھا۔ شنکر ہم تینوں کے لیے ٹکٹ لینے چلا گیا۔ میرے لیے سبھی کچھ ایک دُنیا تھا۔ باہر سے وہ عمارت بڑی معلوم ہوتی تھی لیکن جب ہم اندر پہنچے تو ایسا معلوم ہوا کہ اُس میں سمائی ہوئی بھیڑ اُس سے کہیں زیادہ بڑی ہے۔ وہاں سینکڑوں لوگ کھڑے تھے۔ کچھ لوگ لوہے کی میزوں کے گرد بچھی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ شنکر کے کہنے پر کچھ لوگوں نے ہمیں ایک میز اور کرسیاں لا کر دیں جونہی ہم بیٹھے۔ اُس نے ہم سے پوچھا کہ ہم کیا پئیں گے۔ میں نے کوکا کولا کے لیے کہا۔ لیکن وہ عورت مسکراتے ہوئے بولی۔ "بیئر!"

"چونکومت چچا!"

جلد ہی شنکر شراب لے آیا لیکن میں کافی دیر تک کھویا کھویا سا بیٹھا رہا۔ میرے سامنے

[illegible]
جا رہی تھی۔ جبھی بینڈ رکا اور کچھ دیر ٹھہر کر پھر بجنے لگا۔ شنکر اور وہ عورت اُٹھ کر ناچنے کے لیے چلے گئے۔ میں بیٹھا کوکا کولا کی چُسکیاں لیتا رہا۔ وہ دونوں مجھ سے کچھ دُور جس طرح ناچ رہے تھے، اُسے دیکھتے ہوئے مجھے شرم آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد بینڈ ختم گیا۔ شنکر اُس عورت کے ساتھ لوٹ آیا میں نے شنکر سے کہا۔ مجھے سردی لگ رہی ہے۔ اس پر وہ ہنس کر بولا" سردی تو لگے گی ہی۔ تم یہ کوکا کولا، جو پی رہے ہو؟"

"کیا اِس سے سردی لگنے لگتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں! تمہیں تو بیئر پینی چاہیے۔"

"میرا بھی یہی حال ہے۔" اور میرے لیے بیئر آگئی۔

ابھی میں نے آدھی ہی بیئر پی تھی کہ وہ بولا۔ اگر تم تھوڑا ناچ لو۔ تو گرمی آجائے گی۔"

"لیکن مجھے تو تم لوگوں کی طرح ناچنا نہیں آتا۔ تم تو انگریزوں کی طرح ناچتے ہو، میں ناچوں گا تو لوگ ہنسیں گے۔"

میری بات سُن کر شنکر ہنس پڑا۔ اُس کی ہنسی اتنی گونجدار تھی کہ اُس عورت نے پوچھا کیا بات ہے؟ شنکر نے انگریزی میں کچھ کہا اور اُس کے بعد وہ دونوں ہنسنے لگے۔ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا" ناچتے وقت لوگ اپنے آپ میں اتنے مدہوش رہتے ہیں کہ دوسروں کو دیکھنے کی اُنھیں فرصت نہیں ہوتی۔"

"ہاں اچھا!" میں نے ڈانس کیا آخر کار۔

جب ہم لوگ ناچنے کی بات کر رہے تھے اُسی وقت شنکر نے اچانک پیچھے کی طرف گردن موڑی۔ جہاں چار عورتیں ایک ساتھ

...سی ہیں۔ انہیں دیکھ کر اس نے عجیب سا مُنھ بنایا اور مجھ سے کہا کہ اگر میں چاہوں تو اُن میں سے کسی کے ساتھ ناچ سکتا ہوں۔

اُس کی بات سُن کر میں ایکبارگی سُن رہ گیا۔ "کیا کوئی اجنبی لڑکی میرے ساتھ ناچنا گوارا کرے گی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں! کیوں نہیں؟" شنکر بولا۔

میں نے میز کے گرد بیٹھی اُن چاروں عورتوں کو دیکھا۔ وہ تنہا بیٹھی تھیں۔ میں کھڑا ہو گیا۔

آپ سب لوگ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟ یقین کیجیے۔ اُس وقت میں پتّے کی طرح کانپ رہا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی اُن عورتوں میں سے ایک کھڑی ہو گئی اور انگریزی میں مجھ سے کچھ بولی۔ میں صرف سر ہلا کر رہ گیا۔ اس پر اُس نے میری ہی زبان میں مجھ سے پوچھا کیا میں اُس کے ساتھ ناچنا چاہتا ہوں؟

"ہاں!" میں نے جواب دیا۔

"میری بھولی بہن۔ تم جاننا چاہتی ہو کہ مجھے کستوری ملی یا نہیں۔ جلد بازی مت کرو۔ وہی تو میں تمہیں بتا رہا ہوں۔

میں اُس لڑکی کے ساتھ ناچنے لگا میری زیادہ تر توجہ اُس کے چہرہ کی طرف تھی۔ جس کی وجہ سے میں بار بار اُس کے پیر کچل رہا تھا۔ اس کے لمبے بال کندھے سے نیچے تک بکھرے ہوتے تھے۔ میں نے چھو کر تو نہیں دیکھا۔ لیکن وہ بہت ملائم معلوم ہو رہے تھے۔ اُس کے ہونٹوں پر تازہ زخم جیسا سُرخ رنگ پُتا ہوا تھا۔ اُس کی پوشاک بے حد کسی ہوئی تھی۔ دیر تک میں اُسی طرح اُس کے ساتھ ناچتا رہا۔ جب موسیقی ختم ہوئی تو میں اپنی جگہ پہ لوٹ آیا۔ اُس عورت نے

اپنی سہیلیوں سے کہا تھا۔ یہ تو معلوم ہیں۔ لیکن وہ سب ایک ساتھ ہلنے لگیں۔ جبھی مجھے اچانک یہ احساس ہوا کہ وہ سب شہر کی بدطین عورتیں ہیں۔ شنکر نے مجھ سے کہا تھا کہ ناچنے سے گرمی آجائے گی لیکن میں اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ ٹھنڈا پا رہا تھا۔ اُن عورتوں کے بارے میں سوچ کر افسوس ہونے لگا۔ کیا اِن کا کوئی گھر نہیں ہے؟ کیا اِن کی مائیں انھیں پیار نہیں کرتیں؟ یہ کیسا دھندہ ہے! اپنی بہن کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے تھوڑی سی راحت محسوس ہوئی۔ کیونکہ اُسے تلاش نہ کر سکنے کے باوجود میں سمجھ رہا تھا کہ اُس کی شادی کسی بڑے آدمی کے ساتھ ہو گئی ہوگی۔

بینڈ پھر سے بجنے لگا تو میں نے دوسری ٹیبل تک جا کر پھر اُس عورت کو ناچنے کے لیے کہنا چاہا لیکن وہ پہلے ہی کسی کے ساتھ جا چکی تھی۔ میں نے بیٹھی ہوئی دونوں عورتوں میں سے ایک سے پوچھا تو وہ فوراً تیار ہو گئی۔ ناچتے ناچتے اُس نے مجھ سے پوچھا کہ "کمار ذات کے ہو۔؟"

"ہاں...۔" میں نے کہا۔ اُس کے بعد دیر تک کوئی بات نہ ہوئی جب بینڈ تھما تو اُس نے مجھے کاؤنٹر سے بیئر اور سگریٹ خرید دینے کے لیے کہا۔ میں سوچنے لگا میرے پاس اتنے پیسے ہیں بھی یا نہیں ہم لوگ روشنی کے پاس آئے تو معلوم نہیں کیوں۔ میں اُس کے چہرہ کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ سینہ میں کہیں کچھ کھنچتا ہوا سا محسوس ہوا۔

"تم یہی کام کرتی ہو کیا؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

"کون سا کام؟"

نہیں نہیں معلوم۔ کون سا کام ؟"

میں نے پھر سے پوچھا۔

وہ ناراض ہوگئی۔ یہ سب پوچھنے والے تم ہوتے کون ہو؟ ہو کون تم ؟ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ کوئی بھی کام کام ہی ہوتا ہے! اجڈ۔ گنوار کہیں کے!" وہ چیخی۔

میں گھبرا گیا۔ سب لوگ ہماری طرف دیکھنے لگے تھے۔ اُسے خاموش کرنے کے لیے میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھنا چاہا۔ لیکن اُس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔

"کستوری!... کستوری!" میں تقریباً چیخ پڑا! تم نے مجھے پہچانا نہیں ؟"

وہ دیر تک میرے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر ہنسنے لگی۔ اُس کی وہ ہنسی اُس کے پیٹ سے نہیں اور کہیں سے اُبھر رہی تھی۔ جیسے وہ بہت بھوکی ہو۔

"میرے خیال سے تم میرے بھائی ہو!" آخر کار وہ بولی۔

"اوہ امّاں! اچّی! بہن! تم سب روکیوں رہی ہو؟ اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ مجھے ایک گمشدہ بچّی کو تلاش کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا لیکن میں نے اُسے ایک عورت پایا۔ اس میں آنسو بہانے کی کیا بات ہے! مجھے ایک گلاس اور دو!"

"روزگار کسی بھی طرح کا ہو۔ اُسے کام ہی کہا جاتا ہے۔" کستوری نے جب مجھ سے یہ کہا تھا تو مجھے محسوس ہوا تھا اُس کے ہونٹوں پہ خون جم گیا ہے کام کیسا بھی ہو...'

"رومت ماں! اس بار کستوری دیوالی پر گھر ضرور آئے گی!"

امروہہ کے مودود صدیقی کے خلاف مقدمہ شروع

اطلاع ملی ہے کہ نئی دہلی کے میٹروپولیٹن مجسٹریٹ جے۔ کے پالی کی عدالت میں ایک مقدمہ زیر دفعہ ۴۰۸، ۴۷۱ تعزیرات ہند سرکار بنام مودود صدیقی شروع ہو چکا ہے۔ اگلی پیشی کے لیے ۱۲ مئی مقرر ہوئی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ "بیسویں صدی" کے موسسل ایڈیٹر جناب خوشتر گرامی نے پولیس میں یہ رپورٹ درج کرائی تھی کہ انھوں نے مودود صدیقی کو کچھ رقم چارٹرڈ بینک دریا گنج میں جمع کرانے کے لیے دی تھی جو اُس نے بینک میں جمع نہیں کرائی اور بوگس رسید دے دی پولیس کی ابتدائی تفتیش کے بعد اب مودود صدیقی کے خلاف مقدمہ قائم ہو چکا ہے۔

غزلیں

رفیعہ شبنم عابدی

۱۷۰/۱۳ بارہ امام روڈ بمبئی ۳

★

تھی رہینِ دردوغم یا حاصلِ نغمات تھی
زندگی جو کچھ بھی تھی بخشی ہوئی سوغات تھی

قتل کرتا جا رہا تھا مجھ کو لمحوں کا یزید
پیاس تھی، صحرا تھا اور غم کی اندھیری رات تھی

پشت پر تھا میرا قاتل، سامنے آئینہ تھا
کتنی دلکش اور نازک صورتِ حالات تھی

خود بخود بڑھتے رہے ہم سوئے منزل بے دریغ
تو نہ تھا لیکن ترے قدموں کی آہٹ سات تھی

اپنی ناکامی کا آخر میں کسے الزام دوں
دوستوں کا ہاتھ تھا یا سازشِ لمحات تھی

تشنگی مہر سے شبنم کو یہ رفعت ملی
چند قطروں کی اگر سوچو تو کیا اوقات تھی

مسعودہ حیات

۹۹۳ - بازار چتلی قبر، دہلی ۱۱۰۰۰۶

★

خوشبو سی کوئی آئے تو لگتا ہے کہ تم ہو
شیشہ کہیں ٹکرائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

احساسِ محبت سے کسی گوشۂ دل میں
جب چوٹ ابھر آئے تو لگتا ہے کہ تم ہو

پرکیف ہوا میں جو کسی پیڑ کے نیچے
آنچل مرا لہرائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

چھونے سے کبھی بادِ صبا کے مرے تن میں
اک برق سی لہرائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

سر رکھ کے جو پتھر پہ کبھی راہِ الم میں
کچھ نیند سی آجائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

جب شانہ بھی کرنے نہ اٹھے ہاتھ ہمارا
اور زُلف سنور جائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

بیگم عشرت پیربھائی

۷/۷- نوروز اپارٹمنٹس ۳۵- بی ڈیسائی روڈ بمبئی ۴۰۰۰۲۶

★

سلیقہ جینے کا گُل یوں ہمیں سکھاتے رہے
کہ بیچ کانٹوں کے رہ کر بھی مُسکراتے رہے

بڑے خلوص سے اپنے فریب دیتے تھے
بڑے خلوص سے ہم بھی فریب کھاتے رہے

یقین ان پہ جو کرتے تو ڈوب ہی جاتے
یہ ناخدا جو فسانے ہمیں سُناتے رہے

ہمیں نے اُٹھ کے نظامِ کہن بدل ڈالا
ستم کے ہاتھ تو دار و رسن بناتے رہے

شفق کے رنگ میں شامل ہے خون کی سُرخی
زمیں کے لوگ تو رنگِ حنا بتاتے رہے

ستم کی تیرگی جب حد سے بڑھ گئی عشرت
ہم اپنے خوں سے چراغِ وفا جلاتے رہے

دردِ دل

ستارہ جعفری

۱۰۔ سیتا محل
بومن جی پیٹٹ روڈ بمبئی۔

جناب رحمٰن نیّر صاحب۔ تسلیم۔
"بیسویں صدی" کے لیے اپنی نئی کہانی "دردِ دل" پیش کر رہی ہوں۔ کہانی کچھ طویل ضرور ہوگئی ہے لیکن مجھے اُمید ہے آپ کو پسند آئے گی اور "بیسویں صدی" میں شائع کرکے مجھے شکریہ کا موقع دیں گے۔
آپ کی رائے کا انتظار کروں گی
اُمید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔
مخلص
ستارہ جعفری

یادیں خوبصورت اور حسین بھی ہوتی ہیں اور انتہائی اذیّت ناک بھی۔ یادوں کے گہرے سمندر میں ڈوب ڈوب کر اُبھرنا اور اُبھر اُبھر کے ڈوبنے میں انسان کو عجیب لُطف آتا ہے۔ کبھی تو یہ توسِ قزح کی طرح رنگین معلوم ہوتی ہیں اور کبھی اِن میں بجلی کی سی تڑپ ہوتی ہے۔

یہ وہ بیش وبہا دولت ہے۔ جس میں عمر کے ساتھ اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔ آج میری یادوں کے اُفق پر قُدسیہ کی پیاری شکل اُبھر رہی ہے۔ قُدسیہ میری بچپن کی دوست، میری یادوں کی شہزادی ــ مجھے تقسیمِ ہند سے پہلے کا وقت یاد آرہا ہے۔ مشرقی یو۔پی میں کوہِ ہمالیہ کے دامن میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ جہاں ہم دونوں پیدا ہوئے۔ ہمارے گھر برابر تھے اس لیے ہر وقت کا ساتھ تھا۔ میں دس بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹی تھی اور قُدسیہ کے ایک بڑا بھائی تھا جو عمر میں اُس سے دس گیارہ سال بڑا تھا وہ دہرہ دون اسکول میں پڑھتا تھا، اس لیے گھر میں والدین کی توجّہ کا تنہا مرکز قُدسیہ تھی۔ اس بے انتہا محبت اور چاہت نے اُسے بے حد ضدّی بنا دیا تھا جذباتی تو وہ فطرتاً تھی۔ مجھے آج بھی یاد ہے۔ ہماری عمریں سات آٹھ سال کے درمیان ہوں گی۔ میری بڑی بہن کی شادی ہوئی، اُسے دیکھ کر ہم دونوں نے بھی اپنے گڈّے اور گڑیا کی شادی طے کرلی۔ اُس شادی میں ہمارے بزرگوں نے بھی کافی دلچسپی لی تھی۔ باقاعدہ بَری۔ جہیز کے جوڑے تیّار ہوئے تھے۔ سُنار سے چاندی کے چھوٹے چھوٹے زیور بنوائے گئے تھے۔ حلوائی نے دولہن کے گھر لے جانے کے لیے ننھّی مُنّی گلاب جامن اور دوسری مٹھائیاں بنائیں اور میں دھوم دھام سے بارات لے کر قُدسیہ کے گھر گئی۔ جب دولہن کو رخصت کرانے کا وقت آیا تو قُدسیہ میرے گلے میں باہیں ڈال کر خوب پھوٹ پھوٹ کر روئی اور کہا۔

"دیکھو۔ میری گڑیا کو بہت آرام سے رکھنا مارنا نہیں!"

مجھے بھی رونا آگیا۔ میں نے کہا۔ "تم بھی میرے ساتھ چلو!"

اُسی وقت قُدسیہ کی پھوپھی اپنے بھائی سے مخاطب ہوئیں۔ "بھیّا! اِس بیج مچ کی گڑیا کو تو میں دُلہن بنا کر لے جاؤں گی!"

پھر اپنے بیٹے نوید سے کہا۔ "دیکھو تمہاری دُلہن کتنی پیاری ہے!"

قدسیہ کی پھوپھی زاد بہن شمسہ نے آگے بڑھ کر قُدسیہ کی پیشانی چوم لی "میری چھوٹی سی بھابی!"

قدسیہ روتے روتے ہنس پڑی۔ اس
وقت شادی بیاہ ہمارے لیے ایک تماشہ سے
زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے۔ عمر اور وقت کے ساتھ
ہماری محبت میں اور بھی پختگی آتی چلی گئی۔ ہم ہر
وقت ساتھ رہتے تھے، ایک اسکول میں پڑھتے
تھے اور سمجھتے جیسے ساری زندگی یہی ساتھ رہے گا۔
آج بمبئی جیسے شہر میں رہنے کے بعد مجھے اندازہ
ہوتا ہے کہ بڑے شہروں کے مقابلے میں چھوٹے
چھوٹے قصبوں میں دوستی اور محبت زیادہ
پائیدار اور خوشیاں لامحدود ہوتی ہیں۔ ہمیں
اپنی یہ چھوٹی سی دنیا مسرّت و انبساط کا گہوارہ
معلوم ہوتی تھی۔ ہم دونوں کے خاندان کافی بڑے
اور بے حد مذہبی تھے۔ اُن میں آئے دن مجالس،
میلاد اور بچّوں کی سالگرہ کی تقریبات ہوتی رہتی
تھیں۔ قدسیہ کو خدا نے صورت کے ساتھ میٹھی
اور سُریلی آواز سے بھی نوازا تھا۔ کوئی مجلس اور
میلاد اُس کے بغیر شروع نہ ہوتی تھی۔ شبِ عاشور؟
سیاہ ماتمی لباس میں ملبوس اپنے لمبے لمبے
گھنے بال کھول کر عزا خانے میں علموں کے سامنے
جب وہ یہ نوحہ پڑھتی تھی ؎

شبِ عاشورہ بھائی کو بلا میں دیکھ کر زینب
تصدّق کے لیے اے مومنوں لائی پسر زینب

تو سُننے والوں کی ہچکیاں بندھ جاتی تھیں اور
تیرہ رجب کے میلاد میں جب یہ قصیدہ شروع
کرتی ؎

آج گھٹا کیا جھوم کے اٹھی
کعبہ کا پردہ جھوم کے اٹھی

اُس وقت پوری محفل جھوم جاتی تھی اور
واہ! واہ! کے شور کے ساتھ اُس پر گلاب اور
موتیا کے پھولوں کی بارش ہونے لگتی۔ اُس
زمانے میں ہمارے قصبہ میں کوئی سینما ہاؤس
نہ تھا۔ اس لیے اسکول کے علاوہ ہماری تمام تر
دلچسپیاں اِنھیں کاموں کے لیے وقف تھیں۔

گرمیوں کا موسم ہمارے لیے نئی بہاریں
اور خوشیاں لے کر آتا تھا۔ دوسرے شہروں میں
رہنے والے ہمارے رشتے کے بھائی بہن گرمیوں
کی چھٹّیاں گزارنے کے لیے یہاں آجاتے تھے۔
قدسیہ کی پھوپھی جان بھی نوید اور شمسہ باجی کو
لے کر ہر سال آتی تھیں۔ شمسہ باجی مجھ سے اور
قدسیہ سے عمر میں بڑی تھیں لیکن برتاؤ بالکل برابر
والوں کا سا رکھتی تھیں۔ اس لیے میں اور قدسیہ
اُن سے بہت بے تکلّف تھیں۔ قدسیہ کی پھوپھی
جان ہمیشہ اپنے ساتھ بہت سارے تحفے لے کر
آتی تھیں اور اُن میں میرے لیے بھی کوئی نہ کوئی
تحفہ ہوتا تھا۔ ہم لوگ بہت شوق سے ایک
ایک چیز دیکھتے۔ شمسہ باجی بلند آواز میں اعلان
کرتیں۔

"پہلے میری بھابی پسند کرلے پھر
کسی اور کو ملے گا!" اس کے بعد کوئی چیز اُس
کے سامنے رکھ دیتیں۔ "لو یہ نوید کا تحفہ تمہارے
لیے ہے۔"

قدسیہ شرماتی۔ پھوپھی جان۔ اپنا
دستِ شفقت اُس کے سر پر رکھ کر کہتی "اللہ!
تمہاری یہ خوشیاں ہمیشہ قائم رکھے!" اور نوید
دُزدیدہ نگاہوں سے قدسیہ کو دیکھ کر مسکرا دیتا۔
قدسیہ کی نظریں بارِ حیا سے جھک جاتیں۔ اُن دو
مہینوں میں روز نئے نئے پروگرام بنتے۔ کبھی ہم سب
بھائی بہن پکنک پر جاتے۔ بیڈمنٹن اور کیرم
کھیلتے۔ چاندنی راتوں میں کھُلی چھت پر ساری
رات بیت بازی ہوتی۔ نوید ہر کھیل میں قدسیہ
کا پارٹنر رہتا۔ وہ بے حد ذہین اور تیز تھا۔
اس لیے ہمیشہ بازی اُس کے ہاتھ میں رہتی۔
جس وقت پارٹنر چننے کا وقت آتا وہ مسکرا کر کہتا
"بھئی، قدسیہ کو میں ہارتے ہوئے نہیں دیکھ
سکتا۔ یہ تو میری جنم جنم کی ساتھی ہے!" اور
میرے بھائی جو قدسیہ کے خاموش پرستاروں
میں تھے وہ اِس جُملے کو سُن کر اُداس ہو جاتے۔

جب چھٹّیاں گزر جاتیں اور سب
لوگ آئندہ سال ملنے کے وعدہ پر رخصت
ہو جاتے تب ہماری ملاقات کا ذریعہ خط و کتابت
ہوتی تھی۔ جس دن شمسہ باجی کا خط آتا تھا میں
قدسیہ کو دیکھتے ہی سمجھ جاتی تھی۔ اُس کا خوبصورت
چہرہ خوشی سے تمتمایا ہوا ہوتا اور کلاس میں اُس کا
دل نہ لگتا۔ جیسے ہی خالی پیریڈ ملتا۔ ہم دونوں
دوسری لڑکیوں کی نظروں سے دُور کسی گوشے
میں درختوں کی چھاؤں میں جا بیٹھتے اور مزے
لے کر خط پڑھتے۔ اُس میں نوید کی طرف سے
محبت بھرے اشارے کنائے ہوتے۔ آخر
میں شمسہ باجی لکھتیں۔ امّاں کے ڈر سے وہ
تمہیں خط لکھتے ہوئے گھبراتے ہیں اس لیے
اس خط کو تم نوید کا خط سمجھو۔

ہم دونوں نے میٹرک کا اور نوید نے
انجینرنگ کا امتحان دیا۔ اس سال گرمیوں میں
جب پھوپھی جان آئیں تو انھوں نے قدسیہ
اور نوید کی بات پکّی کرلی پھر اچھا دن تاریخ دیکھ
کر منگنی کی رسم بھی ادا ہوگئی۔ پھوپھی جان
منگنی میں گلاب رنگ کا کار چوبی جوڑا اور
انگوٹھی لائی تھیں۔ شمسہ باجی نے دُلہن کا
منہ دیکھ کر دل کی شکل کا سونے کا لاکٹ
پہنایا تھا اُس کے اندر چھوٹی سی نوید کی
تصویر لگی تھی۔ انھوں نے چپکے سے قدسیہ
کے کان میں کہا "یہ تحفہ میرے بھیّا کی طرف
سے ہے۔"

جانے سے پہلے پھوپھی جان نے
اپنے بھائی سے ۲۰ اگست سنہ ۱۹۴۷ء شادی کی
تاریخ طے کرلی۔ دونوں طرف دھوم دھام سے

شادی کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ ہم دونوں کو تو جیسے کسی بات کا ہوش ہی نہ تھا۔ نئے نئے ڈیزائن کے جوڑے اور زیور بن رہے تھے قدسیہ کے والدین نہایت فراخ دلی سے بیٹی کا جہیز تیار کرنے میں مصروف تھے۔

انھیں ہنگاموں میں ہندوستان کی آزادی اور پاکستان کے عالمِ وجود میں آنے کی خوش خبری ملی۔ وطن کی آزادی اور نیا

● اللہ تعالیٰ تمہیں اس جگہ سے رزق پہنچاتا، جو تمہارے خواب و خیال میں بھی نہیں ہے
(قرآن)

● تمہارے حق میں یہ بہتر ہے کہ تنگدست کو اصل قرضہ ہی بخش دو۔ (قرآن)

● ہمسایہ کا حق اُسی سے ادا ہوتا ہے، جس پر خدا کی رحمت ہو۔ (پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ)

● جو خدا سے محبت کا دعویٰ کرتا ہے اور اُسے اپنے بھائی سے نفرت ہے، وہ اپنے دعویٰ میں سچا نہیں
(حضرت عیسیٰؑ)

● جو شخص التجا کے نگاہ کو نہیں سمجھ سکتا اُس کے سامنے اپنی زبان کو شرمندہ نہ کرو۔ (حضرت عثمانؓ)

ملک بننے کی خوشیاں خون کی ہولی کھیل کر منائی گئیں۔ جان کے خوف سے دونوں طرف کے لوگ ہجرت کرنے لگے۔ اُسی افراتفری میں میں قدسیہ کی پھوپھی جان دہلی سے کراچی پہنچ گئیں۔ قدسیہ کا بڑا بھائی لاہور میں کام کرتا تھا وہ اُدھر ہی رہ گیا۔ کچھ پتہ نہ تھا کہ کہاں ہے۔ ڈاک۔ تار سب بند تھے۔ صرف بے گناہوں کا خون تھا جو چاروں طرف رواں دواں تھا۔ مہینوں بعد کسی عزیز کا خط آجاتا تھا تو اُسے پورا خاندان ایک گھر میں جمع ہو کر مرثیہ کی طرح سُنتا تھا۔ اور درحقیقت وہ مرثیہ ہوتا بھی تھا۔ اُس میں کسی کی موت اور کسی کے گھر لٹنے کی خبر ہوتی تھی۔ جو گھر برسوں میں بسائے گئے تھے وہ منٹوں میں اُجڑ گئے۔ ایک دن قدسیہ کے چچا چچی کی بھی خبر آگئی۔ قدسیہ کے والد اُس اندوہناک سانحہ کو برداشت نہ کرسکے۔ خدا جانے کر جو آنکھیں بند کیں تو پھر نہ کھلیں۔ اُس کے بائیسں دن بعد امی جان بھی قدسیہ کو اس بے رحم دنیا میں تنہا چھوڑ گئیں۔ اللہ! کیا ہولناک وقت تھا۔ پے بہ پے صدموں اور پریشانیوں نے آنکھوں کے آنسو خشک کر دیے تھے۔ چالیسویں کے بعد ابا جان اُسے اپنے گھر لے آئے۔ ہر وقت ہنستی، کھیلتی قدسیہ اب پتھر کی صورت بن گئی تھی۔ وہ شوخیاں اور قہقہے والدین کے ساتھ دفن ہو گئے۔ کبھی کبھی پھوپھی جان کا پوسٹ کارڈ آجاتا تھا۔ اُس سے معلوم ہوتا وہ بہت تکلیف میں زندگی گزار رہی ہیں۔ ہر خط میں لکھتی تھیں ہم لوگوں کو ابھی تک گھر نہیں ملا ہے۔ جھونپڑی میں رہتے ہیں نوید بھی ملازمت کی تلاش میں ہے۔ جو کچھ اپنے پاس تھا اُسی کو بیچ کر گزر بسر ہو رہی ہے۔ سُنا ہے حکومت جلد ہی مہاجرین کو گھر دینے والی ہے لیکن ہمارا نمبر کب آئے گا یہ معلوم نہیں۔ یہاں تو انسانوں کا ایک سیلاب ہے جو اُمڈا ہوا ہے۔ گھر مل جائے تو میں قدسیہ کو بہو بنا کر لے آؤں۔ آپ میری امانت کا ہر طرح خیال رکھیے گا۔ ہاں ایک بات اور لکھ رہی ہوں کہ آپ لوگ کبھی یہاں آجایئے بہت اطمینان ہے۔"

ابا جان اِن خطوط کا تسلّی بخش جواب دے دیا کرتے تھے۔

ایک دن اچانک قدسیہ کو لینے کے لیے اُس کا بھائی آگیا۔ انھوں نے بتایا۔ پھوپھی جان کہتی ہیں اس بڑھاپے میں میرے لیے دُور دراز کا سفر کرنا مشکل ہے۔ تم بہن کو یہاں لے آؤ تو میں اپنی آرزو پوری کر لوں۔ حالانکہ ابا جان کی خواہش قدسیہ کو اپنے گھر سے رخصت کرنے کی تھی لیکن بھائی اور پھوپھی کی رائے کے سامنے مجبور ہو گئے۔ امی۔ ابا جان نے ان گنت دعاؤں کے ساتھ قدسیہ کو رخصت کر دیا اور میں اُسے اپنے تصور میں دلہن بنا ہوا دیکھتی رہی۔

ہندوستان کے سینے پر جو خون کی لکیر کھینچی تھی وہ اب آہنی دیواروں میں تبدیل ہو گئی تھی۔ بغیر پاسپورٹ اور ویزا کے آمد و رفت ناممکن تھی۔ ہم بھائی بہن بھی رفتہ رفتہ موتیوں کی طرح بکھر گئے۔ بس وقت تھا جو ہوا کے دوش پر اُڑا جا رہا تھا۔

پچیس سال بعد میں کراچی جا رہی تھی۔ وہاں میرے بھانجے کی شادی ہو رہی تھی میری بہن کے گھر میں یہ پہلی شادی تھی۔ اُنھوں نے بے حد اصرار کے ساتھ بُلایا تھا اور میں بھی شریک ہونے کے لیے بیقرار تھی۔ جب ہوائی جہاز میں یہ اعلان ہوا کہ ہم کراچی ایئرپورٹ پہنچ رہے ہیں۔ اس آواز کو سُنتے ہی میری آنکھوں میں نہ جانے کیوں آنسو آگئے۔ نئے ملک کو دیکھنے اور بچھڑے ہوئے عزیزوں سے ملنے کے خیال سے دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میرے خدا! پچیس سال! ایک صدی کا چوتھائی حصہ گزرنے کے بعد میں اپنے چاہنے والے بھائی بہنوں سے ملوں گی۔ یہ وہ تھے جن سے ایک پل کی جُدائی بھی شاق تھی۔ کچھ صورتیں دُھندلا گئی تھیں اور کچھ نقش اُبھر رہے تھے اور انھیں

پچیس سال میں وہ کیسی ہو گئی ہو گی جو مجھے لینے کو وہ اور نوید ضرور آئے ہوں گے! ائیرپورٹ پر سارے عزیز ملے لیکن قدسیہ کو نگاہیں ڈھونڈتی رہیں۔ میں نے آپا سے پوچھا۔

"کیا قدسیہ کو میرے آنے کی خبر نہیں ہے؟"

"معلوم تو ہے۔ تمہیں گھر پر ملے گی۔"

جب گھر پر پہنچی تو شادی کا ہنگامہ عروج پر تھا۔ پورا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ دالان میں نوعمر لڑکیاں ڈھولک پر شادی کے گیت گا رہی تھیں۔ بہت سے مہمانوں میں گھری ہوئی میں بھی ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ بیبیاں آپس میں ہنسی مذاق کر رہی تھیں اور کمرہ فلک شگاف قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ اُسی وقت ایک خاتون آپا کے قریب آئیں۔ "لو مٹھائی لو۔ بیٹے کی شادی مبارک ہو! شادی کے گھر میں خالی ہاتھ نہیں آتے۔ آپ کے بہنوئی نے کہا۔ مٹھائی لے کر جانا۔"

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ تقریباً پچاس سال کی عمر کی ایک صاحبہ کھڑی تھیں۔ کالا برقعہ پہنے اُس میں سے سرخ رنگ کا گوٹا لگا ہوا دوپٹہ چمک رہا تھا۔ مہندی رچے بھر بھر ہاتھ سرخ رنگ کی چوڑیاں پہنے ہوئے تھیں۔ آنکھوں پر سیاہ موٹے فریم کا چشمہ لگا ہوا تھا۔ رخساروں پر روپیہ کے برابر کالی چھائیاں پڑی ہوئی تھیں اور سر کے بال دھنی ہوئی روئی کی طرح سفید تھے۔

"ہائے اللہ! کیسی گرمی ہے!" یہ کہتے ہوئے انہوں نے برقعہ اتار دیا۔ چاندی کے لمبے لمبے تار کمر سے نیچے لٹکنے لگے۔

"گرمی سے حلق سوکھا جا رہا ہے!"

پھر میری بہن سے مخاطب ہوئیں۔ "کچھ چائے شربت کا بھی انتظام کیا ہے یا ویسے ہی بیٹے کی شادی رچانے بیٹھ گئیں؟"

میں اُنھیں حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ میری بھابھی نے جھک کر میرے کان میں کہا۔

"یہ قدسیہ خالہ ہیں۔ آپ نے پہچانا نہیں؟"

"قدسیہ! ارے یہ میری قدسیہ ہے؟"

میرے منہ سے چیخ نکل گئی اور میں اُٹھ کر اُس کے گلے سے لپٹ گئی۔ اُس گرم جوشی سے اُس نے بھی گلے لگا لیا۔ ہم ایک دوسرے کے گلے لگے ہوئے تھے خوشی کے جذبات آنسو بن کر بہہ رہے تھے اور آواز حلق میں رُندھ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے اپنے اوپر قابو پا لیا۔

"قدسیہ! کیا حال بنا لیا ہے؟ میں نے تو پہچانا بھی نہیں؟"

"اے واہ۔ تم نے نہیں پہچانا تو کیا ہوا۔ ہم نے تو ایک نظر میں پہچان لیا تھا لیکن تمہاری محبت کا امتحان لے رہے تھے۔"

بدحواس اور بدحواسی کی باتیں سُن کر میرے تو ہوش اُڑے جا رہے تھے۔

"جاؤ بی بی! غسل خانے میں ہاتھ منہ ڈالو۔ میں شربت منگواتی ہوں۔" آپا نے کہا۔

"ہم تو گھر سے ہاتھ منہ دھو کر میک اپ کر کے آئے ہیں۔ ہمارے لال کپڑوں کا وہ مذاق اُڑا رہے تھے۔ ہم نے جواب دیا۔ واہ ہم تو اپنا شوق ضرور پورا کریں گے۔ ہمارے بھانجے کی شادی ہے!" اور ایک زور کا قہقہہ لگایا۔

میں نے پوچھا۔ "نوید کہاں ہیں؟ کیا مجھ سے شرما رہے ہیں؟"

جواب دینے کی بجائے وہ خود ہی

دل کی شکل کا لاکٹ سینے پر مچل رہا تھا۔

آپا نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ یا اللہ! یہ کیا ماجرہ ہے؟ میرا تو دم گھٹنے لگا اُسی وقت شور مچا دیا۔ دُلہن کے گھر سے دولہا کا جوڑا آیا ہے! ہم سب بھاگ کر ہال میں آ گئے۔ وہاں بھی قدسیہ ایک ایک بی بی کو اپنے لال جوڑے اور میاں کے مذاق اُڑانے کا

جو تمہاری فروگزاشتوں پر تنقید کرتے ہیں وہی تمہارے سچے دوست ہیں۔ (سقراط)

● اپنی موجودہ حالت پر قانع رہ کر استقلال کی زندگی اختیار کرو۔ (بطلیموس)

● ماضی کی یاد، مستقبل کے خوابوں میں کھوئے رہنے سے کہیں اچھا ہے کہ اپنے حال کو تعمیر کرو۔ (سوامی وویکانند جی)

● بے اعتمادی سے کام کرنا اندھے کنویں میں گرنا ہے۔

(مہاتما گاندھی)

● جو پھوٹ ڈالتا ہے، بھید بھاؤ بڑھاتا ہے، وہ تشدد ہے۔

(ونوبا جی)

قصہ سنا رہی تھی۔ بیبیاں کہہ رہی تھیں۔ "پھر تم نے اپنے شوہر کی پسند کے کپڑے کیوں نہیں پہنے؟"

"کیوں پہنتی۔ کیا ہماری کوئی پسند نہیں ہے۔ اب تو جو ہم چاہیں گے وہ کریں گے۔"

آپا نے پھر ٹوکا۔ "قدسیہ! بھانجے کو دولہا بنانے کی تیاریاں کرو۔ یہ قصہ چھوڑو۔"

اُدھر لڑکیوں نے ڈھولک پر گیت چھیڑ دیا۔

[illegible] لے ہنگاموں میں
[illegible] کی طرح میرے
[illegible] رہتی تھی۔ لیکن کچھ بے چین اور پریشان سی۔ لیکن شام ہوتے ہی اُس میں ایک عجیب تبدیلی آجاتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے رات کی تاریکی اُس کی بے چینی کو سکون میں تبدیل کر دیتی ہے۔ وہ شام کے سائے گہرے ہوتے ہی نہاتی اور اپنے لمبے سفید بالوں کو سنوار کر اُن کا خوبصورت سا جوڑا بناتی اور اس کو پلاسٹک کے پھولوں سے سجاتی۔ آنکھوں میں کاجل کی تحریر اور رخساروں پر غازہ ہوتا۔ نہ جانے کن اُمیدوں کی کرنوں کا ہالہ اُس کے مرجھاتے ہوئے چہرے پر تھوڑا نکھار پیدا کر دیتا۔ دُلہن کی طرح سولہ سنگھار کر کے وہ میرے کمرے میں آتی دونوں ہاتھ اٹھا کر خدا سے دعا مانگتی اور خاموشی سے بستر پر لیٹ جاتی۔

رات کسی کی تمناؤں کو جگاتی اور کسی کی آرزوؤں کو کچلتی آہستہ آہستہ گزر جاتی اور جب سورج کی پہلی کرن تھکے ہوئے ستاروں کو سُلا دیتی۔ تب اُس کے سفید لمبے بال کھل کر بکھر جاتے۔ آنکھوں کا کاجل اُڑ جاتا اور اُن میں سُرخ ڈورے تیرنے لگتے۔ اس کا رنگ صبح کے چاند کی مانند پھیکا پڑ جاتا اور رخساروں پر آنکھوں سے برسے ہوئے موتیوں کی چمک ہوتی۔ وہ سارا دن کھوئی ہوئی رہتی یا نوید کا

[illegible] سے پوچھا۔ "جب تمہیں نوید [illegible] ایک ہفتہ بھی برداشت نہیں تھی تو [illegible] کیوں آئیں؟" وہ جواب کو ٹال جاتی۔

شادی میں آئے ہوئے مہمان ابھی رخصت نہیں ہوئے تھے کہ اپا نک [illegible] غصے میں کہا۔

"لو بھئی! ہم تو چلے!"

"کہاں چلیں؟ ابھی تو دل بھر کے باتیں بھی نہیں کیں۔ ایک دوسرے کا حال احوال بھی نہیں پوچھا۔ پتا ہے؟ پچیس سال کے بچھڑے ہوئے ہیں!"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ تمہارے لیے تم اپنے بھائی کو چھوڑ دیں۔ ہمارے بھائی جان کا بہت اچھی جگہ تبادلہ ہو گیا ہے۔ وہ بھول ہی بھول ہیں!"

"پھول تو تمہیں بچپن سے پسند ہیں۔ یاد ہے قدسیہ! اب بھی وہی آپا ہیں جو جوڑے میں پھول لگا کے پیدا ہوا کرتی تھیں۔"

قدسیہ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ جلدی سے سامان سمیٹا اور چلنے کو تیار ہو گئی۔

"ٹھہرو بی بی! میں کمرے سے ٹیکسی منگوا دوں۔" آپا نے کہا۔

"ٹیکسی تو تم منگوا دو گی۔ لیکن کرایہ کون دے گا؟"

"میں دوں گی!"

لیکن وہ اپنا سامان بغل میں دبا کر بغیر سلام دعا کیے رخصت ہو چکی تھی۔

آپا نے کہا۔ "بیچاری کا آخری سہارا صرف بھائی ہے۔ اگر دیر ہوتی تو بھاوج چھوڑ جاتی۔"

"کیوں؟ اس کا اپنا گھر بھی تو ہے؟"

"شادی کہاں ہوئی غریب کی!"

"ارے! نوید سے شادی نہیں ہو گیا؟"

"نوید کیا کسی سے بھی نہیں ہوئی۔ بس اپنے گھر اور شوہر کے قصے سناتی رہتی ہے۔"

یہ تو میں پہلے ہی دن سمجھ گئی تھی کہ دماغ میں کچھ فتور آگیا ہے۔ لیکن بالکل ہی دماغ کھو گئے یہ آج معلوم ہوا۔

"شمسہ نے بیچاری کو تباہ کر دیا۔"

"لیکن قدسیہ کا بھائی تو ہندوستان سے یہ کہہ کر لایا تھا کہ ایک ہفتے کے اندر شادی ہو جائے گی۔"

"معلوم ہے بی بی! آج کل جہیز کی ہوس بہت بڑھ گئی ہے۔ لڑکا جتنا قابل ہے وہ اتنا بڑا جہیز مانگتا ہے۔"

"قدسیہ کے جہیز کا زیور کپڑا تو آپا جان نے یہاں آتے وقت دے دیا تھا۔"

اس سامان کی شمسہ کی نگاہوں میں کوئی قیمت نہ تھی کیونکہ نوید ایک کمپنی میں انجینئر ہو گیا تھا اور جمشید روڈ پر ایک عالیشان کوٹھی مل گئی تھی۔ قدسیہ کا بھائی کریم آباد کے ایک چھوٹے سے کوارٹر میں رہتا تھا۔ شادی کی پوری تیاری ہو گئی تھی۔ جس دن قدسیہ کو مایوں بٹھایا گیا، اس شام شمسہ نے کہلوایا کہ اگر جہیز میں کار، ریڈیو وغیرہ دو گے تو ہم شادی کر سکتے ہیں ورنہ تم جہاں چاہو وہاں قدسیہ کی شادی کر دو۔ قدسیہ کے بھائی نے مجھ سے کہا۔ للہ آپ اس معاملے کو طے کرا دیجیے۔ یہ چیزیں دینا میرے بس سے باہر ہے۔ یہ سُن کر میں پھوپھی جان کے پاس جمشید روڈ گئی۔ میں نے کہا۔ "آپ بزرگ ہیں۔ اپنے مرحوم بھائی کی بیٹی کو تباہی اور بدنامی سے

میرا ہریالا بنا آ بیٹھا مسند کے بیچ
بنے میں کیا تری بلائیں لوں، کیا ترے جوڑے کی
جوڑا تجھے ساج رہا، ہم رہے ارمانوں کے بیچ
میرا ہریالا بنا.....
بنے میں کیا تری بلائیں لوں، کیا ترے سہرے کی
سہرا تجھے ساج رہا، ہم رہے ارمانوں کے بیچ

تین چار دن شادی کے ہنگاموں میں گزرے۔ لیکن وہ ہر جگہ سائے کی طرح میرے ساتھ رہتی تھی۔ لیکن کچھ بے چین اور پریشان سی۔ لیکن شام ہوتے ہی اُس میں ایک عجیب تبدیلی آجاتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے رات کی تاریکی اُس کی بے چینی کو سکون میں تبدیل کر دیتی ہے۔ وہ شام کے سائے گہرے ہوتے ہی تنہائی اور اپنے لمبے سفید بالوں کو سنوار کر اُن کا خوبصورت سا جوڑا بناتی اور اس کو پلاسٹک کے پھولوں سے سجاتی۔ آنکھوں میں کاجل کی تحریر اور رخساروں پر غازہ ہوتا۔ نہ جانے کن اُمیدوں کی کرنوں کا ہالہ اُس کے مرجھاتے ہوئے چہرے پر تھوڑا نکھار پیدا کر دیتا۔ دُلہن کی طرح سولہ سنگھار کر کے وہ میرے کمرے میں آتی دونوں ہاتھ اٹھا کر خدا سے دعا مانگتی اور خاموشی سے بستر پر لیٹ جاتی۔

رات کسی کی تمناؤں کو جگاتی اور کسی کی آرزوؤں کو کچلتی آہستہ آہستہ گزر جاتی اور جب سورج کی پہلی کرن تھکے ہوئے ستاروں کو سُلا دیتی، تب اُس کے سفید لمبے بال کھُل کر بکھر جاتے۔ آنکھوں کا کاجل اُڑ جاتا اور اُن میں سُرخ ڈورے تیرنے لگتے۔ اس کا رنگ صبح کے چاند کی مانند پھیکا پڑ جاتا اور رخساروں پر آنکھوں سے برسے ہوئے موتیوں کی چمک ہوتی۔ وہ سارا دن کھوئی ہوئی رہتی یا نوید کا ذکر کرتی رہتی۔ میں نے پوچھا "جب تمہیں نوید کی جُدائی ایک ہفتہ بھی برداشت نہیں تھی تو اکیلی کیوں آئیں؟" وہ جواب کو ٹال جاتی۔

شادی میں آئے ہوئے مہمان ابھی رخصت نہیں ہوئے تھے کہ [illegible] غصے میں کہا۔

"لو بھئی! ہم تو پٹے!"

"کہاں چلیں؟ ابھی تو دل بھر کے باتیں بھی نہیں کیں۔ ایک دوسرے کا سالوں احوال بھی نہیں پوچھا۔ یاد ہے؟ پچیس سال کے بچھڑے ہوئے ہیں۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ تمہارے لیے ہم اپنے بھائی کو چھوڑ دیں۔ ہمارے بھائی جان کا بہت اچھی جگہ تبادلہ ہو گیا ہے۔ وہ بھول ہی بھول ہیں!"

"پھول تو تمہیں بچپن سے پسند ہیں۔ یاد ہے قدسیہ! جب دادی اماں ہمیں جوڑے میں پھول لگانے پر ڈانٹا کرتی تھیں۔"

قدسیہ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ جلدی سے سامان سمیٹا اور چلنے کو تیار ہو گئی۔

"ٹھہرو بی بی! ابھی کسی سے ٹیکسی منگوا دوں۔" آپا نے کہا۔

"ٹیکسی تو تم منگوا دو گی۔ لیکن کرایہ کون دے گا؟"

"میں دوں گی!"

لیکن وہ اپنا سامان بغل میں دبا کر بغیر سلام دعا کیے رخصت ہو چکی تھی۔

آپا نے کہا "بیچاری کا آخری سہارا صرف بھائی ہے۔ اگر دیر ہوتی تو بھاوج چھوڑ جاتی۔"

"کیوں؟ اس کا اپنا گھر بھی تو ہے؟"

"شادی کہاں ہوئی غریب کی!"

"ارے! نوید سے شادی نہیں ہوئی کیا؟"

"نوید کیا کسی سے بھی نہیں ہوئی۔ بس اپنے گھر اور شوہر کے قصے سناتی رہتی ہے۔"

یہ تو میں پہلے ہی دن سمجھ گئی تھی کہ دماغ میں کچھ فتور آگیا ہے۔ لیکن بالکل ہی حواس کھو گئے یہ آج معلوم ہوا۔

"ثمر نے بیچاری کو تباہ کر دیا۔؟"

"لیکن قدسیہ کا بھائی تو ہندوستان سے یہ کہہ کر لایا تھا کہ ایک ہفتے کے اندر شادی ہو جائے گی۔"

"معلوم ہے بی بی! آج کل جہیز کی ہوس بہت بڑھ گئی ہے۔ لڑکا جتنا قابل ہے وہ وہ اتنا بڑا جہیز مانگتا ہے۔"

"قدسیہ کے جہیز کا زیور کپڑا تو ابا جان نے یہاں آتے وقت دے دیا تھا۔"

اُس سامان کی ثمر کی نگاہوں میں کوئی قیمت نہ تھی کیونکہ نوید ایک کمپنی میں انجینیر ہو گیا تھا اور جمشید روڈ پر ایک عالیشان کوٹھی مل گئی تھی۔ قدسیہ کا بھائی کریم آباد کے ایک چھوٹے سے کوارٹر میں رہتا تھا۔ شادی کی پوری تیاری ہو گئی تھی۔ جس دن قدسیہ کو مایوں بٹھایا گیا۔ اس شام ثمر نے کہلوایا کہ اگر جہیز میں کار، ریڈیو وغیرہ دو گے تو ہم شادی کر سکتے ہیں ورنہ تم جہاں چاہو وہاں قدسیہ کی شادی کر دو۔ قدسیہ کے بھائی نے مجھ سے کہا۔ "اللہ آپ اس معاملے کو طے کرا دیجیے۔ یہ چیزیں دینا میرے بس سے باہر ہے۔" یہ سُن کر میں پھوپھی جان کے پاس جمشید روڈ گئی۔ میں نے کہا "آپ بزرگ ہیں۔ اپنے مرحوم بھائی کی بیٹی کو تباہی اور بدنامی سے

بچا لیجیے۔

پھوپھی جان تو خاموش ہو گئیں ثمسہ نے کہا "وہ مرحوم بھائی کا وقت گزر گیا ہمیں تو دنیا میں آگے بڑھنا ہے اس لیے ہم نے اپنے بھائی کی حسب حیثیت لڑکی تلاش کر لی ہے۔ تاکہ نوید کو دوستوں میں شرمندگی نہ ہو کہ غریب لڑکی بیاہ لائے۔ کراچی میں بہت لڑکے ہیں کسی سے بھی قدسیہ کی شادی کر دیجیے۔ ہاں پیسہ سے جو کچھ مدد ہو سکے گی وہ ہم کر دیں گے۔"

مجھے بھی غصہ آ گیا میں نے کہا "تم خاموش رہو ثمسہ! میں پھوپھی جان سے بات کر رہی ہوں۔"

پھوپھی جان نے کہا "قدسیہ میرے جگر کا ٹکڑا اور میرے مرحوم بھائی کی نشانی ضرور ہے لیکن جوان اولاد کی رائے کے سامنے میں مجبور ہوں۔"

"میری بھی جوان اولاد ہے لیکن مجال ہے میری مرضی کے خلاف کوئی کام کر جاتے۔ یہ کہیے کہ آپ دولت کے سامنے جھک گئی ہیں۔"

"تو پھر اپنے بیٹے سے قدسیہ کا نکاح کیوں نہیں کر لیتیں؟" ثمسہ نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"ضرور کر لوں گی۔ لیکن یاد رکھو ثمسہ! کسی معصوم کا دل توڑ کر تم اس ایئر کنڈیشنڈ کوٹھی میں خوش نہ رہو گی! اس کی آہ کی ٹھنڈک تمہیں بھی ٹھنڈا کر دے گی!"

گھر واپس آ کر میں نے اپنے بیٹے کا پیغام قدسیہ کے لیے دے دیا۔ اور اُس کے بھائی سے کہا میں اُنھیں تاریخوں میں شادی کے لیے تیار ہوں۔ مجھے جہیز نہیں صرف لڑکی چاہیے۔ لیکن جب لڑکیوں نے قدسیہ سے رائے لی تو اُس نے صاف انکار کر دیا۔ کہا جہاں بچپن کی منگنی تھی شادی تو وہاں ہو گی۔ دیکھو برسوں سے یہ تصویر میرے دل میں بسی ہوئی ہے اور لاکٹ کھول کر سب کو جاوید کی تصویر دکھانے لگی پھر مانجھے کے کمرے سے نکل کر غسل کیا اور جہیز کا سُرخ جوڑا پہن لیا۔ جب سے یہ صرف لال اور گلابی رنگ کے کپڑے پہنتی ہے۔

"رحم و کرم کی پتلی ثمسہ باجی اتنی ظالم اور زر پرست نکلیں تو نوید کی محبت کہاں مر گئی تھی؟"

"بی بی! دولت کی محبت ہر محبت پر غالب آتی ہے!"

"لیکن بچپن کے نقش تو بے حد گہرے ہوتے ہیں!"

"دولت انھیں بھی مٹا دیتی ہے۔ قدسیہ کا واقعہ دیکھنے کے بعد میں کہتی ہوں کبھی کسی بچے سے یہ نہ کہنا چاہیے، تمہاری شادی فلاں لڑکی یا لڑکے سے ہو گی۔ بچپن سے سُنی ہوئی بات معصوم اور حساس دلوں میں جگہ بنا لیتی ہے۔ تم دیکھ رہی ہو یہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے۔ اب بھاوج بھی اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتی، کہتی ہے میرے بچوں پر بہت اثر پڑ رہا ہے اور یہ جو شام کو نہا دھو کر اپنے کپڑے پہن لیتی ہے۔ اس پر بھی دنیا طرح طرح کی باتیں کہتی ہے۔ میں کہتی ہوں کوئی خوشی تو اس کے پاس رہنے دو۔"

"بڑا ہی عبرت ناک واقعہ ہے۔ چاندی کی چمک خون کے رشتوں کو بھی مٹا دیتی ہے۔" میں نے کہا۔

پندرہ دنوں کے بعد میں اپنے وطن واپس آ گئی۔ آج کئی برس بعد میرے پاس ایک خط آیا ہے۔ اُس سے معلوم ہوا قدسیہ ایک حادثے کا شکار ہو گئی۔ میں نے سوچا وہ کونسا حادثہ تھا جس نے جان لے لی۔ اُس کی تو پوری زندگی حادثہ تھی۔ لیکن اس بات کا بڑا دُکھ ہے کہ قسمت نے ملنے کے بعد کبھی اُس سے کوئی بات نہ کرنے دی۔ دل کی ساری حسرتیں دل ہی میں رہ گئیں اور اللہ نے اُسے اپنے پاس بُلا لیا۔ یہ موت ہمارے لیے تو سوہانِ روح ہے لیکن اُس کے لیے سکون ہے ابدی سکون! کتنے دُکھ اُٹھائے اور کسی خاموشی سے لحد کی آغوش میں جا سوئی۔

دردِ دل تھم گیا نیند آ گئی دیوانی کو ●●

غزلیں

پرویز انور

رضا منزل۔ آزاد روڈ۔ چھند واڑہ، منظفر پور ۸۴۲۰۰۱

★

کیوں پریشان ہو تم میرے فسانے کے لیے
یہ نہ سُننے کے لیے ہے نہ سُنانے کے لیے

آپ ہی جب نہیں سُنتے مری رودادِ الم
حال اس دل کا کسے جاؤں سُنانے کے لیے

آپ کا نام نہ ہوگا تو سُنے گا نہ کوئی
آپ کا نام ضروری ہے فسانے کے لیے

راستہ روک لیا موسمِ گُل نے آکر
جب بھی دیوانے چلے خاک اڑانے کے لیے

کتنی بیتاب نظر آتی ہیں میری نظریں
کوئی جلوہ تری چلمن سے چرانے کے لیے

فکر یہ ہے کہ اندھیرا ہے چمن میں انور
لوگ آئے ہیں نشیمن کو جلانے کے لیے

گلشن بہار

بی۔ ۷۷، XVI بھارت نگر، لدھیانہ

★

اپنے گھروں سے اب کے نکل کر تو دیکھیے
برسات کی پھوار کا منظر تو دیکھیے

اڑتے ہوئے، فلک پہ پرندوں کے قافلے
کتنا حسیں سفر ہے نظر بھر تو دیکھیے

اپنی اُداسیوں کو ذرا بھول جائیے
اوروں کے آنسوؤں کے سمندر تو دیکھیے

ہے زندگی کے ہاتھ میں بجھتا ہوا چراغ
تاریک بستیوں کے کبھی گھر تو دیکھیے

خوابوں میں جگمگانے لگیں گے ہزار رنگ
خوشبو سا وہ بدن کبھی چھو کر تو دیکھیے

عبدالغنی اعجاز

مومن پورہ۔ اکولہ۔ ۴۴۴۰۰۱

★

فصلِ گُل لے اُڑی خود پھول کی رعنائی بھی
آپ کہتے ہیں بہار آئی، بہار آئی بھی؟

منتشر ہے یہاں شیرازۂ اربابِ وفا
دیکھ لی ہم نے تری انجمن آرائی بھی

غم ہی غم ہو تو مسرت کا تصور کیسا
لَے ہے فریاد کی بجتی ہوئی شہنائی بھی

اُف یہ یادوں کا تسلسل یہ خیالوں کا ہجوم
چھین لی آپ نے مجھ سے مری تنہائی بھی

آشیاں آج بھی قائم ہے سرِ شاخِ چمن
برق ٹوٹی بھی بڑی شان سے لہرائی بھی

شاعری نے تجھے اعجاز دیا کیا آخر
ایک شہرت کہ جو شہرت بھی ہے رسوائی بھی

رپورتاژ کی چوتھی قسط

آدھے آدمی کا سفر

فکر تونسوی

۵۰ ڈی۔ گل مہر پارک نئی دہلی

مُسافر کے پُرسانِ حال

ایک جرنلسٹ دوست نے ستم ڈھایا کہ اُس نے ہسپتال میں ٹیلی فون کر کے معلوم کر لیا کہ میرے پاس واقعی آدھا جسم باقی رہ گیا ہے اور ستم بالائے ستم (ستم کی دوسری منزل بالائے ستم ہوتی ہے) یہ ہُوا کہ شہر کے تمام روزناموں میں میرے آدھے پن کی خبر طمطراق سے شائع ہو گئی۔ خبر کی اشاعت نے فضاؤں میں مسرت بھی پھیلا دی اور وحشت بھی۔ مسرت اُن کو جو میرے حشر کا انتظار کر رہے تھے۔ اور وحشت اُن کو جن سے میں نے قرض لے رکھے تھے۔

احباب میں بحث چھڑ گئی۔ "مجھے تو اس خبر پر پچاس فی صدی شک ہے۔"

دُوسرے نے کہا۔ "اور مجھے پچاس فیصدی یقین ہے۔"

شک اور یقین کی اس "لے دے" میں ایک بات پر سبھی متفق تھے کہ اگر فکر تونسوی پچاس فی صدی ہی دُنیا سے واپسی کا پروگرام بنا چکا ہے۔ تو مندرجہ ذیل قدم فوراً اُٹھانا چاہئیں:

۱۔ اس سے پہلے کہ اُس کا ہوائی جہاز اُڑ جائے۔ ہوائی اڈے یعنی ہسپتال میں جا کر "سی آف" ضرور کرنا چاہیئے۔

۲۔ اُس کے پسماندگان کے لیے فنڈ کی اپیل جاری کی جائے۔

۳۔ ایک ماتمی ریزولیوشن (ادبی معیار کا) پیشگی طور پر ڈرافٹ کر کے رکھ دیا جائے۔ چنانچہ اب "سی اوف" کرنے والے ہیں کہ جوق درجوق چلے آ رہے ہیں۔ بظاہر اسے بیمار پُرسی اور بباطن "سی اوف" کہا جاتا ہے۔ اس بیمار پرسی میں مریض بچارے کا عالم یہ تھا۔ کہ اُسے ہر پُرسانِ حال کو ایک باقاعدہ کہانی سُنانی پڑتی تھی۔

فالج کب ہُوا؟ (صحیح صحیح ٹائم بتائیے)

کیا بے ہوش ہو کر گر پڑے تھے؟ سر میں کوئی چوٹ بھی لگی تھی۔؟

اس سے پہلے فالج کب ہوا تھا؟

آہ! کتنا افسوس ہے۔ کہ اس سے پہلے فالج کیوں نہیں گرا۔

پہلے فالج کے لیے حالات سازگار کیوں نہیں تھے؟

مگر ہسپتال کے حکام نے سی اوف کرنے والوں کے لیے کچھ اوقات مقرر کر رکھے تھے۔ جن پر احباب کبھی عمل نہیں کرتے تھے۔ وُہ مجھے کوہ نور ہیرا سمجھتے تھے۔ اور اُسے لُوٹنے والے اور لُٹ کر دیکھنے والے وقت کی پابندی کو تواریخ عالم کی توہین سمجھتے تھے۔ کوہ نور ہیرے کو جس بادشاہ نے بھی اپنے تاج کی زینت بنایا۔ بس، جب کبھی موقع ملا، چھین کر لے گیا۔

چنانچہ جب میرے احباب نے اِن مقررہ اوقات کی مٹی پلید کی، ہسپتال کے قواعد وضوابط توڑے۔ اُس سے میری احتجاج پسند ضمیر کو بے حد تسکین پہنچی۔ بوسیدہ روایات کو توڑنے کے لیے ہی ہم نے انقلابی قلم اُٹھایا تھا۔ (نئی روایات کے خدوخال کیا ہوں گے۔ اُن پر غور کرنے کے لیے ہمارے پاس وقت نہیں تھا) لیکن ایک مرتبہ اس تسکین کو ٹھیس بھی پہنچی۔ جب ایک وزیر قواعد کی خلاف ورزی کر کے میرے بیڈ تک آ پہنچا۔ اُس کی اردلی میں چپڑاسی، ہسپتال کا عملا اور میڈیکل سپرنٹنڈنٹ تک شامل تھے۔

وزیر نے روایات کو نہیں توڑا، اپنے اقتدار کا استعمال کیا' وہ اقتدار' جس کے خلاف ہم اہلِ قلم نے ہمیشہ بغاوت کی۔

ورنہ قواعد توڑنا تو ہسپتال میں آسان تھا۔ گیٹ کیپر کی ہتھیلی پر رکھا ہُوا ایک روپیہ قواعد توڑنے کے لیے کافی تھا۔ مجھے ذہنی اذیت اس لیے پہنچی۔ کہ وزیر صاحب نے گیٹ کیپر کو ایک روپیہ نہیں دیا تھا۔

مگر میں دُوسرے مُلاقاتیوں کی داد دیتا تھا۔ ایک صاحب سے میں نے پوچھا۔

"تم نے قواعد کیوں توڑے؟"

"کیونکہ میں تمہارے عشق میں مُبتلا تھا"

میں نے اُس مُبتلا قسم کے عاشق کو بھی آدھا آدمی بننے کی پوری کہانی سُنائی۔ بار بار دُہرانے

سے مجھے وُہ کہانی اتنی حفظ ہو گئی تھی۔ کہ میری پہلی اور آخری بیوی کا بیان ہے کہ ایک بار جب آپ دوپہر میں سوئے ہوئے تھے تو نیند میں ہی وہ کہانی چڈھا صاحب کو سُنا رہے تھے جو آپ کی بیمار پُرسی کے لیے کبھی آئے ہی نہیں تھے۔

میرے پُرسان حال میں بے روزگار بھی شامل تھے اور لیڈر بھی۔ بائیسکل والے بھی، پیدل بھی، کاروں والے بھی اور مجھ میں ایک تکبّر سا پیدا ہو گیا۔ کہ بیمار ہونا بھی بڑے وقار کی بات ہے۔ جب میں بیمار نہیں تھا تو عشق کی یہ ورائٹی احباب کے سینوں میں کسی پُراسرار جگہ پہ دفن تھی۔ خوش نصیبی کے اس عالم میں، میں نے کئی بار خدا سے دُعا مانگی۔ کہ میرے احباب ایک آدھ بار ضرور بیمار پڑ جائیں۔ لیکن بیماری سنجیدہ قسم کی ہو، نزلہ، زکام اور چھینک وغیرہ یعنی ٹرخا دینے والی بیماری نہ ہو۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ ان ملاقاتیوں میں بڑی ورائٹی تھی۔ بیشتر احباب تو ایسے تھے۔ جو مجھے صرف یہ اطلاع دینے کے لیے آیا کرتے تھے۔ کہ اے فکر تونسوی! تجھ پر فالج والج کچھ نہیں گرا۔ تُو نے صرف بیمار پُرسوں کی آزمائش کے لیے ایک بہت بڑے مذاق کی باقاعدہ بوخا بنائی ہے۔ ایسے احباب بھی آتے جو پُرانے لطیفوں کو تازہ ترین لطیفہ کہہ کر سُنا جاتے۔ کئی ایک یہ منصوبہ بنا کر آتے کہ مریض کے سامنے صرف قہقہے لگاتے جائیں اور کوئی گفت گو نہ کی جائے۔ کیونکہ اُنھوں نے کہیں سے سُن رکھا تھا۔ کہ آدھی بیماری قہقہوں سے دُور ہو جاتی ہے اور باقی آدھی کے وُہ ذمے دار نہیں ہیں۔ اور کچھ دوست اُٹھتے وقت یہ دھمکی دے جاتے کہ اگر کل تک تم اپنا بوریا بستر اُٹھا کر گھر نہ لے گئے۔ تو دوبارہ ہسپتال میں ہمارا مُنہ نہیں دیکھو گے ـــــ مگر دُوسرے دن وُہ پھر آ جاتے، شاید یہ دیکھنے کے لیے کہ فکر تونسوی گھر واقعی لوٹ تو نہیں گیا۔

ایک دوست نے تو میرے ہسپتال سے آنے کے بعد شکایت کی۔ کہ آپ ہسپتال سے کیوں لوٹ آئے؟

میں نے کہا "مجھے ذرا جلدی تھی۔"

وُہ بولے۔ "اجی آخر اتنی بھی کیا جلدی تھی۔ میں تو ہسپتال میں تین مرتبہ جا کر پریشان پھرتا رہا۔ مگر آپ کا بیڈ کہیں ملا ہی نہیں۔"

میں نے پوچھا "آپ کون سے وارڈ میں تلاش کرتے رہے؟"

"جہاں ٹوٹی ہوئی ہڈیاں جوڑی جاتی ہیں۔"

میں نے اُن سے وعدہ کیا۔ کہ اگلی مرتبہ اپنی کوئی ہڈی تڑوا کر ہی جاؤں گا۔ تاکہ آپ کو خواہ مخواہ پریشان نہ ہونا پڑے۔

اُنھیں میرے وعدے پر اعتبار آ گیا۔ یہ دُنیا صدیوں سے اعتبار پر ہی کھڑی ہوئی ہے۔ ورنہ....؟

کچھ دوست بڑی سنجیدگی کا مُوڈ لے کر آتے۔ وُہ اپنے ساتھ کچھ نصیحتیں لاتے، کچھ ہدایتیں، کچھ نسخے۔

ایک کہتا۔ "اے فکر تونسوی! آج سے قسم کھا کہ تمام غیر شرعی حرکتیں چھوڑ دے گا۔"

"تم ہر روز لہسن کی دو پھلیاں ضرور کھایا کرو۔ میرے ماموں جان کو ایسا عارضہ ہُوا تھا۔ وہ بھی لہسن کھایا کرتے تھے۔"

اس نسخے پر بے ساختہ میرے ذہن میں ایک لطیفہ اُبھر آیا کہ ایک صاحب کی بھینس بیمار ہو گئی، وہ بھاگا بھاگا دُوسرے صاحب کے پاس گیا۔ پوچھا "بھائی جان! تمہاری بھینس بیمار ہوئی تھی تو تم نے کونسی دوائی دی تھی؟"

دُوسرے صاحب نے دوائی کا نام بتلایا۔

تیسرے دن پہلے صاحب غیض و غضب کے عالم میں دُوسرے صاحب کے پاس پہنچے اور کہنے لگے۔ "واہ اُستاد! تم نے اچھی دوائی بتائی۔ اُس سے میری بھینس ہی مر گئی۔"

دُوسرے صاحب نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ "بھینس تو میری بھی مر گئی تھی۔"

لہسن والے نسخہ بردار سے میں نے یہ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ کہ لہسن کھانے سے آپ کے ماموں جان کا کیا انجام ہُوا تھا ـــــ بلکہ وُہ تو لہسن کی دو پھلیاں اپنے ساتھ ہی لے آتے تھے۔ کہنے لگے۔ "ہاں! انھیں ابھی کھاؤ میرے سامنے؟"

ایسے نسخہ بردار سب سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ جو صرف نسخہ بتاتے نہیں، دوائی بھی ساتھ لاتے ہیں۔

ایک دوست میرے لیے ہر صبح دُودھ میں اُبلے ہُوئے میٹھے، رسیلے توس لایا کرتے اور مجھے سرتاپا نالائق گردانتے ہُوئے کہا کرتے۔ اگر تم پچھلے بیس برسوں میں ایسے توس باقاعدہ کھاتے ہوتے۔ تو بیماری تمہارے نزدیک ہی نہیں پھٹکتی۔ (ان رسیلے توسوں نے چند دن میں میری حالت اتنی خستہ کر دی۔ کہ وُہ مجھے دوبارہ ملنے کے قابل نہیں رہے)

کچھ احباب، پھلوں سے بھرے ہُوئے لفافے لاتے۔ میں ان لفافوں کو دیکھ کر شرمندہ ہوتا۔ مگر وُہ کہتے، شرمندگی اُن ڈاکٹروں پر چھوڑ دو، جن کی اجازت سے ہم یہ پھل لائے ہیں۔ چنانچہ میں شرمندہ ہونے کی بجائے اُن احباب کے عاشقانہ جذبوں کی قدر کرنے لگتا۔ مگر اُنھیں وارننگ بھی دیتا۔ کہ مجھے پھل کھانے کا عادی مت بناؤ، مارکیٹ میں پھل بے حد مہنگے ہیں۔ صحتیاب ہونے پر اِس عادت سے نجات کیسے پاؤں گا۔ ہندوستان کا کوئی بھی شریف باشندہ اس باقاعدگی سے تازہ پھل نہیں کھا سکتا۔ یہ غنیمت ہے کہ وُہ ڈالڈا گھی، راشن کی گلی سڑی گیہوں اور دالیں خرید لیتا ہے اُسے اِس سے زیادہ عیاشی کا عادی بنانا، ہندوستان کی اقتصادی پالیسی سے مذاق کرنا ہے۔

کچھ بے تکلف احباب مجھے یہ مشورہ دینے کے لیے آیا کرتے کہ دوستوں کے دیے ہوئے پھلوں کی مقدار بڑھتی جا رہی ہے۔ اس لیے تمہیں ایک ریفریجریٹر خرید لینا چاہیے۔ لیکن ایک ذرا زیادہ بے تکلف دوست نے ریفریجریٹر کی سمسیا بھی حل کر دی۔ اور کہا، "اگر تم انھیں نہیں کھا سکتے۔ تو میں روزانہ آکر کھا لیا کروں گا۔"

اُس دوست کا معدہ گویا ریفریجریٹر کا کام کر سکتا تھا۔

چنانچہ وُہ واقعی ہر روز بیمار پُرسی اور پھل خوری کے لیے آنے لگا ــــ مگر ایک دِن وُہ ذرا تاخیر سے آیا۔ تو میں نے معذرت کی۔

"یار! آج جتنے پھل آئے تھے، وہ تو دُوسرے احباب چٹ کر گئے۔ تم لیٹ کیوں ہو گئے؟"

کہنے لگا۔ "آج میں نے سوچا۔ کہ میں بھی کچھ پھل لے جاؤں۔ لیکن کوئی حرج نہیں، آؤ آج میرے ہی پھل مِل جل کر کھاتے ہیں۔"

وُہ انگور لایا تھا، حُسنِ اتفاق کہ آج ہر دوست انگور ہی لایا تھا۔ سُنا تھا، اُن دِنوں انگور اور پیاز ایک ہی بھاؤ بک رہے تھے۔ لیکن میں اُس دن چونکہ انگور کھا کھا کر اُکتا چکا تھا۔ اس لیے جبراً و قہراً اُس دوست کو اپنے سبھی انگور، خود ہی کھانا پڑے۔

● موت کا پڑاؤ ــــ

"کون مر گیا؟"

"ہو گا کوئی ــــ چھوڑو نرس! تمہارے ہونٹ کتنے گلابی ہیں؟"

"شٹ اپ! میں تمہارے گال پر تھپڑ لگا دوں گی چڑ بکن!"

"کون سے گال پر؟ دائیں پر یا بائیں پر؟"

"یہ کون ہنسا؟ کس بات پہ ہنسا؟"

"سالے! تم لوگ ہنستے ہو؟ دیکھتے نہیں! اُدھر بیڈ نمبر تین والا مریض مر گیا ــــ گلابی گالوں پر موت کا تھپڑ، کتنے زنّاٹے سے لگا ہے؟"

اور بیڈ نمبر تین سے اُٹھتی ہوئی ماتمی آوازوں نے جیسے سیاہ چادر اوڑھ لی۔ اور اس سیاہ ہی چادر میں لپٹی ہُوئی کوئی ادھیڑ عُمر عورت آہستہ آہستہ سسکیاں بھرنے لگی۔

میرے پپوٹے بوجھل ہو رہے تھے۔ اے کاش! اگر ہاؤس سرجن نے مجھے خواب آور گولی نہ کھلائی ہوتی۔ تو میرے پپوٹے، یوں ایک انسان کی موت پر بھی بند نہ رہتے۔ میں یہ سسکیاں سُننا نہیں، دیکھنا چاہتا تھا۔

میں زبردستی پپوٹے کھولنے کی کوشش کرتا ہوں مگر وُہ صرف آدھے کھُلتے ہیں، آدھے نہیں کھُلتے! جیسے کوئی گلاب کا پھول آدھا کھِلے، آدھا بند رہے، آدھا زندہ رہے، آدھا مرا رہے۔

ڈاکٹر! ڈاکٹر! جلدی آؤ، دیکھتے نہیں میرے پپوٹے، میری حسین، میری مقدس آرزوئیں، ایک تازہ ترین بیوہ کی آہ و بکا سے اپنے رگ و پے کو رُلانا چاہتی ہیں مگر..... مگر..... آدھے آدمی پر رونے کی کیفیت بھی طاری نہیں ہو رہی۔

مگر میری آواز کہیں نہیں سُنی جاتی، ہاؤس سرجن ایک خوبصورت نرس کی، نرم، لمبی، نیم خوابیدہ پلکوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ رات کے شاید ڈھائی بج چکے ہیں۔ ہسپتال کا جسم اور روح دونوں مُردہ ہو چکے ہیں۔ ہر رُوح کو جیسے نیند کی گولی کھلا کر نیم مُردہ کر دیا گیا ہے۔ ہسپتال میں امن اور سکوت چاہیے، بے قراری صرف ہسپتال کے باہر کا حصّہ ہے۔

لیکن اس کے باوجود لوگ ہسپتال میں راتوں کو مر جاتے ہیں اور آہ و بکا پھیل جاتی ہے، سارا سکوت، ہسپتال کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے

ابے! اگر مرنا ہے تو روزِ روشن میں مرا کرو۔ کم از کم رات کی مقدس خاموشی کو تو ذبح مت کرو۔

اور جب بیڈ نمبر تین کا مریض رات کے ڈھائی بجے چل بسا۔ تو کائنات پر نرم و نازک سکوت کی پھیلی ہُوئی ریشمیں جھالریں، ریزہ ریزہ ہو لگیں۔ خوبصورت نرس کی لمبی، گہری خوابیدہ جھکیلی پلکیں لرز لرز گئیں۔ وُہ اپنے بوائے فرینڈ ہاؤس سرجن کے لپکتے بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو یوں تھام کر لڑکھڑائی۔ جیسے کسی کے ہاتھ سے پُوجا کی تھالی کا دیا ایک دم نیچے پتھریلے فرش پر گر جائے۔

نرس بھاگی، ہاؤس سرجن بھی تھالی کے دیئے کے پیچھے بھاگا۔ اُسے شاید اپنی ڈیوٹی کے احساس نے بیدار کر دیا۔ بیداری کتنی بیزار کن چیز ہے اُس کا کتنا خوبصورت خواب فرض کی بیداری نے برباد کر ڈالا تھا۔ فرض کتنی بے حس اور بے مروّت چیز ہے، ضرورت ہو تو سویا رہتا ہے، بغیر ضرورت کے جاگ اُٹھتا ہے، کیوں ایک مُردہ چیز کے ساتھ چمٹا ہُوا ہے؟ اسے اپنے ساتھ گھسیٹے پھرتا ہے، جیسے یہ ایک لاوارث کتّے کی لاش ہو۔ جسے میونسپلٹی کے مہتر، زمین پر گھسیٹ کر، کسی چلتے ہوئے گندے نالے میں پھینک آتے ہیں۔ تاکہ اس کی رُوح، رُوح الامین سے جا ملے۔

مگر میں مردہ چیزوں سے نفرت کیوں کر رہا ہوں؟ محبت بھی کیوں کر رہا ہوں؟ یہ میری سمجھ سے بالاتر ہے، شاید سمجھ کے پپوٹے بوجھل ہو چکے ہیں۔ اور بوجھل پپوٹوں کے درمیان، مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میرے وارڈ میں بھاگ دوڑ شروع ہو گئی ہے، چپڑاسی، خلاصی، نرس، ہاؤس سرجن، سبھی اپنے سر سے فرائض کا بوجھ گرانے کے لیے دوڑ دھوپ کر رہے ہیں۔ ایک انسان ہسپتال میں مر گیا ہے۔ اُس کا نام، باپ کا نام، سفارشی تو نہیں تھا۔

[کو]ن کونسا تھا، موت کا صحیح صحیح ٹائم، لاش کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ پولیس کو اطلاع، کاغذات [کی خا]نہ پُری ——— غرض انسان کی موت کے بعد [کئی] غیر ضروری ضرورتیں ہوتی ہیں ان کی تکمیل [کرنی ہی] ہے۔ مرنے والا مرگیا، لیکن ہسپتال کے [عمل]ے کی نوکری خطرے میں ڈال گیا۔ زندہ لوگ، [زند]ہ لوگوں سے بھی ڈرتے ہیں اور مُردہ لوگوں سے بھی۔

اور پھر آج کل نوکری کونسی آسانی سے [ملتی] ہے۔ ہسپتال کے گیٹ کیپر کی نوکری لینی ہو۔ [تو] از کم ہیلتھ منسٹر کی محبوبہ کی سفارش ضروری [ہے]۔ مگر ہسپتال میں مرنے کے لیے کسی وزیر کے [سف]ارشی خط کی ضرورت نہیں پڑتی۔

میں نے بوجھل پپوٹے کھول کر اپنے پڑوسی [مری]ض ماسٹر جی سے پوچھا۔ "ماسٹر جی، اُٹھو، ماتم [پُرس]ی کے لیے چلیں۔

ماسٹر شاید کوئی دلفریب خواب دیکھ رہا [تھا]۔ شاید یہ کہ اُس کی بیوی، اُس کا چراغِ صحت جلانے کے لیے مندر کی طرف جارہی ہے۔ میری آواز [سُن] کر ہڑبڑا اُٹھا۔ "کیا ہوا" کیا تھالی سے چراغ گر کر بُجھ گیا؟"

ہاں، بیڈ نمبر تین والے کا چراغ بجھ گیا۔ [کل] شام اس کے مُنہ میں [...] نگترے کا جُوس ڈالا گیا۔ [لیکن وہ جُوس] ناکام لوٹ آیا [... اُ]س میں ایک چمچہ جُوس پینے کی سکت [بھی] نہیں رہی تھی۔ چلو اُس کے لو[احق]ین سے ہمدردی ہی [کر آ]ئیں۔"

"نہیں نہیں، مجھے موت سے خوف آتا [ہے]۔ میں وہاں نہیں جاؤں گا۔ آپ بھی مت جایئے [ہس]پتال میں تو ہر روز لوگ مرتے ہیں۔ آپ کس کس کا [ما]تم کرنے جائیں گے۔ ہسپتال تو شمشان بھومی [کا] فُل ڈریس ریہرسل ہے۔

ماسٹر جی نے سہمے ہوئے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرلیں۔

آنکھیں تو میں نے بھی بند کرلیں۔ لیکن مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ ہمسائے میں ایک موت [ہوئی] اور ہمسایہ اطمینان سے بستر پہ لیٹا رہے۔ کیا ہم انسان اتنے سنگدل ہیں، کیا ہم سماج کا عضو نہیں ہیں؟ کیا ہر عضو بے حس ہو چکا ہے؟

مرحوم کے بیوہ کی کراہیں اب تیز تر ہوگئی تھیں۔ کل شام میں نے دونوں کو ایک ساتھ سانس لیتے دیکھا تھا۔ مرحوم پینسٹھ برس کے پیٹے میں تھا۔ وُہ بول تک نہیں سکتا تھا۔ اُس کے بیٹے اُس کی برابر خدمت کررہے تھے۔

پھر کسی نے مجھے بتایا تھا۔ کہ بوڑھے کی خاصی جائیداد ہے، جس پر ہر بیٹے کی نظر ہے مگر بوڑھا بول نہیں سکتا، یہ بھی نہیں کہہ سکتا، کہ کتنی جائداد، کس بیٹے کو دی جائے۔ میری بیوہ کا مستقبل کیا ہوگا؟ موت اپنے کالے کالے پر پھیلائے، بوڑھے کے ارد گرد تیزی سے پرواز کررہی تھی۔ ہر بیٹے کی خواہش تھی کہ وُہ وصیت کے چند الفاظ بھی بول سکے۔ ڈاکٹر! کوئی ایسی دوائی دو، جس سے وصیت کے چند بول نکل سکیں۔ مگر ڈاکٹر، بیٹے، بیوہ، سیوائیں کوئی بھی اُس سے وصیت نہ اُگلوا سکا۔ اور وُہ چل بسا۔

اور میں سوچنے لگا۔ اچھا ہُوا، چل بسا۔ یہ دُنیا، انسانوں سے نہیں، جائیدادوں سے بنی ہُوئی ہے۔ کاش! دُنیا کے ہر کھیت، ہر فیکٹری، ہر بینک کو فالج ہو جائے۔ تاکہ انسان ان نیم مُردہ حقیقتوں کو کُتے کی طرح ساتھ گھسیٹتا پھرے۔

چترنجن ——— میرے قریب بستر پر آکر بیٹھ گیا۔ ابھی ابھی وُہ اس نرس سے آج کے کوٹے کی پندرہویں گالی کھا کر آیا ہے، "فکر بابو! میں بھی مرنا چاہتا ہوں، بتاؤ، میں کب مروں گا؟"

چترنجن ——— جذباتی لڑکا ہے۔ اُسے ابھی زندہ رہنا چاہیے کیونکہ اُسے ابھی ایک لڑکی کی محبت تک نہیں مل سکی۔

"نہیں چترنجن! تمہیں ابھی نہیں مرنا چاہیے"۔

"تو بتاؤ، مجھے کیا کرنا چاہیے"۔

"تمہیں ابھی ٹرانزسسٹر سے لتا منگیشکر کے گانے سُننا چاہییں۔ اور گیتوں کی لے میں یہ بھُول جانا چاہیے کہ دُنیا پینسٹھ سال کے بڈھے کو مار دیتی ہے۔ مگر اُس کی جائیداد کو زندہ رکھتی ہے"۔

(سفر آگے بھی چلے گا)

●●

صحت و زندگی

کیا آپ جانتے ہیں؟

● آم کے پُرانے اچار کا تیل سر کے لیے مفید ہے۔ اچار جتنا پُرانا ہوگا اُس کا تیل اتنا ہی زیادہ مفید ہوگا۔ اچار کم سے کم ایک برس کا پُرانا ہونا ضروری ہے۔ اُس میں سے تیل الگ کر کے کسی شیشی میں رکھ لیں۔ روزانہ سر پہ اُس تیل کی مالش کریں۔ چند ہفتے یہ عمل کرنے سے سر پر بال پیدا ہو جائیں گے۔

● گوشت بریاں نمکیں اور سرکہ ایک ساتھ کھانے سے دردِ معدہ و قولنج کا بھی خطرہ ہے۔

● خربوزہ کے ساتھ دہی کھانے سے دردِ معدہ کا احتمال ہے۔

● انگور کھانے کے ساتھ دہی کھانے سے دردِ معدہ کا اندیشہ ہوتا ہے۔

● آملہ کا اچار مقوّی قلب ہے۔ قلب کی حرارت کو دُور کرتا ہے۔ بھوک میں اضافہ کرتا ہے۔ کھانا ہضم کرتا ہے۔

● آملہ کا مربّہ قلب و دماغ اور معدہ کا مقوّی ہے۔ بواسیر کے لیے نافع ہے۔ شربت آملہ معدہ اور جگر کی تقویت کے لیے بہت مفید ہے۔

● مازوئے سبز کو پانی میں پیس کر حلق اور زبان پر کئی بار لگانے سے حلق اور زبان کے آبلے کی تکلیف دُور ہو جاتی ہے۔

● مُنھ آنے کی حالت میں چھال درخت گولر یا چھال درخت جامن کو پانی میں جوش دے کر کلی کرنا مفید ہے۔

● آم کے تین چار پتّے خوب چبائیں اور لعابِ دہن تھوکتے جائیں۔ چند دن مسلسل یہ عمل کرنے سے ہلتے دانت مضبوط ہو جاتے ہیں۔ مسوڑھوں کا خون بند ہو جاتا ہے۔ دانتوں اور مسوڑھوں کی دوسری شکایتوں میں بھی یہ عمل بہت مفید اور آزمودہ ہے۔

● اگر آپ صحت مند رہنا چاہتے ہیں تو ہمیشہ سوئے ہضمی کے اسباب کا خیال رکھیے اور اُن سے بچیے۔

● ماہرین نے تحقیقات کے بعد انکشاف کیا ہے کہ کھجور گوشت اور دودھ سے زیادہ طاقت بخش ہے۔ کھجور میں گوشت سے ایک تہائی زیادہ اور اچھا فولاد ہوتا ہے۔

● ناشپاتی سیب سے زیادہ مفید ہے۔ ناشپاتی چھلکا سمیت کھانے سے جلد ہضم ہوتی ہے۔

● دماغی قوتوں کو اُبھارنے کے لیے خوشی اور مسرت کی معجز نمائی دیکھ کر آپ حیران رہ جائیں گے۔ تجربہ کر کے دیکھیے۔

● امریکی ڈاکٹروں کی رپورٹ کے مطابق ایک سگریٹ پینے سے انسان کی عمر چودہ منٹ کم ہو جاتی ہے۔

● اخروٹ اعضائے رئیسہ اور دماغ کو قوت بخشتا ہے۔ حافظہ [illegible] معدے کو تقویت پہنچاتا ہے۔ باہ بڑھاتا ہے قبض کشا ہے۔

● اخروٹ فاسفورس کا خزانہ ہے۔

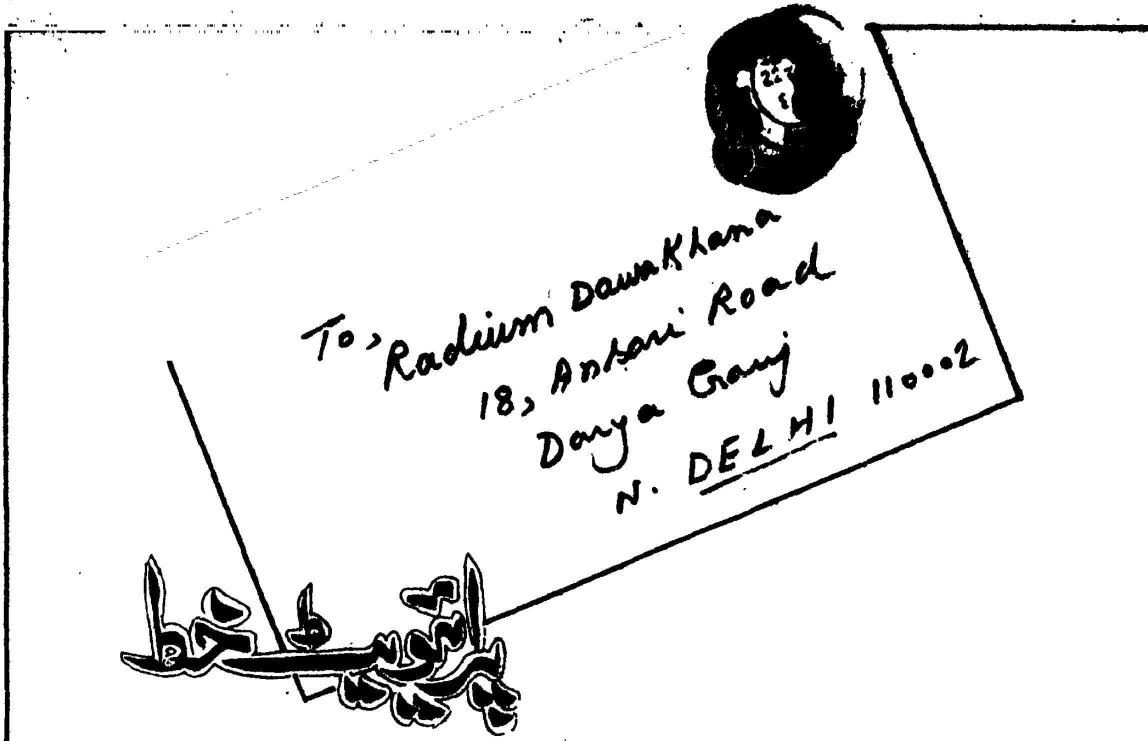
● سُرخ مرچ مناسب مقدار میں استعمال کی جائے تو لعابِ دہن کے اخراج کو بڑھا کر غذا کے نشاستہ دار اجزاء کے ہضم میں مدد دیتی ہے۔ ہاضمے کے لیے مقوی، آنتوں کی محرک ہے۔ دافعِ قبض ہے۔ اس کی زیادتی خون کو جلاتی، ہاضمے کو خراب کرتی ہے۔

● سیاہ مرچ ہاضمے کو تیز کرتی، ہاضم طعام ہے۔ ریاح کو تحلیل کرتی، کف کو خارج کرتی ہے، اعضائے رئیسہ، جگر اور دماغ کو تقویت دیتی ہے۔ دمہ، کھانسی، زکام اور بدہضمی میں مفید ہے۔

● السی کو نیم کوب کر کے تھوڑے پانی میں ہلکا جوش دے کر لعاب نکال لیں۔ وہ لعاب آنکھوں میں ڈالنے اور آنکھوں کے گرد لگانے سے آنکھوں کی سُرخی جاتی رہتی ہے۔

● السی کو بریاں کر کے باریک کوٹ لیں۔ پھر اُس میں دو گنا شہد ملائیں۔ اُسے چاٹنا بلغمی کھانسی میں فائدہ بخش ہے۔

● روغنِ السی میں لہسن ڈال کر جوش دیں۔ یہ تیل ایک تولہ کی مقدار میں قولنج میں



پرائیویٹ خط

مایوسی، کمزوری اور نامرادی کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے. خدانخواستہ آپ کو کوئی جسمانی تکلیف ہے، یا آپ صحت کی خرابی کی وجہ سے زندگی کی خوشیوں سے محروم ہیں تو آپکو ریڈیم دواخانہ کے طبّی بورڈ کی خدمات کی ضرورت ہے.

ہمیں ہر روز ڈاک سے بے شمار خطوط ملتے ہیں، جن پر "پرائیویٹ خط" لکھا ہوتا ہے. ایسے پرائیویٹ خط صرف بورڈ کے حکیم صاحب ہی کھولتے ہیں. یہ اُن دُکھی نوجوان مردوں اور عورتوں کے خطوط ہوتے ہیں، جو اپنی پرائیویٹ بیماری اور دل کی بات کسی کو بتاتے ہوئے شرماتے ہیں. بورڈ کے حکیم صاحب ان خطوط کو بہت غور سے پڑھتے ہیں، اور نسخہ تجویز کرتے ہیں. اس خدمت کے لیے کوئی فیس نہیں لی جاتی.

بورڈ کے حکیم صاحب کی نگرانی میں اصلی خالص دوائیں مناسب قیمت پر بذریعہ وی. پی پارسل بھیج دی جاتی ہیں ـــ اگر کوئی شخص یہ بھی چاہے کہ وی. پی. پارسل سے بھی یہ ظاہر نہ ہو کہ دوا منگائی گئی ہے تو انھیں دواخانہ کے لیبل کے بغیر پارسل بھیج دیا جاتا ہے.

آج ہی آپ، اپنے دل کی بات بمع مکمل حالات بورڈ کے حکیم صاحب کے نام خط میں لکھ دیں. لفافہ پر "پرائیویٹ" ضرور لکھ دیں. بورڈ کے حکیم صاحب کا مشورہ آپ کو ایک ہفتہ کے اندر مل جائے گا، اور انشاء اللہ آپ اُن کے مشوروں پر عمل کر کے ایک نئی زندگی حاصل کریں گے.

دہلی اور اس کے نزدیک رہنے والے حضرات بورڈ کے حکیم صاحب سے مل کر مشورہ حاصل کر سکتے ہیں،
مستورات کے لیے معقول انتظام ہے

ریڈیم دواخانہ ـــ ۱۰، انصاری روڈ، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مفید ہے۔ اس کی مالش سے بھی قولنج میں فائدہ ہوتا ہے۔

● گلاب کے پھول کے جوشاندہ میں شہد ملا کر غرغرہ کرنے سے حلق کا درد جاتا رہتا ہے، اور آواز صاف ہو جاتی ہے۔

● آلو بخارا خون پیدا کرتا اور چہرے کو نکھارتا ہے۔ بہت ہاضم ہے۔ خون پیدا کرتا، چہرے کی رنگت کو نکھارتا ہے۔

● ایک بڑے ڈاکٹر نے لکھا ہے ـــــ "خالص نباتی غذائیں نائٹروجن کی کمی کی تلافی کے لیے مٹر استعمال کرنا نہایت ارزاں اور کارگر طریقہ ہے۔"

● پان گرم مزاج والوں کے لیے مضر ہے۔ لیکن جن کا مزاج گرم نہ ہو، وہ اعتدال سے پان کھائیں تو اُن کے لیے مفید ہے۔ دماغ، معدے اور جگر کو تقویت پہنچاتا ہے۔ قبض کو رفع کرتا ہے۔ کھانے کو ہضم کرنے میں مدد دیتا ہے۔

● سویابین تقریباً گوشت کے برابر تغذیہ بخش ہے۔ اس کے دودھ میں اُتنا ہی پروٹین ہوتا ہے جتنا گائے کے دودھ میں ہوتا ہے۔

قدرت کا گرانقدر عطیہ

سنترہ قدرت کا گرانقدر عطیہ ہے۔ یہ دل و دماغ، معدہ و جگر اور آنتوں کو تقویت بخشتا ہے۔ طبیعت میں فرحت اور تازگی پیدا کرتا ہے، مصفّیٔ خون بھی ہے۔ خون کی حدت رفع کرتا ہے۔ معدے اور جگر کی سوزش دُور کرتا ہے۔ سنترے کے استعمال سے بدن میں چستی اور تازگی پیدا ہوتی ہے۔ رنگ نکھرتا ہے۔

سنترے کا رس زود ہضم بھی ہے اور مقوی ہضم بھی۔ کھانا کھانے کے بعد سنترہ کھانے سے غذا ہضم ہونے میں مدد ملتی ہے۔

بخار کے مریضوں کے لیے سنترہ کا رس آبِ حیات ہے۔ سرکردہ ڈاکٹروں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ بخار کے مریضوں کے لیے سنترہ سے زیادہ مفید کوئی اور غذا نہیں۔ سنترے میں جو ہلکی سی تُرشی ہوتی ہے وہ پیاس کی شدت اور صفرا کی زیادتی کو دُور کرتی ہے۔

سنترہ تندرست لوگوں کے لیے بھی اُتنا ہی مفید ہے جتنا بیماروں کے لیے یہ بوڑھے، جوان، بچّوں سب کے لیے فائدہ بخش ہے۔ لیکن سنترے کا رس کم عمر اور دودھ پیتے بچّوں کے لیے آبِ حیات سے کم نہیں۔ کم عمر اور دودھ پیتے بچے جو ثقیل غذائیں آسانی سے ہضم نہیں کر سکتے۔ سنترے کے رس سے حیرت انگیز فوائد حاصل کر سکتے ہیں۔ ایسے بچّے جو ماں کے دودھ سے محروم ہوں اور اُن کی پرورش بازار کے دودھ سے کی جاتی ہو، یا وہ معدہ جگر کی شکایتوں یا وہ مرض کساح (رکٹس) اور دق الاطفال (سوکھا) میں مبتلا ہوں، اُن کے لیے سنترے کا رس آبِ حیات ہے۔

موسمِ گرما کی ایک مفید سبزی

ٹنڈے موسمِ گرما کی خاص سبزی ہیں اور گوناگوں فوائد کے حامل ہیں۔ یہ جسم کی خشکی اور گرمی کو دُور کرتے ہیں۔ جسم کو سکون بخشتے ہیں۔ جسم سے پیشاب کے ذریعہ تیزابی مادّہ اور دوسرے فاسد مادّوں کو خارج کرتے ہیں، پیشاب کی سوزش اور زردی کو دُور کرتے ہیں۔ یہ بے حد زود ہضم سبزی ہے۔ یہ سبزی ہائی بلڈ پریشر کے مریضوں کے لیے اچھی غذا ہے۔ یورک ایسڈ سے گردہ اور مثانہ میں کبھی کبھی پتھری بن جاتی ہے۔ کچھ لوگوں کے پیشاب میں ریت آتی ہے۔ ان شکایات کے ازالہ کے لیے ٹنڈے کھانے چاہییں۔ ٹنڈے خون صاف کرتے ہیں، قبض کُشا ہیں۔ ماہرین کی رائے میں ٹنڈے دل کے لیے بے حد فائدہ بخش ہیں۔ جن لوگوں کو خفقان اور اختلاجِ قلب کی شکایت ہو اُنھیں خاص طور پر ٹنڈے کھانے چاہییں۔ دماغی کام کرنے والوں کے لیے یہ سبزی بے حد مفید ہے۔

یہ سہل الحصول سبزی موسمِ گرما کے لیے خاص طور پر قدرت کا گراں قدر عطیہ ہے۔

برف

گرمیوں کے موسم میں لوگ اس طرح برف استعمال کرتے ہیں جیسے آبِ حیات ہو! اب تو شہروں ہی میں نہیں برف کی آئس کریم بیچنے والے گاؤں گاؤں آواز لگاتے گھومتے پھرتے ہیں۔

شدید پیاس کی حالت میں برف ـــ سکون بخش ہے۔ بعض امراض میں بھی فائدہ بخش ہے۔ لیکن یہ مفید کم مضر بہت زیادہ ہے۔ جیسے میں پیاس سے مریض کی زبان سوکھی جا رہی ہو، یا قے آتی ہو تو برف کا ٹکڑا چوسنے سے مریض کو سکون ملتا ہے۔ زیادہ بڑھے ہوئے بخار کو کم کرنے کے لیے ڈاکٹر مریض کے سر پر برف سے سرد کی ہوئی کپڑے کی پٹّی رکھنے کی ہدایت کرتے ہیں ـــ لیکن برف کے استعمال سے فائدہ کم نقصان زیادہ ہوتا ہے۔ برف سے سرد کیا ہوا پانی پینا معمول بنا لینے سے معدہ کمزور ہو جاتا ہے نظامِ جسمانی میں خرابی پیدا ہو کر غیر محسوس طور پر طرح طرح کے امراض لاحق ہو جاتے ہیں۔

برف دانتوں اور گلے کو خراب اور

ضروری حرارت کو کم کرتی ہے۔ دانت کمزور ہو جاتے ہیں۔ برف جبڑوں کو کمزور کر کے پائیوریا میں مبتلا کر دیتی ہے۔ نزلہ و زکام کی تحریک کرتی ہے۔

ذیابیطس کے ازالہ کے لیے

ذیابیطس کو مہلک مرض کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ یہ موذی مرض جسے لاحق ہوتا ہے اُس کے پیشاب میں غیر محسوس طور پر شکر آنے لگتی ہے۔ کچھ دنوں کے بعد نمایاں طور پر آنے لگتی ہے۔ یہ موذی مرض لاحق ہوتے ہی انسان کی صحت گرنے لگتی ہے۔ اُس کی صحت میں گھن لگ جاتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ مریض موت [illegible] پہنچ جاتا ہے۔

اس مہلک مرض کے ازالہ کے لیے یہ آسان، ارزاں اور سہل الحصول دوائیں مجرب ہیں۔

● آم کے تازہ نرم پتے خشک کر کے سفوف بنالیں۔ چھ ماشہ صبح وشام تازہ پانی سے پھانک لیں۔

● بیل کے نرم نرم پتے کوٹ پیس کر ایک تولہ رس نکال لیجیے۔ ہر روز صبح کے وقت فطری ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد پی لیا کیجیے۔ ڈیڑھ دو مہینے میں پیشاب میں شکر آنے کی شکایت دُور ہو جائے گی۔

● سفوف اجوائن ایک تولہ۔ تیل تل دو تولہ میں ملالیں۔ ۶ ماشہ صبح، ۶ ماشہ شام کو کھائیں۔ ایک ہفتہ کھانا کافی ہے۔

● نیم کے سبز پتوں کا رس ایک تولہ صبح وشام پئیں۔

● آملہ ۶ ماشہ۔ صبح وشام روزانہ کھائیں۔

● املی کے بیج ۳ دن دودھ میں بھگونے کے بعد اوپر کا لال چھلکا اُتاریں اور مغز کا سفوف کرلیں۔ اُس میں ہم وزن مصری ملالیں۔ ۳ ماشہ صبح وشام کالی گائے کے دودھ کے ساتھ کھائیں۔ دودھ میں تھوڑی مصری ملالیں۔

● ببول کے تازہ نرم پتے ایک تولہ، ایک پاؤ پانی میں پیس کر صبح وشام پئیں۔

● برگد کی جڑ کا چھلکا پانی میں جوش دے کر، سات ماشہ شہد ملا کر صبح وشام پئیں۔

● جامن کی گٹھلیاں سایہ میں خشک کرلیں۔ پھر سفوف کرلیں۔ دن میں ۶ ماشہ ۳ بار پانی سے کھائیں۔

● چھوہارا کی گٹھلی باریک سفوف کر کے ہم وزن مصری ملالیں۔ ۹ ماشہ صبح وشام پانی یا دودھ سے کھائیں۔

● ذیابیطس کے ازالہ کے لیے [illegible] کا استعمال اکسیر ہے۔

فراموش کردو

فراموش کر دینا بہت بڑا فن ہے، اگر آپ اسے اپنالیں تو یہ آپ کے دل کے بہت سے زخموں کا مرہم بن سکتا ہے۔

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے — اگر تمہیں کوئی ناخوشگوار حادثہ پیش آیا ہے تو اُسے بھول جاؤ۔ اگر تمہارے گرد وپیش کے حالات پریشان کن ہیں، اگر غلط قدم اٹھانے سے گر کر تمہیں گزند پہنچا ہے، اگر تمہیں رسوا کیا گیا ہے تو اُسے بار بار یاد نہ کرو۔ اُن کی یاد کا کوئی پہلو تمہارے درد کا درماں نہیں ہوسکتا۔ اُن پرچھائیوں کی موجودگی تمہیں خوشی کے بہت سے لمحوں سے محروم کر دے گی۔ اُنھیں اپنے دل کی لوح سے مٹادو۔ اُنھیں فراموش کردو۔ ہمیشہ کے لیے فراموش کردو۔

سرگوشیاں

اس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، طبی، ادبی سوالات کے جوابات دیے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شامل اشاعت نہیں کیے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ 'بیسویں صدی' کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھیے۔ ہر سوال کے بعد جواب کے لیے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھیے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے۔ ——— (ایڈیٹر بیسویں صدی)

محمد مسعود علی۔ اندول

س۔ خوشی کا اظہار مسکراہٹ ہے تو غم کا اظہار کیا ہے؟

ج۔ کیا آپ کے خیال میں غم کا اظہار آنسو سے نہیں ہوتا۔

ایس۔ ایم عقیل۔ آسنسول

س۔ کچا کیلا اور پپیتے کی ترکاری کے فوائد اور نقصانات بتائیں؟

ج۔ کچے کیلے کی ترکاری گرمی اور خشکی کے نقائص کی دافع ہے۔ قدرے ثقیل ہوتی ہے۔ کچے پپیتے کی سبزی قبض کشا ہے۔ جگر اور آنتوں کو طاقت بخشتی ہے۔

محمد عظیم۔ آکولہ

س۔ کیا ہر خواب پورا ہوتا ہے؟

ج۔ ہر خواب پورا ہوتا نہیں، پورا ہو سکتا ہے، اگر اس کی تکمیل کے لیے جدوجہد کی جائے۔

حبیب الرحمٰن۔ محبوب نگر

س۔ کیا مسکراہٹ کے بغیر زندگی گزر سکتی ہے؟

ج۔ گزر تو سکتی ہے لیکن بہت بے کیف۔

مہرالنساء شمیم۔ کشن گنج

س۔ صحافت اور سیاست میں کوئی رشتہ ہو سکتا ہے یا نہیں۔؟

ج۔ سیاست اور صحافت کا چولی دامن کا تعلق ہے۔

شرافت علی۔ سہارنپور

س۔ میری عمر اکیس سال ہے میں اپنی زندگی آزادانہ گزارنا چاہتا ہوں۔ شادی کروں یا نہ کروں۔ مشورہ دیں۔

ج۔ شادی کا بندھن مسرت بخش قید ہے۔ جو لوگ اس بندھن سے آزاد زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں، وہ زندگی کی حقیقی مسرت سے محروم رہتے ہیں۔

حفیظہ شبنم۔ امراؤتی

س۔ خلوص کا مسلک ۔ ۔ ۔ ؟

ج۔ خلوص کا مسلک سب سے پیارا مسلک ہے۔

محمد خالد اختر۔ جلال پور

س۔ عورت کا سب سے اچھا روپ؟

ج۔ ماں!

محمد زکریا۔ وانسی

س۔ تندرستی کے کتنے اصول ہیں؟

ج۔ صرف ایک اصول! تندرستی کو تباہ کرنے والا کوئی کام نہ کیا جائے!

امتیاز علی نصرت۔ کریم نگر

س۔ کیا یہ حقیقت ہے کہ غریب وہ ہے جس کا کوئی دوست نہیں؟

ج۔ جی ہاں، ایک مفکر نے یہی لکھا ہے۔ ہم اس میں یہ اضافہ کریں گے کہ حقیقت میں غریب وہ ہے جس کا کوئی سچا دوست نہیں۔

چمن خلیق۔ کھڑگ پور

س۔ کسی چیز کو پانے کے لیے کوشش اور لگن لازمی ہے تو اسے کھونے کے لیے؟

ج۔ اس کی حفاظت کی طرف سے بے پروائی۔

نور جہاں بیگم۔ دھنباد

س۔ آدمی خود کو عقل مند کب سمجھتا ہے؟

ج۔ جب وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ عقل مند ہے۔

ڈاکٹر محمد فضل الرحمن گینسوڑ

س۔ دل کی آواز اچھی طرح کون سن سکتا ہے دلربا یا ڈاکٹر؟

ج۔ آپ ڈاکٹر ہیں — آپ ہم سے زیادہ جانتے ہوں گے۔ ہمیں بھی بتا کر ممنون فرمائیے۔

ایس ولی احمد۔ پرولیا

س۔ فکر اور پریشانی حد سے زیادہ بڑھ جائے تو کیا کرنا چاہیئے؟

ج۔ یہ سوچ کر پریشان نہ ہونا چاہیئے کہ کتنے لوگ آپ سے زیادہ پریشان ہوں گے۔

ایم۔ عاشق خاں۔ کلکتہ

س۔ کیا محبت کا دوسرا نام شادی ہے؟

ج۔ آپ عاشق خاں ہیں، یہ آپ کو ہم سے زیادہ جاننا چاہیئے۔

سید پرویز قادری۔ سیوان

س۔ چائے پینا مفید ہے یا مضر؟

ج۔ مختلف مزاجوں پر چائے کے اثرات مختلف ہوتے ہیں۔ گرم اور عصبی مزاج والوں کے لیے سخت مُضر ہے۔ سرد اور بلغمی مزاج والوں کے لیے اعتدال سے چائے پینا کسی حد تک فائدہ مند ہے۔ دماغی اور جسمانی تکان دُور ہو جاتی ہے۔ دردِ سر، گرانی، نیند اور غنودگی کے غلبے میں چائے پینا مفید ہے۔ مگر لوگ بکثرت چائے پیتے ہیں اُن کی دماغی قوتوں میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔

نفیس بانو منصوری۔ کانپور

س۔ کیا عورت اپنے خاندان، قوم اور ملک کی ترقی و خوشحالی میں اہم رول ادا کر سکتی ہے؟

ج۔ یقیناً تاریخ اس بات کی حقیقت کی شاہد ہے۔

منصور علیخاں۔ سعودی عرب

س۔ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ والدین خوش ہیں۔ لیکن میرے ایک بڑے بھائی ناخوش ہیں۔ صحیح مشورہ دیجیے!

ج۔ اولاد کو اپنے والدین کی خوشی اور خوشنودی کا سب زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔

نام کتاب	نام مصنف	قیمت
پچھلے ساون رین سبیرے	واجدہ تبسم	10/-
[illegible] کشیدہ کاری	ہما خانم	6/50
[illegible] کشیدہ کاری	شاہین آصف	9/-
[illegible] بالیاں سوگئیں	کرشن چندر	10/-
ایک [illegible] سو امید والے	"	5/-
انقلاب کا کفن	"	7/-
زندگی کے موڑ پر	"	7/-
[illegible] سیر چمن	"	10/-
[illegible] کی ڈائری	"	5/-
شکست	"	7/50
آسمان روشن ہے	"	6/-
محبت بھی قیامت ہے	"	12/-
پانچ لوفر	"	5/50
[illegible] ایک سپروٹن	"	4/50
(ان دوا) [illegible]	"	5/-
کالی رائیں	راج ونش	4/-
بجھو	کرشن نندہ	4/-
[illegible]	"	4/-
ایک [illegible] سی سی	راجندر سنگھ بیدی	4/-
سحر ہونے تک	رضیہ بٹ	10/-
[illegible]	شائستہ یوسفی	5/-
چپکوں کی وادی	"	9/-
[illegible] کی واپسی	"	8/-
چمن کی چہیلی	"	10/-
[illegible] چاندنی	"	7/-
[illegible]	"	7/-
[illegible] کسان	"	10/-
[illegible] بہار	مخمور جالندھری	5/-
[illegible] ملت	جگدیش بل	3/50
[illegible]	ٹھاکر پونچھی	4/50
[illegible]	ابن انشا	4/-
[illegible] نشتر	خوشتر گرامی	18/-
[illegible] گھر میں	فرشتہ کاری	3/50
[illegible] اقبال	رفیع الدین	30/-
[illegible] اقبال	حق نواز	25/-
[illegible]	رشید احمد صدیقی	12/-
[illegible]	سید سراج نیر	16/-

نام کتاب	نام مصنف	قیمت
اقبال		
مثنوی [illegible]		
یاد اقبال		
انتخاب کلام ظفر		
بانگ درا مع شرح		
حقوق القرآن		
دیوان حالی مع شرح		
سیرت اقبال	مولوی [illegible]	
شرح بال جبریل	یوسف [illegible]	
تاریخ اسلام کے حیرت انگیز لمحات	[illegible] عبدالرشید [illegible]	
ارباب نثر اردو	مولوی سید محمد	
انتخاب کلام نظم مع [illegible] اور شخصیت	خواجہ [illegible] حسین	-/
اقبال اور عشق رسول	پروفیسر عبدالرشید	15/-
رضیہ کا شاہی دسترخوان	رضیہ سلطانہ [illegible]	5/50
مصنفی دسترخوان	آمنہ نازلی	4/50
آمنہ کا لال	[illegible] الخیری	3/-
سید کا لال	"	5/-
شہید اعظم	مولانا [illegible]	3/-
آئینہ نماز	مولانا عاشق الٰہی	3/-
جدید تعلیمی نفسیات	ڈاکٹر عبدالرؤف	8/-
داستان زبان اردو	ڈاکٹر شوکت	7/50
اشارات تنقید	ڈاکٹر سید عبداللہ	[illegible]
تمنا		

5/-

ڈاکٹر محمد فضل الرحمٰن گنوڑ

س۔ دل کی آواز اچھی طرح کون سن سکتا ہے دلربا یا ڈاکٹر؟

ج۔ آپ ڈاکٹر ہیں — آپ ہم سے زیادہ جانتے ہوں گے۔ ہمیں بھی بتا کر ممنون فرمائیے۔

ایس ولی احمد۔ پرولیا

س۔ فکر اور پریشانی حد سے زیادہ بڑھ جائے تو کیا کرنا چاہیئے؟

ج۔ یہ سوچ کر پریشان نہ ہونا چاہیئے کہ کتنے لوگ آپ سے زیادہ پریشان ہوں گے۔

ایم۔ عاشق خاں۔ کلکتہ

س۔ کیا محبت کا دوسرا نام شادی ہے؟

ج۔ آپ عاشق خاں ہیں، یہ آپ کو ہم سے زیادہ جاننا چاہیئے۔

سید پرویز قادری۔ سیوان

س۔ چائے پینا مفید ہے یا مضر؟

ج۔ مختلف مزاجوں پر چائے کے اثرات مختلف ہوتے ہیں۔ گرم اور عصبی مزاج والوں کے لیے سخت مضر ہے۔ سوا اور بلغمی مزاج والوں کے لیے اعتدال سے چائے پینا کسی حد تک فائدہ مند ہے۔ دماغی اور جسمانی تکان دور ہو جاتی ہے۔ دردِ سر، گرانی، نیند اور غنودگی کے غلبے میں چائے پینا مفید ہے۔ مگر لوگ بکثرت چائے پیتے ہیں اُن کی دماغی قوتوں میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔

نفیس بانو منصوری۔ کانپور

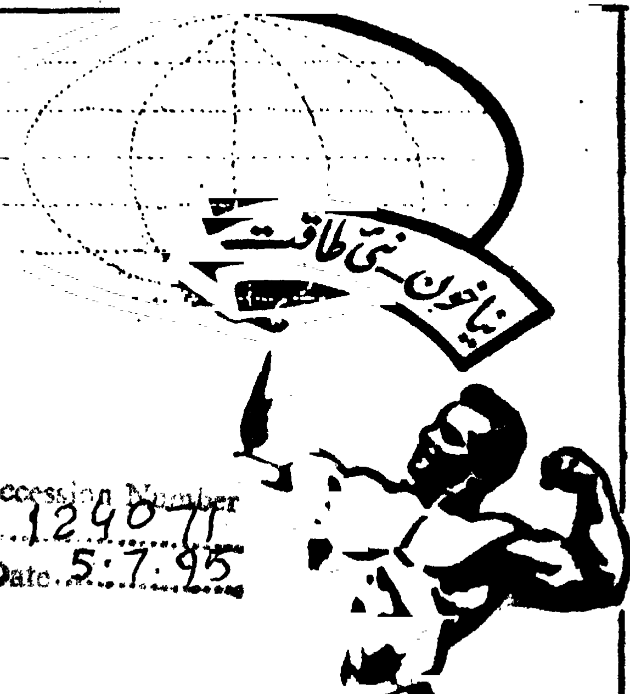
س۔ کیا عورت اپنے خاندان، قوم اور ملک کی ترقی و خوشحالی میں اہم رول ادا کر سکتی ہے؟

ج۔ یقیناً تاریخ ہمارا حقیقت کی شاہد ہے۔

منصور علیخاں۔ سعودی عرب

س۔ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ والدین خوش ہیں۔ لیکن میرے ایک بڑے بھائی ناخوش ہیں۔ صحیح مشورہ دیجیے!

ج۔ اولاد کو اپنے والدین کی خوشی اور خوشنودی کا سب زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔



... نے ... پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر بیسویں صدی ... ٹرسٹ لمیٹڈ ۲۵۸۲ ... مارگ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع ...

اردو زبان کی [illegible]

اپنی پسند اور ذوق کی کتب طلب فرمائیے

پچاس روپے قیمت کی کتب منگانے پر ڈاک خرچ نہیں لیا جائے گا۔

نام کتاب	نام مصنف	قیمت
[illegible]	واجدہ تبسم	10/-
[illegible]	[illegible]	6/50
[illegible]	خاتون [illegible]	9/-
[illegible]	کرشن چندر	10/-
[illegible]	″ ″	5/-
[illegible]	″ ″	7/-
[illegible]	″ ″	7/-
[illegible]	″ ″	10/-
[illegible]	″ ″	5/-
[illegible]	″ ″	7/50
[illegible]	″ ″	6/-
[illegible]	″ ″	12/-
[illegible]	″ ″	5/50
[illegible]	″ ″	4/50
[illegible]	″ ″	6/-
[illegible]	راج و نش	4/-
[illegible]	گلشن نندہ	4/-
[illegible]	″ ″	4/-
[illegible]	راجندر سنگھ بیدی	4/-
[illegible]	رضیہ بٹ	10/-
[illegible]	[illegible]	5/-
[illegible]	″ ″	9/-
[illegible]	″ ″	6/-
[illegible]	″ ″	10/-
[illegible]	″ ″	7/-
[illegible]	″ ″	7/-
[illegible]	″ ″	10/-
[illegible]	[illegible]	5/-
[illegible]	جگدیش بل	3/50
[illegible]	ٹھاکر پونچھی	4/60
[illegible]	ابن انشاء	4/-
[illegible]	خوشتر گرامی	18/-
[illegible]	[illegible]	3/50
[illegible]	[illegible]	30/-
[illegible]	[illegible]	25/-
[illegible]	[illegible]	12/-
[illegible]	[illegible]	15/-

نام کتاب	نام مصنف	قیمت
مطالعات اور مکاتیب	سید اختر الاسلام	20/-
تعلیمات اقبال	پروفیسر یوسف سلیم	15/50
اعتراف اقبال	ملک حسن اختر ایم اے	20/-
مومن اور مطالعہ مومن	ڈاکٹر عبادت بریلوی	39/50
اقبال اور عبد الحق	ممتاز حسن	10/-
مثنوی پس چہ باید کرد و مسافر شرح	پروفیسر یوسف سلیم	60/-
یاد اقبال	خواجہ عبد الحمید ایم اے	6/-
انتخاب کلام ظفر	بہادر شاہ ظفر	5/50
بانگ درا مع شرح	یوسف سلیم	20/-
حقوق القرآن	مولانا اشرف علی	4/50
دیوان حالی مع شرح	اصغر حسین خاں	20/-
سیرت اقبال	مولوی طاہر فاروقی	18/-
شرح بال جبریل	یوسف سلیم	14/-
تاریخ اسلام کے حیرت انگیز لمحات	عبد الرشید عثمان	9/-
ارباب نثر اردو	مولوی سید محمد	12/50
انتخاب کلام ظفر فن اور شخصیت	خواجہ منور حسین	18/-
اقبال اور عشق رسول	پروفیسر عبد الرشید	15/-
رضیہ کا شاہی دسترخوان	رضیہ سلطانہ چمن	5/50
مصنفی دسترخوان	آمنہ نازلی	4/50
آمنہ کا لال	علامہ راشد الخیری	3/-
سیدہ کا لال	″ ″	5/-
شبینۂ اعظم	مولانا ابو الکلام آزاد	3/-
آئینۂ نماز	مولانا عاشق الٰہی	3/-
جدید تعلیمی نفسیات	ڈاکٹر عبد الرؤف	8/-
داستان زبان اردو	ڈاکٹر شوکت	7/50
اشارات تنقید	ڈاکٹر سید عبد اللہ	17/50
تحفتا	حمیدہ جبین	10/-

نام کتاب	نام مصنف	قیمت
ایمرجنسی میں جمہوریت کا قتل عام	فاروق رنگی	7/50 مجلد
ایمرجنسی کی قیامت	سلامت علی مہدی	7/50 مجلد
روزی کا سوال	واجدہ تبسم	12/-
کیسے سمجھاؤں	″ ″	10/-
از سر نو	دلاور فگار	5/-
شیشے کی دیواریں	خواجہ احمد عباس	5/-
دو راہا	عارف مہر دوی	5/-
جزیرہ سخن وراں	غلام عباس	6/-
لہو پکارے گا آستین کا	رفعی پٹیالوی	6/-
آوازیں	پورن سنگھ ہنر جوش	3/-
فردوس گوش	جوش ملسیانی	6/-
دیدار غالب	عرش ملسیانی	7/-
رسوم دہلی	سید احمد دہلوی	7/-
پری خانہ	واجد علی شاہ	
انارکلی پر ایک نظر	آمنہ روح افزا احسان	6/-
خیر کیا سوچتا ہوگا	سید رفیق حسن	5/-
شاہ فیصل	سلامت علی مہدی	4/-
بہو کی تلاش	آمنہ نور العین صدیقی	5/-
لالہ زنگ	ایم اے قاضی	6/50
محمد علی کلے	سلامت علی مہدی	6/-
ادبی اقدار	دورآ فریدی	5/-
شخصیتیں	″ ″	3/-
بت تراش	یاقوت رحمان	20/-
نادرہ راہ	منشی پریم چند	6/50
ضرب کلیم	پروفیسر یوسف سلیم	12/-
اردو ادب میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء	الطاف فاطمہ	12/50
بہترین افسانے	منشی پریم چند	5/-
آج کی بات	جگدیش بل	3/50
پیاسے بادل	ٹھاکر پونچھی	4/50
سزا	دت بھارتی	8/-
گونگا ہے بھگوان	کوثر چاند پوری	[illegible]
پتھر کا گلاب	″ ″	4/-
اعمال قرآنی	مولانا اشرف علی	5/-
میدانِ الہند	ڈاکٹر ظہور الحسن	6/-
خوشۂ اعظم	مولوی نذیر احمد	6/-

نام کتاب	نام مصنف	قیمت
مگن	سلمیٰ کنول	10/-
فرحی	فرزانہ نصیر	10/-
دیوانی	ماہ جبیں	8/-
شبلیہ	فرزانہ یاسمین	9/50
گمنام ہمسفر	سید صغرا	4/-
شام غم	روحی انعام	6/-
قانون مباشرت	حکیم فضل حسین	15/-
تفسیر بیان القرآن مکمل	مولانا اشرف علی	140/-
″ ″ مجلد	″ ″	160/-
کلیات اقبال	علامہ اقبال	12/-
ہشت بہشت	تذکرۂ خلفائے اشرفیہ	10/-
مقالات اقبال	ڈاکٹر سید عبد اللہ	10/50
دلی سے اقبال تک	″ ″	9/-
سرسید احمد خاں اور نامور رفقا	″ ″	12/50
اردو کی تین مثنویاں	پروفیسر خلیل رشید	6/-
اردو کیسے پڑھائیں	مولوی سلیم عبد اللہ	5/-
پیام اقبال	عبد الرحمن طارق	10/-
عرفان اقبال	بشیر حنفی	10/-
ذکر اقبال	عبد المجید سالک	12/50
بچوں کی نفسیات	ڈاکٹر عبد الرؤف	7/-
دلدل کا کنول	سلیم ضیاء	20/-
قرآن اور اقبال	ابو محمد مصلح	[illegible]
سائرہ	فرزانہ نصیر	[illegible]
صحت و زندگی	خوشتر گرامی	[illegible]
پریم شاستر	خوشتر گرامی	[illegible]
کام شاستر	[illegible]تر گرامی	[illegible]
گرہست شاستر	[illegible]تر گرامی	[illegible]
آپ بیتی	رشید احمد صدیقی	[illegible]
بیسویں صدی کی کشیدہ کاری		[illegible]

نام کتاب	قیمت
[illegible]	5/-
[illegible]	[illegible]
سٹوڈنٹس پریکٹیکل ڈکشنری کلاں	20/-
ماسٹر پریکٹیکل ڈکشنری انگریزی اردو	20/-
مصباح اللغات عربی سے اردو	16/-
فیروز اللغات اردو جامع	[illegible]
فیروز اللغات [illegible]	60/-
القاموس الجدید عربی سے اردو	50/-

[illegible] ڈپو، دریا [illegible]